اشرف الکلام فی اَحادیث خیر الاَنام صلی اللہ علیہ وسلم

("خطباتِ حکیم الامت" سے شرحِ احادیث کا حسین انتخاب)

افادات

حکیم الامتؒ مولانا اشرفؒ علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

محمد تقی عثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
Karachi, Pakistan.

اشرف الکلام فی اَحادیث خیرالاَنام صلی اللہ علیہ وسلم

(”خطباتِ حکیم الامت“ سے شرحِ احادیث کا حسین انتخاب)

افادات

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب

محمد تقی عثمانی

ترتیب و تخریج

مولانا احسان اللہ پشینی

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
Karachi, Pakistan.

باہتمام : سید قادر معین (بابر)

طباعت : ربیع الاول ۱۴۴۴ھ - اکتوبر ۲۰۲۲ء

ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

فون : 92-21-35031565, 35123130

ای میل : info@mmqpk.com

ویب سائٹ : www.mmqpk.com
www.maktabamaarifulquran.com
fb/onlinesharia

آن لائن :

فیس بک سے خریداری کے لئے scan کریں

آن لائن خریداری کے لئے تشریف لائیں۔

ملنے کے پتے
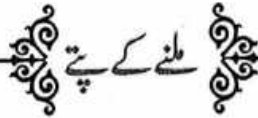
* مکتبہ دارالعلوم، کراچی
* مکتبہ رحمانیہ، لاہور
* دارالسلام، اسلام آباد
* ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان
* ادارۃ المعارف، کراچی
* مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
* مسٹر بکس، اسلام آباد
* مکتبہ احیاء العلوم، کرک
* بیت المعارف، کراچی
* الفلاح پبلشرز، لاہور
* مکتبہ صفدریہ، راولپنڈی
* مکتبہ عباسیہ، تیمر گرہ
* دارالاشاعت، کراچی
* مکتبہ عائشہ، لاہور
* اسلامی کتب گھر، راولپنڈی
* مکتبہ احرار، مردان
* فخر الدین کانچ والا، کراچی
* مکتبۃ البشیر، پشاور
* مکتبہ عثمانیہ، راولپنڈی
* مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
* بیت القرآن، کراچی
* دارالاخلاص، پشاور
* مکتبہ رشیدیہ، راولپنڈی
* تاج بک ایجنسی، منگورہ
* مکتبہ عمر فاروق، کراچی
* بیت العلم، پشاور
* قرآن مجید محل، راولپنڈی
* برکی کتب خانہ، ڈیرہ اسماعیل خان
* مکتبۃ القرآن، کراچی
* مکتبہ اصلاح و تبلیغ، حیدر آباد
* اسلامی کتب گھر، فیصل آباد
* مکتبہ محمدیہ، لکی مروت (درہ پیزد)
* ادارۂ اسلامیات، کراچی/لاہور
* بیت القرآن، حیدر آباد
* مکتبہ اسلامیہ، فیصل آباد
* عثمان دینی کتب خانہ، مانسہرہ

پیشِ لفظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی اشرف المرسلین سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وعلی کل من تبعھم باحسان الی یوم الدین

امابعد:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے مواعظ کے بارے میں ہر ذی علم جانتا ہے کہ وہ علوم ومعارف کا ناپیدا کنار سمندر ہے، بندے نے ان مواعظ کے مطالعے کے دوران یہ محسوس کیا کہ ان میں آیات قرآن کی تشریح وتفسیر نیز بہت سی احادیث کی وضاحت جس انداز میں آئی ہے، وہ بذات خود ایک مستقل فائدے کی چیز ہے۔ چنانچہ بندے نے مواعظ کے مطالعے کے دوران قرآن وحدیث کی ان تشریحات پر نشان لگانے کا اہتمام کیا، اس طرح قرآن کریم کی آیات کی جو فہرست جمع ہوئی، وہ ادارہ تالیفات اشرفیہ کے ناظم مولانا محمد اسحاق کے حوالے کی جنہوں نے اس پر مزید اضافہ کر کے اسے ''اشرف التفاسیر'' کے نام سے شائع کیا، اسی طرح احادیث کی تشریحات پر جو میں نے نشان لگائے تھے وہ میں نے اپنے رفیق عزیزم مولانا احسان اللہ پشینی صاحب کے حوالے کیں۔ انہوں نے نہ صرف بڑی محنت سے ان احادیث کو جمع کیا بلکہ خود بھی مختلف مواعظ سے مزید تشریحی

اقتباسات کا اضافہ کیا اور سب سے بڑی بات یہی ہے کہ تمام احادیث کی تخریج کی اور حاشیہ پر ان کے مکمل حوالے درج کیے۔ نیز ان تمام احادیث کو ابواب کے تحت مرتب کر دیا۔

اب الحمد للہ یہ کام انتہائی مفید اور جامع ہو گیا، جس کے لیے عزیزم مولانا احسان اللہ پشینی صاحب دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی عمر اور عمل میں برکت عطا فرمائے اور ان کی اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول سے نوازیں۔ ان کے اس قابل قدر کام کے بذریعہ بندے کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہو رہی ہے جس کے لیے میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں۔

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۴۳۸/۱۱/۲۸ھ

فہرست

کتاب الایمان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب ایمان

زانی مومن ہوکر زنا نہیں کرتا اس کا مطلب

”لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن“(۱)

(کوئی زنا نہیں کرتا اس حال میں کہ وہ مؤمن ہو)

اس کی دلیل ہے، اس طرح سے زنا علامت ہے عدم خشیت کی، اور اس سے ایمان کی نفی فرمائی اور ایمان بمعنی تصدیق ایک علم ہے، تو جب خشیت کی نفی سے ایمان کی نفی فرمائی تو خشیت کا لازم ہونا اور علم کا ملزوم ہونا ثابت ہوگیا، باقی ہر ایک کی نفی سے دوسرے کی نفی کا حکم ہے، اس کی ذات کی نفی کا حکم نہیں، بلکہ اس کے کمال اور درجۂ مطلوب اور اس کے بعض آثار کی نفی کا حکم ہے، مثلاً اس حدیث ہی میں یہ مراد ہے کہ ”لا یزنی وفیہ أثر الإیمان المطلوب“ مطلب یہ ہے کہ مؤمن میں جب تک ایمان کا اثر مطلوب موجود ہے، اس وقت تک وہ زنا نہیں کرسکتا اور جس وقت زنا کرے گا، اس وقت اس میں یہ اثر مطلوب نہ ہوگا، گو نفسِ ایمان باقی ہے، پس اس سے ایمان کی نفی مراد نہیں، بلکہ اثرِ ایمان کی نفی مراد ہے، یا بلفظِ دیگر جس میں خشیت نہ

(۱) أخرجه البخاري في صحيحه عن أبي هريرة رضي الله عنه مرفوعا، رقم الحديث ۲۴۷۵ في باب النهب بغير اذن صاحبه.

ہو اس سے مطلق علم کی نفی کی جاتی، بلکہ اثرِ علم کی نفی کی جاتی ہے۔
(وعظ: العلم والخشیۃ، صفحہ نمبر: ۲۸۸ تا ۲۸۹، علم و عمل جلد نمبر ۲)

آخر میں آنے والے مسلمانوں کا ایمان عجیب تر ہونے کا مطلب

قال رسول الله ﷺ: أی الخلق أعجب إلیکم إیمانا؟ قالوا: الملائکة إلی آخر الحدیث [1]

یعنی حضور ﷺ نے صحابہ سے ایک دن دریافت فرمایا کہ بتلاؤ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ فرشتوں کا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ فرشتوں کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ ہے؟ وہ تو ہر وقت اپنے رب کی قرب میں ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ پھر انبیاء علیہم السلام کا، فرمایا ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ؟ وہ تو وحی کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، صحابہ نے عرض کیا پھر ہمارا ایمان عجیب تر ہے، فرمایا تمہارے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ میں تمہارے درمیان موجود ہوں، یعنی تم نے مجھے دیکھا، نزولِ وحی کو دیکھا، میرے معجزات دیکھے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا ان لوگوں کا ایمان عجیب تر ہے جو میرے بعد آئیں گے اور صرف چند اوراق دیکھیں گے جن میں قرآن ہوگا اور ان پر ایمان لائیں گے۔ تو اس سے یہ وسوسہ نہ ہو کہ تم صحابہؓ کو متأخرین سے افضل بتلاتے ہو اور اس حدیث کی رو سے صحابہؓ سے متأخرین کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے پچھلوں کے ایمان کو اعجب ہی تو فرمایا ہے، اکمل و اقوی و افضل تو نہیں فرمایا اور اعجب ہونے سے اکمل و افضل ہونا لازم نہیں آتا، پس اس حدیث کی بناء پر یہ مسلم ہے کہ متأخرین کا ایمان سب سے عجیب تر ہے، مگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان

---

(۱) أخرجه البزار فی مسنده، عن أنس رضی اللہ عنہ مرفوعا، ۱۳/۴۸۷ (رقم الحدیث ۷۲۹۴).

سے افضل واقوی نہیں، کیونکہ دوسرے دلائل سے یہ طے ہو چکا ہے کہ سب سے زیادہ کامل ایمان انبیاء علیہم السلام کا ہے، پھر ملائکہ کا، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کا، پھر جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشابہ ہو، اسی طرح ہر زمانہ میں دیکھتے جاؤ، جو شخص صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ اخلاق وعادات، طرز معاملات میں مشابہ ہوگا، اس کا ایمان قوی تر ہوگا اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ اعجب ہونا اقوی واکمل ہونے کو مستلزم نہیں، اس کی ایک نظیر میرے پاس ہے، میں پوچھتا ہوں کہ کیا حق تعالیٰ کا علیم وقدیر وسمیع ہونا عجیب تر ہے، ہرگز نہیں، بلکہ انسان کا علیم وحکیم ہونا عجیب ہے، کیونکہ عادتِ ممکن کا صفاتِ کمالیہ سے متصف ہونا واقعی تعجب کی بات ہے اور واجبِ قدیم کا صفاتِ کمال سے موصوف ہونا کیا عجیب ہے، وہ بھی کمال سے موصوف نہ ہوتو اور کون ہوگا، مگر انسان کے علم وحکمت کے عجیب ہونے سے علم وحکمت کا اکمل ہونا لازم نہیں، بلکہ اکمل وافضل واقوی اللہ تعالیٰ ہی کا علم وحکمت ہے۔

(وعظ: التحصیل والتعدیل مع التکمیل والتعدیل، صفحہ نمبر: ۱۳۴ تا ۱۳۵، حقیقت تصوف وتقوی جلد نمبر ۱۱)

قیامت کے دن شفاعت سے رہ جانے والے

مسلمانوں کے ایمان کی تشریح

مشہور حدیث شفاعت کی ہے، (۱) اس سے ہم لوگوں کو سبق لینا چاہیے اور ذرا زبان اور قلم کو قابو میں رکھنا چاہیے، وہ حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن جب شفاعت

---

(۱) أخرجه البخاری فی صحيحه عن معبد بن هلال العنزی، قال: اجتمعنا ناس من أهل البصرة فذهبنا إلی أنس بن مالك، وذهبنا معنا بثابت البنانی إليه يسأله لنا عن حديث الشفاعة الی آخر الحديث. كتاب التوحيد، باب كلام الرب عز وجل يوم القيامة مع الأنبياء رقم الحديث: ۷۵۱۰.

کی اجازت ہوگی تو سب علی قدرِ مراتب شفاعت کریں گے، انبیاء علیہم السلام بھی کریں گے اور امتی بھی، جب سب کی شفاعت ختم ہوجاوے گی تو حق تعالیٰ فرمادیں گے کہ انبیاء بھی شفاعت کر چکے اور ملائکہ بھی کر چکے، اب ارحم الراحمین باقی ہیں، یہ فرما کر دو ہتڑ بھر کر دوزخیوں کو جنت میں داخل کردیں گے۔ (اللہ میاں کی دو ہتڑ خدا جانے کتنی ہوگی، اس سے یہاں بحث کرنا نہیں ہے، کیونکہ یہ لفظ متشابہات میں سے ہے، رسول اللہ ﷺ کی جو کچھ مراد ہو حق ہے) یہاں مقصود یہ ہے کہ حق تعالیٰ بہت سے ان دوزخیوں کو جہنم سے نکالیں گے جن کو نہ شفاعت امتیوں کی پہنچی، نہ ملائکہ کی، نہ انبیاء علیہم السلام کی۔

اور اسی حدیث میں یہ لفظ بھی ہے "أخرجوا من النار من كان في قلبه مثقال ذرة من إيمان"، [1] یعنی انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کو یہ حکم ہوگا کہ دوزخ سے اس شخص کو بھی نکال لو جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو، ان دونوں کے ملانے سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شفاعت سے رہ گئے تھے، ان میں ذرہ برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔

تو اب اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ لوگ مومن ہوں گے یا کافر؟ اگر کافر ہوں گے تو ان کی مغفرت بعد میں بھی کیسی ہوگی، کیونکہ کافر کی مغفرت ممتنع ہے؟ اور اگر مومن ہیں تو کسی شفاعت کرنے والے نے مومنین نے یا ملائکہ نے یا کسی نبی نے کیوں شفاعت نہیں کی؟ جبکہ یہ حکم ہوا تھا کہ جن کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے، ان کو بھی نکال لیا جاوے۔

---

(۱) أخرجه البخاري في الصحيح عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه مرفوعًا، كتاب الإيمان۔ باب: تفاضل أهل الإيمان في الأعمل، رقمه: ۲۲۰.

اس اشکال کا جواب یہی ہے کہ یہ شق تو باطل ہے کہ وہ کفار ہوں، کیونکہ کافر کی بخشش نہیں ہوسکتی، بلکہ وہ مومن ہی ہوں گے، لیکن ان کا ایمان اتنا ضعیف اور اس قدر مخفی ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کے ادراک میں بھی نہیں آئے گا، حالانکہ حق تعالیٰ نے ان کو علمِ کامل عطا فرمایا ہے، خصوصاً آخرت میں کہ وہ تو مقام ہی ہے انکشافِ حقائق کا، مگر اس پر بھی ان حضرات کو پتہ نہ چلا، اتنا ذرا سا ایمان تھا کہ سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو علم نہ ہوگا، غرض یہ لوگ حقیقت میں ہوں گے مومن ہی، لیکن ان کا ایمان اس قدر دھندلا ہوگا کہ انتہا درجہ کی تیز چشم بصیرت کے بھی ادراک میں نہ آئے گا، اس سے ثابت ہوا کہ بعض کا ایمان ایسا ضعیف بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی اس پتہ چلنا مشکل ہے، پھر مولویوں کو کیسے پتہ چل جاوے گا اور عوام تو کسی شمار ہی میں نہیں، اس لیے بات بات میں کسی پر کفر کا فتویٰ لگا دینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟

(وعظ: الاسلام الحقیقی، صفحہ نمبر: ۴۱۹ تا ۴۲۰، محاسن اسلام جلد نمبر ۱۲)

حضور ﷺ سے اپنی جان ومال سے زیادہ محبت سے مراد محبت عقلیہ ہے

لا یؤمن أحدکم حتی أکون أحب إلیه من نفسه و ماله و أهله و ولده أجمعین (او کما قال)[۱]

کہ کوئی تم میں سے اس وقت تک مومن نہ ہوگا، جب تک میں اس کو اپنی جان و مال واہل وعیال سب سے زیادہ محبوب نہ ہوں، اس پر حضرت عمر نے عرض کیا

أنت أحب إلی من کل شيء إلا نفسي

(۱) أخرجه البخاري في صحیحه عن عبد الله بن هشام رضي الله عنه، کتاب الأیمان والنذور، باب: کیف کانت یمین النبي ﷺ، رقم الحدیث ٦٦٣٢.

کہ یارسول اللہ! آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، بجز میری جان کے کہ مجھے اپنی جان زیادہ محبوب معلوم ہوتی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں اے عمر! جب تک تمہاری جان سے زیادہ محبوب نہ ہوں، اس وقت تک مومن نہ ہوگے، اس کے بعد اسی مجلس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یارسول اللہ! میں اب دیکھتا ہوں کہ آپ میرے نفس سے بھی احب ہیں۔ یہاں دو شبہے ہوتے ہیں: ایک یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اتنی جلدی کایا پلٹ گئی کہ اسی مجلس میں کچھ سے کچھ ہوگیا، دوسرے یہ کہ اگر کسی مومن کی وہ حالت ہو جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حالت اولاتھی تو کیا وہ مومن نہ ہوگا؟

پہلے شبہے کا جواب گو یہ ہوسکتا ہے کہ ایک ہی مجلس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کایا پلٹ جانا ممکن ہے، کیونکہ جب فاعل و منفعل دونوں کامل ہوں تو ایسا ہوجانا کچھ بعید نہیں، مگر چونکہ اشکال دوسرا بھی ہے، اس لیے یہ جواب مجھے پسند نہیں، بلکہ تحقیقی جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اول یہ سمجھے کہ حضور ﷺ کی مراد احبیتِ طبعیہ ہے، پھر حضور ﷺ کے تکرار ارشاد سے سمجھ گئے کہ مراد محبتِ عقلیہ ہے اور محبتِ عقلیہ ہر مومن کو اللہ و رسول سے زیادہ ہے اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کیوں نہ ہوتی، کیونکہ وہ تو ہر وقت اللہ و رسول کے لیے اپنی جان دینے کو تیار تھے، گو طبعاً اپنی جان سے محبت زیادہ ہو، مگر وہ اللہ و رسول کے لیے سب سے محبوب چیز کو قربان کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ تھے۔ پس سمجھ گئے کہ حضور ﷺ کی مراد احبیتِ عقلیہ ہے اور محبتِ عقلیہ مجھے سب سے زیادہ اللہ و رسول کے ساتھ ہے، اپنی جان سے نہیں۔

(ارضاء الحق (حصہ دوم)، صفحہ نمبر: ۱۷، تسلیم و رضاء جلد نمبر: ۱۵)

زنا اور سرقہ لا الہ الا اللہ کے لیے مبطل نہیں، بلکہ مضعف

اور اس کے ظہور کے لیے مؤخر ہیں

میں نے جو اوپر کہا تھا کہ یہ فضائل خواصِ اعمال ہیں اور خواص کا ظہور رفعِ موانع کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ اس پر کسی کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے تو رسول اللہ ﷺ کے سامنے موانع اور مضرات کو بھی پیش کیا تھا کہ یارسول اللہ! وان زنی وان سرق[1] (یارسول اللہ ﷺ! اگر چہ وہ زنا کرے اور اگر چہ وہ چوری کرے)

مگر حضور ﷺ نے ان کو مضر نہیں مانا، یعنی جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی لا الہ الا اللہ کا معتقد ہو کر مر جائے وھو لا یشرک باللہ اس حال میں کہ وہ شرک نہ کرتا ہو تو یہ شخص جنت میں جائے گا، اس پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ! چاہے اس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا: وان زنی وان سرق ہاں! اگر چہ اس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ ان خواص کا ظہور بد پرہیزی سے بچنے کے ساتھ مقید نہیں۔

تقریرِ گزشتہ سے یہ اشکال اس طرح حل ہوا کہ اس حدیث میں حضور ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ زنا و سرقہ لا الہ الا اللہ کی خاصیت کے لیے مبطل نہیں، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اس کو مبطل سمجھتے تھے، حضورِ اقدس ﷺ نے اس کی نفی کر دی۔

رہا یہ اعمال کسی درجہ میں بھی لا الہ الا اللہ کی خاصیت کے منافی اور مضر نہیں، یہ

---

(۱) أخرجه الشیخان رحمهما الله فی صحیحیهما عن أبي ذر رضي الله عنه مرفوعًا.

اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا وسرقہ وغیرہ لا الہ الا اللہ کی خاصیت کے لیے مضعف اور اس کے ظہور کے لیے مؤخر ہیں، یعنی ایسا شخص جنت میں تو ایمان کی برکت سے چلا جائے گا، مگر دیر میں جائے گا، یا یہ کہا جائے کہ ایمان کی خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے، مگر مفرد جب دوسرے اجزاء سے مرکب ہوجاتا ہے تو مرکب کا مزاج دوسرا ہوجاتا ہے، پس اگر ایمان اعمالِ صالحہ کے ساتھ مرکب ہو تو اس وقت مجموعہ کا مزاج اور ہوگا، اس وقت ایمان کی خاصیت تیز اور قوی ہوگی، کیونکہ یہ اجزاء لا الہ الا اللہ کے مناسب ہیں اور اگر اعمالِ سیئہ سے مرکب ہوا تو مجموعہ کا مزاج دوسرا ہوگا، یا یہ کہا جائے کہ خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے، مگر عارض وموانع کی وجہ سے دیر ہوجائے گی۔

(وعظ: الاستقامت صفحہ نمبر: ۳۸۲ تا ۳۸۳، دعوت وتبلیغ جلد نمبر ۱۳)

لا تکفرہ بذنب کے ساتھ لا تخرجہ عن الاسلام لانے کی وجہ

حضور ﷺ کا ہی ارشاد ہے:

لا تکفرہ بذنب و لا تخرجہ عن الإسلام [1]

(یعنی مسلمان کو کسی گناہ کی وجہ سے نہ تو کافر کہو اور نہ اس کو اسلام سے خارج کہو)

بہت دنوں تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ دو جملے کیوں ارشاد فرمائے،

---

(۱) أخرجه ابو داود في سننه عن أنس بن مالك رضي الله عنه مرفوعا، رقم الحديث: ۲۵۳۲ (باب في الغزو مع أئمة الجور) ولفظه: قال رسول الله ﷺ: «ثلاث من أصل الإيمان: الكف عمن قال: لا اله لا الله، ولا نكفره بذنب، ولا نخرجه من الإسلام بعمل، والجهاد ماض منذ بعثني الله إلى أن يقاتل آخر أمتي الدجال لا يبطله جور جائر، ولا عدل عادل، والإيمان بالأقدار»

صرف پہلا ہی جملہ کافی تھا، دوسرے جملہ کی کیا ضرورت تھی؟ مگر بہت دنوں کے بعد سمجھ میں آیا کہ ایک جملہ میں تو رد ہے خوارج (ایک فرقہ ہے) کا اور ایک میں معتزلہ (ایک فرقہ ہے) کا، اول جملہ خوارج کا تو رد ہو گیا، مگر معتزلہ کا رد نہ ہوتا، کیونکہ وہ گناہ کی وجہ سے کفر میں نہیں داخل کرتے، اس لیے دوسرا جملہ بھی بیان فرمایا کہ معتزلہ پر بھی رد ہو گیا اور لاتکفرہ بذنب (مسلمانوں کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ کہو) پہلے اس لیے فرمایا کہ دوسرے جملہ میں ترقی ہو، کیونکہ اول لاتکفرہ بذنب سے تو یہ فرمایا کہ کافر نہ کہو تو اب ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ ہم تو کفار نہیں کہتے، بلکہ اسلام سے صرف خارج کرتے ہیں تو اس کے رد کے لیے فرماتے ہیں کہ اسلام سے خارج بھی نہ کہو۔

(وعظ: کف الاذی، صفحہ نمبر: ۳۰۰ تا ۳۰۱، جلد نمبر: ۴ حقوق وفرائض)

حدیثِ احسان کی تشریح

أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك [1]

(تو اللہ کی عبادت اس طرح کر جس طرح تو اللہ تعالیٰ کو دیکھتا تو عبادت کرتا، کیونکہ تو اگر اسے نہیں دیکھ رہا، مگر وہ تجھے یقیناً دیکھ رہا ہے)

میں اسی کی شرح بھی کیے دیتا ہوں، کیونکہ بہت لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں، مشہور تو یہ ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ نے عبادت کا طریقہ دو مراقبوں سے بتلایا ہے کہ اول تو یہ تصور کرو کہ ہم خدا کو دیکھ رہے ہیں، اگر یہ نہ ہو سکے تو یہی تصور کرو کہ خدا تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ مگر ان مراقبات سے حدیث کو کوئی علاقہ نہیں، بلکہ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ عبادت ایسی اچھی طرح کرو جیسی خدا تعالیٰ کو

---

(۱) أخرجه الشيخان رحمهما الله فى صحيحيهما عن أبى هريرة رضي الله عنه مرفوعا.

دیکھ کر کرتے، آگے فاء تعلیلیہ ہے جس میں پہلے کلام کی علت مذکور ہے کہ تم کو عبادت ایسی ہی کرنی چاہیے، کیونکہ اگر تم خدا تعالیٰ کو اس وقت نہیں دیکھتے تو اس کا تو یقین ہے کہ وہ دیکھ رہے ہیں اور اس کے دیکھنے کا بھی وہی مقتضاء ہے جو تمہارے دیکھنے کا مقتضاء ہے، کیونکہ ایک مزدور کو اگر یہ معلوم ہوجائے کہ اس وقت حاکم میرے کام کو دیکھ رہا ہے، گو اس کو نظر نہ آتا ہو تو یہ علم بھی اس کے حسنِ عمل کے لیے کافی ہوجاتا ہے، یہ تفسیر لغت کے بھی موافق ہے، کیونکہ لغت میں احسان کے معنی نکو کردن ہیں اور شریعت نے اپنی اصطلاحات میں لغت کا بہت لحاظ کیا ہے، صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ معنی لغوی عام تھے، شریعت نے اس کو کسی قید کے ساتھ مقید کردیا ہے، سو اس تفسیر پر معنی شرعی کو لغت سے زیادہ بعد نہیں ہے، لغت میں احسان نکو کردن ہے اور شریعت میں نکو کردن عبادت ہے اور تفسیرِ مشہور پر جب کہ احسان کی تفسیر مراقبات سے کی جائے گی، لغت میں بہت بعد ہوجائے گا۔ میں اس حدیث کا مطلب بحمد اللہ اول تو خود بھی یہی سمجھا تھا جو اوپر بیان کیا گیا ہے، پھر کتابوں میں دیکھا تو غالبا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ اور نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی لکھا ہے[1] اور اخیر میں مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر دیکھی تو حضرت نے بھی یہی لکھا ہے، اس سے میرا بڑا جی خوش ہوا۔ پھر میں نے کسی مقام پر غالبا تکشف میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی طرف منسوب کرکے یہ تقریر لکھ دی ہے کہ حضرت نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے، کیونکہ بڑوں کی بات لوگ جلدی مان لیتے ہیں،

---

(۱) فی مرقاة المفاتیح: (۱/ ۶۱۵) مطبع: دار الفکر بیروت، ولفظه: وهذا من جوامع الکلم، فإن العبد إن قام بین یدی مولاه لم یترك شیئاً مما قدر علیه من إحسان العمل، ولا یلتفت إلی ما سواه، وهذا المعنی موجود فی عبادة العبد مع عدم رؤیته. وکذا فی شرح النووی علی صحیح للإمام مسلم.

ہماری کون سنتا ہے۔

(وعظ: فناء النفوس، صفحہ نمبر: ۲۸۵ تا ۲۸۶، تسلیم ورضا، جلد نمبر ۱۵)

حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے والے شخص کا سوال مع تصدیق جواب کی تشریح

ایک حدیث میں آتا ہے کہ [1] ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے آپ ﷺ سے کچھ سوالات کیے، آپ ﷺ نے جواب دیئے تو وہ تصدیق کرتا تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی تصدیق سے نہایت تعجب ہوا، کیونکہ عجب اشکال ہے کہ اس کے سوال سے تو معلوم ہوتا تھا کہ جانتا نہیں، ورنہ سوال کے کیا معنی، محض تحصیلِ حاصل ہے اور تصدیق سے معلوم ہوتا ہے کہ جانتا ہے، ورنہ تصدیق کیسے کرتا، کیونکہ تصدیق کے لیے پہلے سے جاننا ضروری ہے۔ خیر وہ تو جبرئیل علیہ السلام تھے کہ جانتے، مگر ان کی تخصیص نہیں، بلکہ اسی طرح جب استاد کی تقریر کسی مضمون کے ہوتی ہے تو اگر تقریر صحیح وعمدہ ہے تو کہتے ہو ٹھیک ہے اور اگر کہیں غلط ہے تو فوراً طبیعت کھٹک جاتی ہے تو اگر آپ پہلے سے نہیں جانتے تو اس انقباض وانبساط کے کیا معنی؟ معلوم ہوا علوم آپ کے اندر بھی فطری ہیں، صرف استاذ کی صحبت سے جلا ہوتا چلا گیا، جب پورا جلا ہو چکا تو ظاہر ہو گیا۔ تو اس بناء پر ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ سے عالم ہی پیدا ہوتا ہے، مگر وہ نقوش چھپے ہوئے ہیں، جیسے ایک صفحہ کتاب کا ہے، اس پر مہرہ رکھا ہوا ہے، جونہی وہ مہرہ اٹھے گا تمام نقوش نظر آنے لگیں گے، اسی طرح آپ کا نفس بھی ایک صفحہ ہے، آپ اس پر مہرہ رکھے ہوئے ہیں تو علوم آپ میں خارج سے نہیں آگئے، بلکہ نظر آگئے، خدا نے لکھی لکھائی تختی دی ہے، اگر لکھا نہ ہوتا تو

---

(۱) متفق علیہ، أخرجه الشیخان رحمهما الله فی صحیحیهما عن أبی هریرة رضی الله عنه مرفوعًا.

کیا لکھتے اور تم کہاں لکھنے جاتے؟ تمہیں تو آج یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ علم کس مقولہ سے ہے؟ اگر تم علم حاصل کرتے تو کم از کم اس کا مقولہ تو معلوم ہوتا، کوئی کہتا ہے مقولہ کیف سے ہے، کوئی کہتا ہے مقولہ انفعال سے ہے، کوئی کہتا ہے مقولہ اضافت سے ہے، کوئی کہتا ہے مختلف اعتبارات سے ہے، بتاؤ اگر تمہارا حاصل کیا ہوا ہوتا تو تم واقف نہ ہوتے کہ کس مقولہ سے ہے۔

(وعظ: روح الجوار، صفحہ نمبر: ۲۲۲ تا ۲۲۳، برکات رمضان، جلد نمبر: ۱۶)

مردے کی ہڈی کے توڑنے کو زندہ کی ہڈی توڑنے کی تشبیہ کے دو احتمالات

کسر عظم المومن میتا ککسرہ حیا[1]

(مسلمان کی ہڈی کو مرنے کے بعد توڑنا ایسا ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تشبیہ من کل الوجوہ ہے، جس سے میت کو بعد موت کے زندہ کے برابر احساس ہونے کا شبہ کیا جاوے، اگر ایسا ہوتا تو شرعا اس شخص سے قصاص لیا جاتا، بلکہ یہ تشبیہ بعض وجوہ میں ہے۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعد موت کے بھی روح کو کسی قدر تعلق جسم سے رہتا ہے اور وہ ایسا تعلق ہے جیسا کہ اس وقت ہمارے جسم کو لباس سے تعلق ہے، پس اگر کوئی ہمارا اترا ہوا کرتہ پھاڑ دے تو ہم کو کلفت ہوتی ہے۔ نیز! اس تعلق کا یہ اثر بھی ہے کہ قبر کے پاس جا کر سلام و دعا جو کچھ کی جاتی ہے، مردہ اس کو سنتا ہے اور شہداء میں یہ تعلق عام

(۱) أخرجه أبو داود في سننه عن عائشة رضي الله عنها مرفوعا، رقم الحديث: ۳۲۰۷ باب في الحفار يجد العظم هل يتنكب ذلك) وكذا رواه الإمام أحمد في مسنده: ۲۴۷۳۹، وابن ماجه في سننه: ۱۶۱۶، الا انه لم يرو احد من الرواة بلفظ "عظم المومن" بل روى كلهم بلفظ "عظم الميت" والله سبحانه وتعال أعلم

مومنین سے زیادہ ہوتا ہے، جس کا اثر یہ ہے کہ ان کا جسم بعد موت کے سالم رہتا ہے، زمین اس کو کھانہیں سکتی۔ نیز! اس تعلق سے بعض اولیاء کو مرنے کے بعد قوت تصرف بھی عطاء ہوتی ہے۔

توکسرِ عظم سے جسمانی ایذا تو نہیں ہوتی، ہاں! روحانی ایذا ہوسکتی ہے، اس لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسا کہ زندہ کی ہڈی توڑنا۔

حضرت استاذ علیہ الرحمۃ (مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے تھے کہ مردہ جسم کو جلانے سے اس کو ایسی ایذا ہوتی ہے جیسے تمہارے چادر کو اتار کر کوئی تمہارے سامنے جلادے تو اس سے تم کو رنج اور غم ہوتا ہے، اسی طرح روح کو بھی رنج ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ چادر کو جلانے سے ہمارے جسم کو ایذا نہیں ہوتی، صرف روحانی ایذا ہوتی ہے، یہی حال بعد موت کے بدن جلانے کا ہے، ایک وجہ تشبیہ تو یہ ہوئی۔

دوسرے یہ بھی احتمال ہے کہ تشبیہ گناہ میں ہو کہ جب گناہ زندہ ہڈی توڑنے میں ہوتا ہے، ایسا ہی میت کی ہڈی توڑنے میں ہوتا ہے اور وجہ شبہ ترک احترام ہے، کیونکہ ہڈی توڑنے اور بدن جلانے سے میت کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ غرض احترام میت کا اب بھی باقی ہے۔

مردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت

اس تقدیر پر اس حدیث کا مآل بھی حقوقِ آبرو کی طرف ہو جائے گا۔ حاصل یہ ہوا کہ چونکہ مردہ کا احترام بعد موت کے بھی باقی ہے اور کسرِ عظم میں اس کی بے حرمتی اور بے عزتی ہے، اس لیے یہ فعل حرام ہے، اور ظاہر ہے کہ اقوال کی تاثیر بے حرمتی میں کسرِ عظم سے زیادہ ہے، پس مردوں کو برا بھلا کہنا بھی حرام ہے۔ (۱)

(وعظ: الکمال فی الدین، صفحہ نمبر: ۱۹۳ تا ۱۹۵، جلد نمبر: ۳ دین ودنیا)

---

(۱) أخرجه البخاري في صحيحه عن عائشة رضي الله عنها مرفوعاً، ولفظه: "لا تسبوا الأموات=

ولی اللہ کو تکلیف پہنچانے پر اللہ تعالیٰ کا اعلان جنگ

من اذیٰ لی ولیا فقد آذنته بالحرب [1]

(یعنی جو کوئی میرے کسی ولی کو ایذا پہنچادے، اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ دیا جاتا ہے)

اللہ اکبر! یہ وعید کتنی سخت ہے، خدائی الٹی میٹم کا کون مقابلہ کرسکتا ہے؟ پھر اس وعید کا ظہور کبھی تو اس طرح ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ خود اولیاء کو تصرف کی اجازت دیتے ہیں، اور بعض دفعہ اولیاء کوئی تصرف نہیں کرتے، لیکن حق تعالیٰ کو اپنے محبوب کی بے حرمتی پر غیرت آتی ہے کہ ہمارے محبوب کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کیا گیا؟ اس لیے حق تعالیٰ خود اس شخص کو کسی بلا میں گرفتار کردیتے ہیں۔ غرض اولیاء کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی کرنا بڑا سنگین جرم ہے، اگر وہ حضرات اپنی شفقت سے کچھ بھی نہ کہیں تو غیرت حق نہیں چھوڑتی، اس لیے اس سے بچنا چاہیے۔ عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با درکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

ہم نے اس کائنات میں بارہا تجربہ کیا کہ اللہ والوں کے ساتھ جو بدتمیزی کرتا ہے، وہ خود ذلیل ہوجاتا ہے۔ مولانا رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؎

ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد
تا دل صاحب دلے نامد بدرد

= فإنهم قد أفضو، رقم الحديث: ۱۳۹۳، باب ما ينهى من سب الأموات.

(۱) أخرجه البخاري في صحيحه عن أبي هريرة رضي الله عنه مرفوعا، رقم الحديث: ٦٥٠٢ باب التواضع

کسی قوم کو خدا تعالیٰ اس وقت تک ذلیل نہیں فرماتے جب تک وہ اللہ کے کسی مقبول بندہ کو نہیں ستاتے۔

(وعظ: الکمال فی الدین، صفحہ نمبر: ۱۹۶ تا ۱۹۷، جلد نمبر: ۳، دین و دنیا)

حضور اقدس ﷺ نے ساری شریعت ابتداء سے انتہاء تک ایک جملہ میں ارشاد فرمائی:

حضور ﷺ سے کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ!

إن شرائع الإسلام قد كثرت علی، فقل لی قولا أحفظه و آخذ به [1]

کہ یا رسول اللہ! احکام اسلام مجھ پر بہت زیادہ ہو گئے ہیں، آپ! مجھے ایک بات ایسی بتلا دیجئے جس کو میں یاد کروں اور اسی کے موافق عمل کرتا رہوں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قل آمنت بالله ثم استقم" کہ تم یوں کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا، پھر استقامت کے ساتھ رہو، حضور ﷺ نے ساری شریعت ابتداء سے انتہاء تک اس ایک جملہ میں بھر دی، حالانکہ سائل نے ابتداء سے سوال بھی نہ کیا تھا، پس "آمنت باللّٰہ" میں آپ ﷺ نے بالاجمال تمام اعتقادیات کو بیان فرمایا اور "ثم استقم" میں اعمال کے اندر استقامت کی تعلیم دی ہے جس میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، معاملات و معاشرت سب آ گئے، کیونکہ استقامت و اعتدال اعمال شرعیہ کی خاص صفت ہے، ان سے تجاوز کر کے عمل میں اعتدال باقی نہیں رہے

---

(۱) أخرجه الإمام أحمد رحمه الله فی مسنده عن سفيان بن عبدالله الثقفی رضی اللہ عنہ لفظه: قال: قلت: يا رسول الله، قل لی فی الإسلام قولا لا أسأل عنه أحدا غيرك قال أبو معاوية: بعد قال: "قل: آمنت بالله، ثم استقم". و كذا أخرجه ابن حبان و البيهقی.

گا، استقامت کی ہر جگہ ہر عمل میں ضرورت ہے۔ (تو حضور ﷺ نے اس سائل کو ایسی بات بتلادی جس سے وہ ہر عمل کا جواز و ناجواز دریافت کر سکے، پس جہاں استقامت و اعتدال موجود ہو، وہ شرعی عمل ہے اور جہاں یہ صفت مفقود ہو، وہ شریعت سے خارج ہے۔)

باقی یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ سائل کی درخواست یہ تھی کہ مجھے ایسی بات بتلا دیجئے کہ تمام شریعت میں اس ایک بات کو یاد کرلوں، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ مجھے ایسی بات بتلا دیجئے جس کی تمام شریعت میں رعایت کروں اور جس سے ہر حکم کا شرعی وغیر شرعی ہونا معلوم کرلیا کروں، حضور ﷺ نے اسی کے موافق ایسی بات بتلادی جو شریعت کا موضوع ہے، یعنی اعتقادِ عظمتِ الٰہی و استقامتِ افعال واحوال۔

(وعظ: سبیل النجاح، صفحہ نمبر: ۴۳۱ تا ۴۳۳، جلد نمبر ۳: دین ودنیا)

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا اپنے بارے میں نفاق کا ڈر اور حضور ﷺ کی تسلی

حدیث شریف میں ہے کہ حضرت حنظلہ کی ملاقات ہوئی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے تو انہوں نے پوچھا اے حنظلہ! کیسے ہو؟ جواب دیا ”نافق حنظلہ“ حنظلہ (یعنی میں) تو منافق ہو گیا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پوچھا یہ کیسے؟ عرض کیا کہ جب ہم حاضر ہوتے ہیں دربار میں رسول اللہ ﷺ کے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا جنت و دوزخ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب وہاں سے آتے ہیں، بال بچوں میں مشغول ہو کر سب بھول جاتے ہیں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر یہ نفاق ہے تو پھر میں بھی منافق ہوں، کیونکہ میں بھی اس میں مبتلا ہوں، آؤ، چلو! رسول

اللہ ﷺ سے اس کا علاج پوچھیں، چنانچہ حضور ﷺ کے پاس آئے اور سب حال بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا یاد رکھو:

لو کنتم کما تکونون عندی لصافحتکم الملائکة و لکن یا حنظلة! ساعة، ساعة[1]

"یعنی اگر ایسا نہ ہوتا، بلکہ تمہاری ہر وقت وہی حالت رہتی جو میرے سامنے ہوتی ہے، تم سے ملائکہ مصافحہ کیا کرتے، مگر اے حنظلہ! ایک ساعت کیسی اور ایک ساعت کیسی"۔

اس حدیث کے سمجھنے میں علماءِ عصر پریشان ہوگئے، اول تو ان کو "نافق حنظلہ" پر اشکال ہوا کہ محض تفاوت حالت کو انہوں نے نفاق کیسے کہہ دیا؟ پھر حضور ﷺ کا حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی تسلی کرنا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ اس جواب سے تسلی کیسے ہوگئی؟

اول تو یہ سمجھیے کہ یہاں نفاق سے حقیقی نفاق مراد نہیں، کیونکہ حضرت صدیق اکبرو حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہما ضرور یہ بات جانتے تھے کہ نفاق نام ہے، "إبطان الکفر و إظھار الإیمان" کا اور جب ہم جانتے ہیں تو کیا وہ نہیں جانتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں إبطان الکفر نہ تھا، مگر مجازاً اس کو نفاق کہہ دیا اور اس کا منشاء یہ تھا کہ حالتِ حضور میں ایمان کامل معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس وقت عالمِ غیب رایَ العین ہوتا ہے تو تصدیق بھی کامل ہوتی ہے اور حالتِ غیبت میں تصدیق کی یہ شان نہیں ہوتی، صرف عقلی تصدیق ہوتی ہے جو علم کا درجہ ہے، معائنہ ومشاہدہ کی سی کیفیت نہیں ہوتی، اس تفاوت کی وجہ سے وہ یہ سمجھے کہ ہمارا ایمان حضور ﷺ کے سامنے اور طرح کا

---

(۱) أخرجه الإمام مسلم رحمه الله فی صحیحه عن حنظلة الأسدی رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۷۵۰ باب دوام الذکر والفکر فی أمور الآخرة.

ہوتا ہے، پیچھے اور طرح کا ہوتا ہے، گویا کبھی کامل ہے، کبھی ناقص ہے اور مطلوب ایمانِ کامل ہے تو جب اس میں نقص ہوگا، وہ نفاق کے مشابہ ہوگا، گو حقیقی نفاق نہ ہو، یہ تو "نافق حنظلہ" کی تفسیر ہوئی۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے اپنی حالت ادنیٰ درجہ کی سمجھ کر اس پر تأسف کا اظہار کیا تھا تو جواب میں کوئی تسلی کا مضمون ہونا چاہیے اور جو جواب حدیث میں مذکور ہے، بظاہر وہ تسلی کے لیے کافی نہیں، کیونکہ ساعة ساعة ہی پر تو انہیں تاسف ہے، پھر یہ جواب وجہ تسلی کیوں کر ہوسکتا ہے؟

میرے استاذ، حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی حقیقت بیان فرمائی تھی کہ حکمت حق اس کی مقتضی ہے کہ ملکوت سے ناسوت میں انسان کو آباد کیا جائے اور اگر ہر وقت وہی حالت رہتی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رہتی ہے تو انسان ناسوت میں نہ رہتا، بلکہ ملکوت میں پہنچا دیا جاتا۔

(وعظ: آثار العبادة، صفحہ نمبر: ۵۲ تا ۵۳، جلد نمبر: ۷ حقیقت عبادت)

"جس نے "لا الہ الا اللہ" کہا جنت میں داخل ہوگیا" کا مطلب

"من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة" (۱)

جس نے لا الہ الا اللہ کہا جنت میں داخل ہوگیا۔

اس سے اپنے نفس کے موافق یہ مراد لے لی ہے کہ بس یہی کافی ہے، نہ کسی عمل کی ضرورت ہے نہ کسی گناہ سے بچنے کی حاجت۔ جو جی چاہے کرتے پھرو بس لا الہ الا اللہ کہہ لو سیدھے جنت میں چلے جاؤ گے یہ بھی وہی کلمة الحق أرید بہا الباطل (یہ کلمہ تو حق ہے مگر اس سے مراد باطل لی گئی ہے)۔

---

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن أبی ذر رضی اللہ عنہ مرفوعاً، واللفظ للبخاری.

اگر کوئی کہے کہ ہم نے جو اس حدیث میں کہا ہے خود اسی حدیث ہی میں آگے مصرح ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

"وان زنی وان سرق"

یعنی اگر چہ وہ زنا کرے اور چوری کرے تب بھی جنت میں داخل ہوگا"

اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعد لا الہ الا اللہ کہہ لینے کے کچھ بھی کرتا پھرے کچھ مضر نہیں۔

جواب یہ ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اعمال مامور بہا (جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے) کے بجالانے اور معاصی سے بچنے کی ضرورت نہیں، بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ زنا وسرقہ سے ایمان نہیں جاتا، اس ایمان کی برکت سے کبھی نہ کبھی جنت میں داخل ہو جائے گا، گو بعد سزا سہی، تو اعمال کی عدمِ ضرورت اس سے کیسے ثابت ہوئی، جیسے جہلاء کا زعم ہے کہ جو جی چاہے کرتا پھرے کچھ بھی حرج نہیں اور موٹی بات ہے کہ اگر صرف لا الہ الا اللہ کافی ہوتا اور کسی عمل کے کرنے یا گناہوں کے چھوڑنے کی ضرورت نہ ہوتی تو حضور ﷺ کیوں اعمال کی تاکید فرماتے اور گناہوں پر وعیدیں کیوں ارشاد فرماتے، یہ تو بہت آسان بات تھی اس کی تعلیم فرما دیتے، نیز جب آپ ہی سے اعمال ساقط نہ ہوئے تو اوروں سے کیسے ساقط ہو سکتے ہیں، دیکھئے آخر صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی بھی سمجھدار تھے یا نعوذ باللہ سارے ناواقف ہی تھے۔ کیا صحابہ رضی اللہ عنہم نماز نہیں پڑھتے تھے، اور اعمال نہیں کرتے تھے، کیا صرف لا الہ الا اللہ پر بس کرتے تھے ان کے واقعات دیکھ لیجئے دین پر ان کو کیسی توجہ تھی۔ مستحب تک تو چھوڑنا بہت برا خیال کرتے تھے، معلوم ہوا کہ یہ صرف تمہارا مذاق ہے ان دلائل کا یہ مفہوم نہیں، صرف نفس کو اعمال کی مشقت سے بچانے کے لئے تم نے حیلے تراش لئے ہیں، کیا آیت:

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ (۱)

''اس کی مثل عمل کرنے والوں کو چاہئے کہ عمل کریں''

اور حدیث:

''من ترك الصلوٰة متعمدًا فقد كفر''

''جس نے نماز کو قصداً چھوڑ دیا وہ کافر ہوگیا''(۲)

وغیرہ یہ نصوص نہیں ہیں کیا آپ کو صرف ایک ہی نص ملی، مجھے تو شرم آتی ہے ایسی ظاہر بات کی تفصیل کرتے ہوئے۔

(وعظ: خیر المال للرجال، ص: ۱۸۴، ۱۸۵، ج: ۸، حقیقتِ حال وجاہ)

اعمال کے ثواب کا مدار نیت پر ہے

''إنما الأعمال بالنيات وإنما لكل امرء ما نوىٰ، فمن كانت هجرته إلَى الله ورسوله فهجرته إلَى الله ورسوله ومن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها أو امرأة يتزوجها فهجرته إلىٰ ما هاجر إليه''(۳)

''بے شک تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، انسان کو وہی چیز حاصل ہوگی جس کی وہ نیت کرے گا جس نے خدا اور اس کے رسول ﷺ کی

---

(۱) سورة الصافات آیت (۶۱)

(۲) أخرجه الطبرانی فی ''المعجم الأوسط'' عن أنس بن مالك رضی الله عنه مرفوعًا، رقم الحديث: ۳۳۴۸، ولفظه: من ترك الصلاة متعمدًا فقد كفر جهارًا، لم يروه عن أبی جعفر الرازی إلا هاشم بن القاسم، تفرد به محمد بن أبی داود.

(۳) أخرجه الامام البخاری رحمه الله عنه عن عمر بن الخطاب رضی الله عنه مرفوعًا، رقم الحديث: ۱.

طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت خدا اور رسول کے لئے ہوگی، اور جس کی ہجرت دنیا پانے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لئے ہو تو اس کی ہجرت اس طرف ہوگی جس کے لئے اس نے ہجرت کی''

اس حدیث کا پہلا جزو: ''إنما الأعمال بالنيات'' (بے شک تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے) بتلا رہا ہے کہ اعمالِ شرعیہ سے ثواب بدونِ نیت کے حاصل نہیں ہوتا اعمال کی تفسیر اعمالِ شرعیہ سے اس لئے کی گئی کہ شارع علیہ السلام کو اعمالِ غیر شرعیہ سے بحث کی ضرورت ہی نہیں پھر آگے ہجرت کا ذکر فرمانا اس کا قرینہ ہے اور ثواب الاعمال سے اس لئے تفسیر کی گئی کہ وجودِ اعمال بدونِ نیت کے ہوسکتا ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے لہٰذا توقف وجودِ اعمال علی النیۃ شارح کا مقصود نہیں ہوسکتا کیونکہ اول تو یہ خلافِ واقعہ ہے، دوسرے وجودِ اشیاء بھی ان امور کی قبیل سے ہے جو شارع علیہ السلام کی بحث سے خارج ہیں، شارع کا مقصود بیانِ احکام ہوتا ہے نہ کہ بیانِ کیفیاتِ وجود، اب اس میں گفتگو ہوسکتی ہے کہ یہاں صحتِ اعمال مراد ہے یا ثوابِ اعمال، سو اس کا جواب حنفیہ نے کتبِ فقہ میں دے دیا ہے کہ چونکہ ثوابِ اعمال کا نیت پر موقوف ہونا اجماعی ہے اس لئے تقدیرِ صحت سے تقدیرِ ثواب اولیٰ ہے، [1] اور ثواب و رضا باہم قریب قریب ہیں، جب حق تعالیٰ کسی عمل پر ثواب دینگے تو اس سے راضی بھی ہوں گے، دوسرے ثواب سے بھی رضا ہی مقصود ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ رضا ثواب کی اعلیٰ فرد ہے۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے ہجرت کے متعلق صاف فرمایا کہ اگر اس سے خدا

---

(۱) السنن للإمام أبي داود رحمه الله رقم الحديث: ۲۲۰۱، (باب فيما عنى به الطلاق والنيات). تفصیل کے لیے غمزة عيون الأبصار للحموی (۵۲/۱) طبع دار الكتب العلمية.

مطلوب نہ ہوتو وہ شرعاً قابلِ قدر اور لائقِ اعتبار نہیں، اور اس سے خدا تک وصول نہ ہو گا، تو دیکھئے ہجرت کتنا بڑا عمل ہے کہ جہاد کے برابر ہے اور اس کا طریقِ ہدایت ہونا یقینی ہے، کیونکہ عملِ شرعی ہے مگر بدونِ نیت وارادہ کے وہ بھی موصل نہیں۔

علیٰ ہذا نماز کتنا بڑا عمل ہے لیکن خدا کے لئے نہ ہو بلکہ ریاکاری سے ہو تو ہرگز وصول وقرب مرتب نہ ہوگا، اسی طرح جملہ اعمالِ شرعی میں غور کرلیا جائے کہ مقصود کی نیت اور قصد سب میں شرط ہے بدون اس کے وہ موجبِ وصول نہیں ہوسکتی۔

(وعظ: ماعلیہ الصبر، ص:۱۲۹ تا ۱۳۰، ج:۹، فضائلِ صبر وشکر)

جن گناہگار مسلمانوں کو جہنم میں داخل کیا جائے گا، ان کو ایک قسم کی موت دی جائے گی

مسلم شریف میں ایک حدیث ہے جس میں عصاۃ مسلمین کے متعلق ارشاد ہے:

"أماتہم اللہ فی النار اماتۃ"(۱)

''جن گناہ گار مسلمانوں کو جہنم میں داخل کیا جائے گا ان کو ایک قسم کی موت دے دی جائے گی''۔

جس سے جسم پر تو عذاب کا اثر ہوگا مگر روح کا شدید احساس نہ ہوگا، اور بعض اہلِ کشف کا کشف یہ ہے کہ گناہگار مسلمانوں پر دوزخ میں گہری نیند مسلط کی

---

(۱) أخرجہ الإمام مسلم فی صحیحہ عن أبی سعید الخدری ﷺ مرفوعًا، رقم الحدیث:۳۰۶، باب اثبات الشفاعۃ واخراج الموحدین من النار)، ولفظہ: أما أھل النار الذین ھم أھلھا، فانھم لا یموتون فیھا ولا یحیون، ولکن ناس أصابتھم النار بذنوبھم -أو قال بخطایاھم- فأماتھم اماتۃ حتیٰ اذا کانوا فحما، اذن بالشفاعۃ، فجی بھم ضبائر ضبائر- الیٰ آخر الحدیث.

جائے گی، جس میں وہ خواب ایسا دیکھتے رہیں گے گویا جنت میں ہیں، وہاں کی نعمتوں سے متمتع ہو رہے ہیں، تو روح اس خوابِ راحت میں مشغول ہو گی اور جسم عذاب میں ہو گا۔

اگر اس کشف کو حدیث کی تفسیر کہا جائے تو کچھ بعید نہیں، پس عشاق کے نزدیک تو یہاں کی راحت سے وہاں کی مصیبت بھی بہر حال اچھی ہے۔

(وعظ: آداب المصاب، ص: ۳۲۹، ج: ۹، فضائلِ صبر و شکر)

سخاوت مطلقاً محمود نہیں، نہ بخل مطلقاً مذموم ہے

”من أعطیٰ لله و منع لله فقد استکمل الإیمان“(۱)

”جس نے اللہ ہی کے لئے دیا اور اللہ ہی کے لئے روکا اس کو ایمانِ کامل نصیب ہوا“

اس میں اعطاء و منع دونوں کے ساتھ للہ کی قید ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں نہ بخل مطلقاً مذموم، بلکہ اگر خدا کے لئے ہوں تو دونوں محمود ورنہ دونوں مذموم۔

اب آپ کو حاجی صاحب کی ایک تحقیق کی قدر ہو گی، فرماتے تھے کہ اخلاقِ رذیلہ فی نفسہا مذموم نہیں، بلکہ خاص مصرف کے اختیار سے مذموم ہیں اور اگر ان کو طاعت میں صرف کیا جائے تو یہ محمود ہیں، اسی طرح اخلاقِ حمیدہ بھی افضالی طاعت الحق کی وجہ سے محمود ہیں، پس اگر سخاوت معاصی کی طرف مفضی ہو جائے تو محمود نہیں بلکہ مذموم ہیں۔

(وعظ: الاجر النبیل، ص: ۴۹۱ تا ۴۹۲، ج: ۹، فضائل صبر و شکر)

---

(۱) أخرجه الترمذی و أحمد عن معاذ بن أنس رضی اللہ عنہ مرفوعاً.
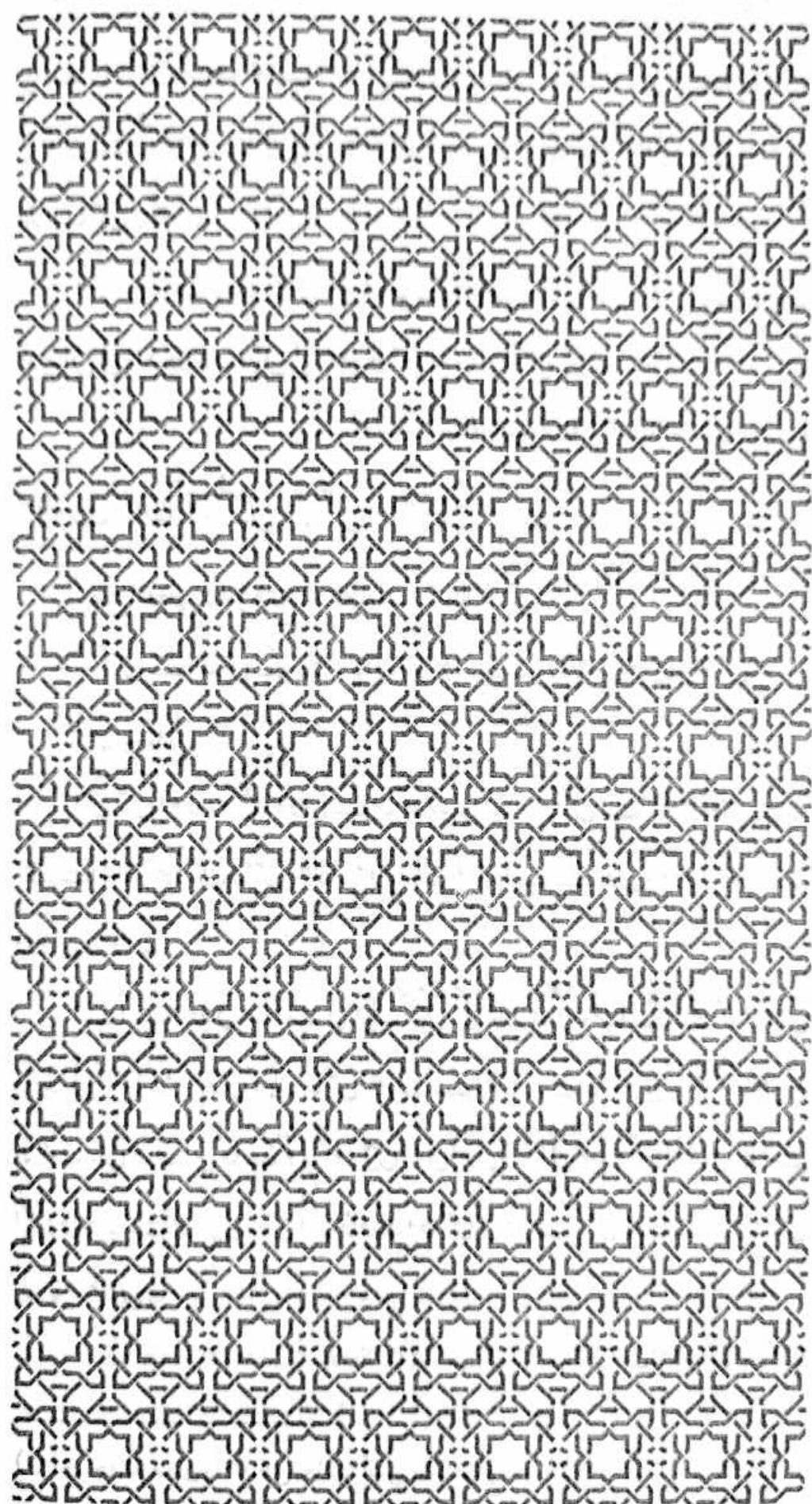
باب فی الوسوسة
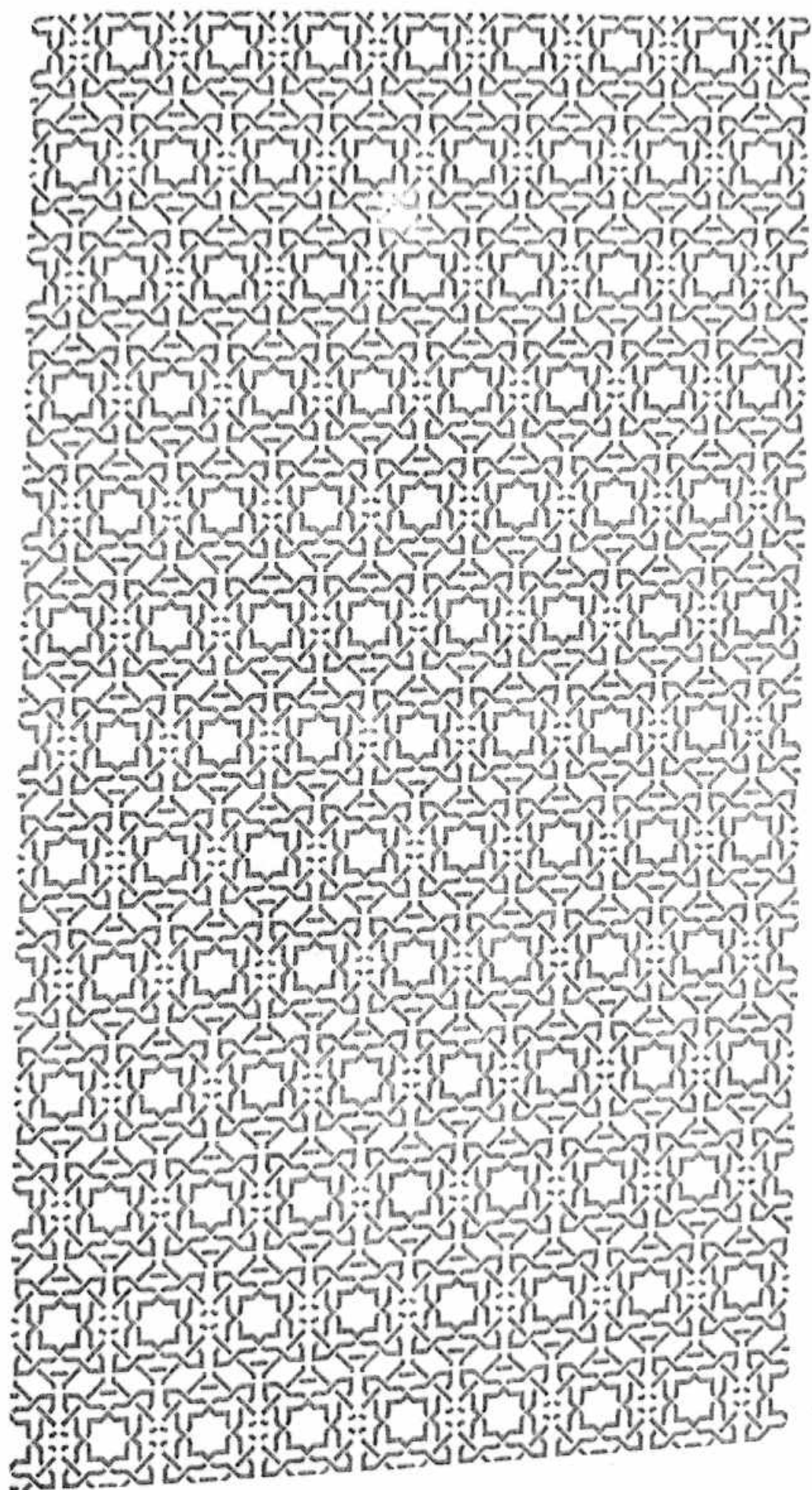
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب فی الوسوسۃ

حدیث میں لفظ "ولینته" سے مراد انتہاء عن الالتفات ہے

مشکوۃ میں حدیث متفق علیہ ہے:

یأتی الشیطان أحدکم فیقول من خلق کذا، من خلق کذا؟ حتی یقول من خلق ربك فإذا بلغه فلیستعذ بالله ولینته[1]

تم میں سے کسی ایک کے پاس شیطان آئے گا، پس کہے گا کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا اور فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا اور فلاں چیز کو کس نے بنایا؟ یہاں تک کہ کہے گا تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا؟ اس وقت اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنی چاہیے اور چاہیے کہ وہ اس وسوسہ سے دور ہو جائے۔

یہاں ولینته صیغہ امر ہے جس میں انتہا کا امر ہے، اگر اس سے مراد انتہاء عن الوسوسه ہے کہ اس وسوسہ سے رک جائے تو لازم آئے گا کہ وسوسہ امر اختیاری ہو، حالانکہ وسوسہ امر غیر اختیاری ہے اور اگر یہ مراد نہیں تو پھر کیا مراد ہے؟

---

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ مرفوعا.

عارفین کہتے ہیں کہ ولینتہ سے مراد انتہا عن الالتفات ہے کہ اس کی طرف التفات نہ کرے اور التفات امر غیر اختیاری ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عدم التفات کو دفع وساوس میں خاص دخل ہے۔

(وعظ: عصم النفوس، صفحہ نمبر: ۳۵۵ جلد نمبر: ۱۰، فضائل صوم وصلوٰۃ)

باب الایمان بالقدر
اشرف الکلام فی أحادیث خیر الأنام ﷺ
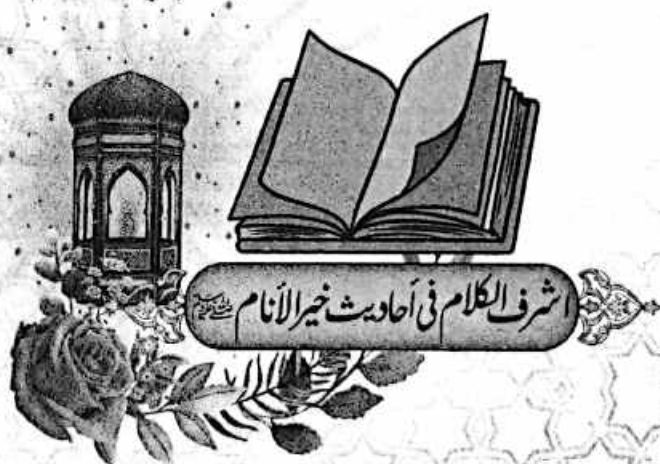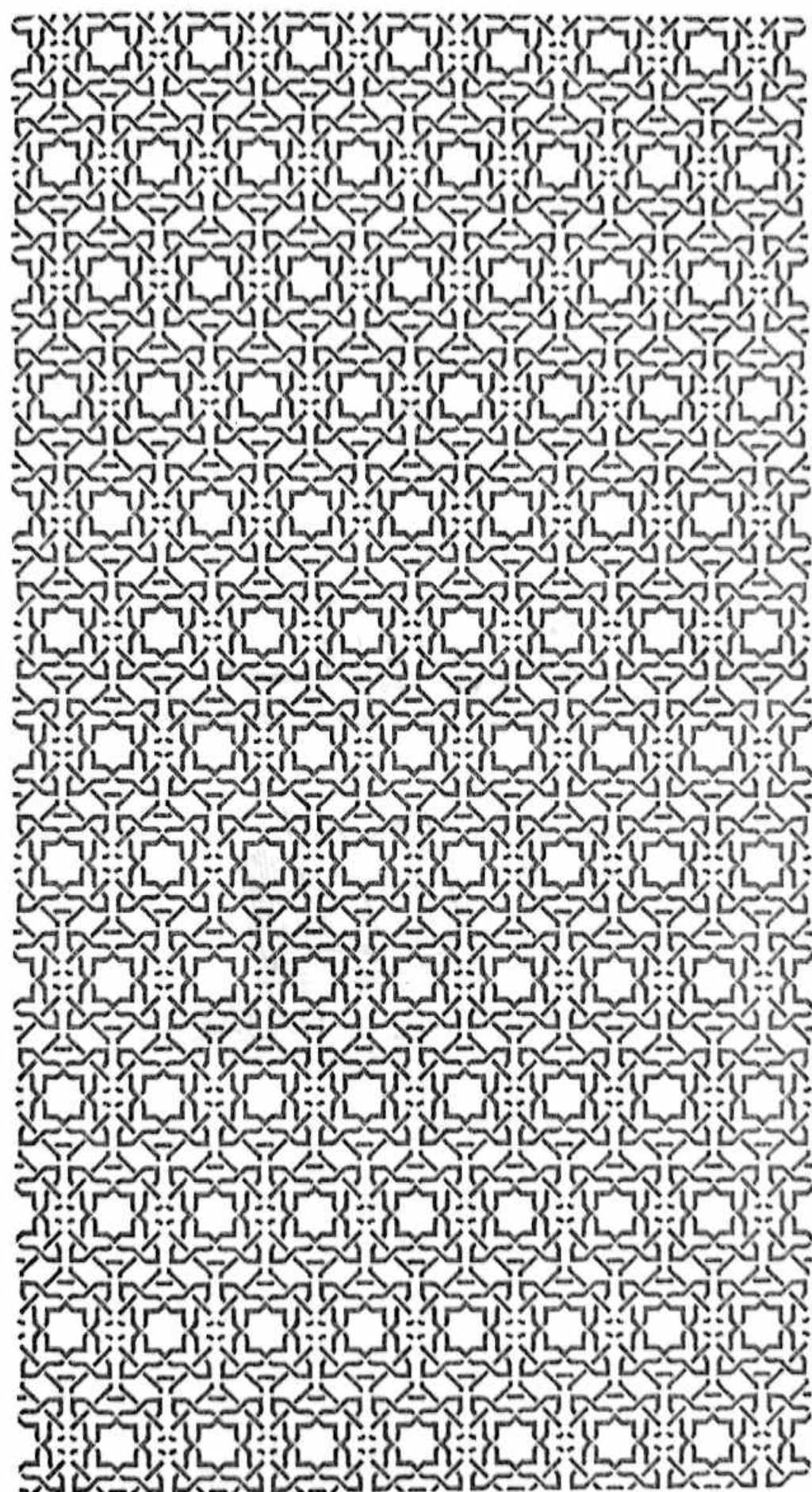
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

باب الایمان بالقدر

اللہ رب العزت نے کن علوم کا اظہار فرمایا اور کن علوم کا اظہار نہیں فرمایا؟

حدیث میں ہے ایک مرتبہ صحابہ نے قدر میں کلام کیا، اس پر حضور ﷺ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا:

ألهذا خلقتم، أم بهذا أمرتم، أم بهذا أرسلتم؟ لقد هلك من كان قبلكم حين تنازعوا فى القدر، عزمت عليكم، ألّا تتنازعوا فيه[1]

ترجمہ: کیا تم اس کے لیے پیدا کیے گئے ہو یا اس کا تم کو حکم دیا گیا ہے، یا میں تمہاری طرف اس لیے بھیجا گیا ہوں؟ تم سے بیشتر جن لوگوں نے قضا وقدر کے بارے میں جھگڑا کیا، ہلاک ہو گئے، میں نے تم پر عزم کر لیا ہے کہ قدر کے باب میں جھگڑا مت کرو۔

اب میں اس کی تعیین کرتا ہوں کہ کن علوم کا اظہار کیا گیا ہے اور کن علوم کا اظہار نہیں کیا گیا؟ اس کا معیار تو یہ ہے کہ بعض علوم تو وہ ہیں جن کو قرب وبعد میں دخل ہے،

---

(۱) أخرجه الإمام الترمذى فى سننه عن أبى هريرة ﷺ مرفوعا، رقم الحديث: ۲۱۳۳ باب ما جاء فى التشديد فى الخوض فى القدر.

جیسے مامورات ومنہیات، ان کوتو شریعت نے ظاہر کیا ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اسی میں زیارت کا اہتمام تھا۔حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

کانوا یسئلون النبی ﷺ عن الخیر و کنت أسئله عن الشر محافظة أن أقع فیه (او کما قال)[1]

کہ صحابہ رضی اللہ عنہم توحضور ﷺ سے خیر کی باتیں زیادہ پوچھتے تھے (جن کوقرب میں دخل تھا) اور میں آپ ﷺ سے شر کے متعلق بہت سوال کرتا تھا کہ اس میں مبتلا نہ ہوجاؤں جس سے بعد ہوجاوے، اسی کو کسی نے کہا ہے:

عرفت الشر لا للشر، لکن لتوقیه
ومن لا یعرف الشر من الخیر یقع فیه

(میں نے شرکو پہچانا، نہ شرکی وجہ سے، لیکن اس سے بچنے کی وجہ سے، لیکن جوشخص شرکو خیر سے نہیں پہچانتا تو وہ شر میں واقع ہوجاتا ہے)

ان علوم میں تو زیادت مطلوب ہے۔دوسرے وہ علوم ہیں جن کوقرب وبعد میں دخل نہیں، جیسے قدر کی حقیقت معلوم کرنا، پلِ صراط کی حقیقت معلوم کرنا اور یہ جاننا کہ نماز پنج وقتہ کیوں مقرر ہوئی ہے، کم وبیش کیوں نہیں ہوئی؟ اس کی کچھ ضرورت نہیں، نہ اس کے جاننے سے کچھ قرب میں ترقی ہوتی ہے، نہ عدمِ علم سے کچھ بعد ہے، ان علوم کو اسرار کہا جاتا ہے اور اسکے مقابل ان علوم کو جنہیں قرب وبعد میں دخل ہے، انوار کہنا چاہیے۔یہ لقب ان کے واسطے اس لیے مناسب ہے کہ نور کی شان ظاہر فی نفسہ، مظہر لغیرہ ہے اور یہ علوم بھی ایسے ہی ہیں کہ فی نفسہ خود ظاہر ہیں اور ان پر عمل کرنے سے اسرار بھی منکشف ہونے لگتے ہیں، گوان کا جاننا مقصود نہیں، مگر ان کے

---

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن حذیفة بن یمان رضی اللہ عنہ موقوفا.

حصول کا طریقہ یہ نہیں کہ اسرار بھی منکشف ہونے لگتے ہیں، گو ان کا جاننا مقصود نہیں، مگر ان کے حصول کا طریقہ یہ نہیں کہ اسرار کو بلا واسطہ طلب کیا جائے، بلکہ طریقہ یہ ہے کہ علومِ انوار کو حاصل کرو اور تقویٰ کے ساتھ ان پر عمل کرو۔ پھر خود حق تعالیٰ خود ہی اسرار بھی قلب پر القاء کر دیں گے، اور ان علوم کو انوار سے ملقب کرنے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۱) کہ حق تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کو چاہیں ہدایت کر دیتے ہیں اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (۲)

کہ قرآن سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ (لام معنی الیٰ ہے)

موؤدة کو عذاب دینے کا مطلب

الوائدة والموؤدة کلاهما فی النار (۳)

کہ زندہ گاڑنے والی اور زندہ درگور کی ہوئی دونوں جہنم میں ہوں گی۔

یہاں اشکال ہوتا ہے کہ مؤودہ کا کیا قصور ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس کا جہنم میں جانا قصور کی بناء پر نہیں ہے، بلکہ وائدہ کے عذاب روحانی کے لیے جاوے گی، تاکہ اس کو دیکھ دیکھ کر ماں کی حسرت بڑھے کہ میں نے اس کے ساتھ کیسی بے رحمی کا برتاؤ کیا تھا جس کی وجہ سے آج یہ عذاب اور رسوائی ہو رہی ہے تو وائدہ کو عذاب جسمانی بھی ہوگا اور عذاب روحانی بھی اور موؤدہ کا جہنم میں ہونا اس کے معذب ہونے کو مستلزم نہیں۔
(وعظ: الوصل والفصل صفحہ: ۲۲۲ جلد نمبر ۱۵ تسلیم ورضاء)

---

(۱) النور الایة: ۳۵.

(۲) الاسری الایة ۹

(۳) أخرجه الإمام أبو داود فی سننه عن عامر ﷺ مرفوعا، رقم الحدیث: ۴۷۱۷

الوائدة والموؤدة کلاھما فی النار

اس حدیث میں ظاہرا یہ شبہ ہوتا ہے کہ بچی نے کیا خطاء کی ہے جس کی وجہ سے دوزخ میں ڈالی گئی؟ علماء نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں، سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ بچی دوزخ میں تو ہوگی، مگر معذب نہ ہوگی، جیسے جہنم میں فرشتے بھی ہوں گے، مگر معذب نہ ہوں گے، مگر وہاں بھی ویسے ہی مقرب ہیں، جیسے جنت کے فرشتے جنت میں، کیونکہ اصل انعام تو یہ ہے کہ بندہ کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہو، خواہ دوزخ میں ہو یا جنت میں، اگر دوزخ میں معیت ہے تو پھر تکلیف کا کیا ذکر ہے، وہی جنت ہے اور اگر جنت میں معیت نہ ہوتی، وہ دوزخ سے بدتر ہوتی۔

با تو دوزخ جنت است اے جان فزا
بے تو جنت دوزخ است اے دل ربا

(اے میری جان! تیرا ساتھ ہو تو دوزخ بھی جنت ہے، اے دل ربا! تیرے بغیر جنت بھی دوزخ ہے۔)

خزنہ جہنم کے ساتھ خدا تعالیٰ کی معیت ہوگی، اس لیے وہ فرشتے آرام ہی میں ہوں گے۔

حقیقتِ تعذیب

اس کی واضح مثال دنیا میں موجود ہے، دیکھئے! جیل خانہ میں ایک تو مجرم ہوتے ہیں اور ایک وہ جو وہاں ملازم ہیں، مجرمین کو تکلیف ہوتی ہے کہ ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہوتا ہے اور ملازمین جیسے اور جگہ خوش ہوتے ہیں، اسی طرح وہاں بھی، وجہ یہی ہے کہ مجرمین کے ساتھ حکومت کی معیت نہیں ہوتی، بلکہ عتاب متعلق ہوتا ہے اور ملازمین کے ساتھ معیت ہوتی ہے۔

البتہ ایک شبہ یہاں یہ واقع ہوتا ہے کہ پھر موؤدہ کو جہنم میں رکھنے سے کیا فائدہ، جبکہ وہ معذب نہیں، کیا اس کے لیے جہنم ہی میں ٹھکانا تھا؟ جواب یہ ہے کہ اول تو ہمیں مصلحت دریافت کرنے کی مجال نہیں، خیر میں مصلحت بھی بتاتا ہوں، وہ یہ کہ بچی جس کو زندہ درگور کیا تھا، وہ ماں کے پیش نظر رہے، اس سے ماں کے لیے زیادتی عذاب کی مقصود ہے کہ اس کو دیکھ دیکھ کر اپنا فعل یاد کر کے خوب کڑھے اور رنج ہو کہ ہائے میں کیسی سنگدل تھی کہ میں نے اپنی بیٹی کے ساتھ یہ حرکت کی جس کی وجہ سے آج عذاب بھگت رہی ہوں۔ نیز! ممکن ہے کہ اس پر یہ حقیقت بھی منکشف نہ ہو اور وہ یہی سمجھتی رہے کہ میری بچی پر بھی عذاب ہو رہا ہے، حالانکہ وہ معذب نہیں اور حقیقت منکشف نہ ہونے سے اس کا حسرت اور رنج اور زیادہ ہو جاوے جو کہ باعث زیادتی عذاب کا ہے اور یہ ضرور نہیں کہ وہاں سب ہی کو ایسا انکشافِ عام ہو جاوے کہ کوئی چیز مخفی نہ رہے، ہاں! دنیا سے زیادہ وہاں انکشاف ہوگا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ممکنات کے علوم متناہی ہیں اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ بعض علوم مخفی بھی ہوں، بس ماں یہ سمجھے گی کہ مجھ پر عذاب ہے اور میری وجہ سے بچی پر بھی عذاب ہے، اس عذاب میں زیادتی ہوگی اور اولاد سے تعلق فطری ہے، وہاں بھی یہ تعلق بالکلیہ منقطع نہ ہوگا، کیونکہ فطریات عادۃ بدلا نہیں کرتے تو جب ماں یہ سمجھے گی کہ میری وجہ سے یہ بھی عذاب میں ہے، اس سے اس کی کلفت بڑھے گی، اگر اس محمل پر حدیث کو محمول کیا جاوے تو کیا قباحت ہے؟

(وعظ: احوال واقعی، صفحہ نمبر: ۳۵۲ تا ۳۵۳، برکات رمضان، جلد نمبر: ۱۶)

انسان اعمال سیئہ اپنے اختیار سے کرتا ہے

إن الرجل ليعمل عمل أهل الجنة، حتى لا يبقى بينه وبينها إلا قدر ذراع، فيسبق عليه الكتاب، فيكون من أهل النار

(او کما قال)[1]

(بیشک کوئی آدمی اہلِ جنت کے عمل کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو پھر تقدیر غالب آجاتی ہے اور وہ شخص دوزخی بن جاتا ہے۔)

کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ کوئی شخص باوجود اعمالِ صالحہ کے پھر بھی محض تقدیر کے غلبہ سے دوزخی ہوجاتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جبراً وقہراً کسی کو دوزخی نہیں بنایا جاتا اور نہ حدیث کا یہ مطلب ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی ابتداء میں اعمالِ صالحہ اختیار کرتا ہے، حتیٰ کہ جنت کے قریب ہوجاتا ہے اور انتہاء میں اپنے قصد وارادہ واختیار سے اعمالِ سیئہ پر کمر باندھ لیتا ہے اور جہنمی ہوجاتا ہے، یہ مطلب نہیں کہ بدونِ قصد واختیار کے اضطرار اس سے اعمالِ سیئہ صادر ہونے لگتے ہیں، کیونکہ عملِ اضطرار سے کوئی شخص معذب نہیں ہوسکتا۔ مضطر کو شریعت نے معذور کہا ہے اور اس سے مؤاخذہ نہیں کیا جاتا، پس فیسبق علیه الکتاب کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ بے اختیار جبرا معصیت کرنے لگتا ہے، کیونکہ یہ معصیت ہی نہیں، اکراہ واضطرار میں معصیت تو معصیت اجراءِ کلمہ کفر پر بھی مؤاخذہ نہیں ہوتا۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں اور قسم سے زیادہ اطمنان دلانے کا میرے پاس اور کیا ذریعہ ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ عذاب کے لیے بہانہ نہیں ڈھونڈتے، ہاں! رکنے کے لیے، البتہ بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ خدا کی قسم جو کوئی جہنم میں جائے گا، اپنی کرتوتوں سے جائے گا، بلاوجہ کسی کو عذاب نہ دیا جائے گا، بلکہ بندہ پر حجت کر کے جہنم میں بھیجا جائے گا۔

(وعظ: دواء الغفلت، صفحہ نمبر: ۲۰۵، جلد نمبر ۷، حقیقت عبادت)

---

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن زید بن وهب ﷺ مرفوعا، باب فی القدر.

باب اثبات عذاب القبر
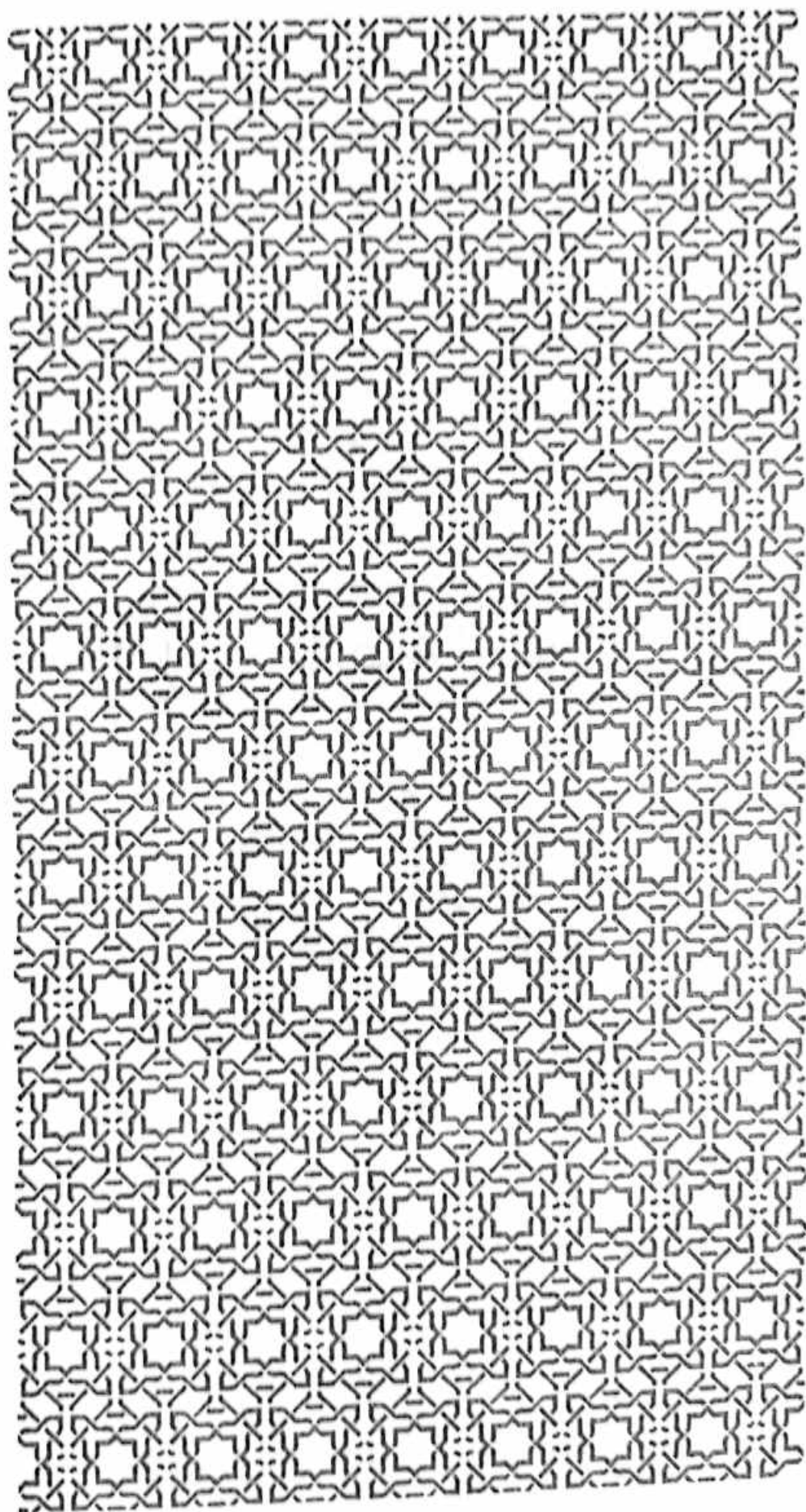
بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

باب اثبات عذاب القبر

مسلمانوں کو عذابِ جہنم کا احساس کفار سے کم ہوگا

میں مسلمانوں کو بشارت دیتا ہوں کہ ان کو عذاب جہنم کا احساس کفار سے بہت کم ہوگا، جس کی حقیقت ''مسلم'' میں ان الفاظ سے بیان کی گئی ہے، ''أماتهم الله فيها إماتة''[1] کہ حق تعالیٰ ان کو جہنم میں ایک قسم کی موت دیدیں گے، حدیث میں تو اتنا ہی ہے۔ شیخ عربیؒ نے اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ مومنین کو جہنم میں ایک مدت کے لیے ہلکی سی نیند آ جائے گی۔ حدیث ''النوم أخ الموت''[2] سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ نیز! اس سے بھی کہ ''أماتهم الله إماتة'' کا سیاق کلمہ بتلا رہا ہے کہ حقیقی موت تو مراد نہیں، ورنہ إماتة بڑھانے کی ضرورت نہ ہوتی، صرف اماتھم کافی تھا، یہ طرز کلام بتا رہا ہے کہ خاص قسم کی مراد جو موت کے مشابہ ہے، حقیقی موت مراد نہیں، واللہ اعلم۔

---

(١) أخرجه الإمام مسلم فی صحيحه عن أبی سعيد الخدری رضی الله عنه مرفوعا، رقم الحديث: ١٨٥ باب الشفاعة وإخراج الموحدين من النار)، سنن ابن ماجه رقم الحديث: ٤٣٠٩، مسند أحمد رقم الحديث: ١١٠٧٧.

(٢) أخرجه الامام البيهقی فی شعب الإيمان عن جابر رضی الله عنه مرفوعا، رقم الحديث: ٤٤١٦، معجم الأوسط رقم الحديث: ٩١٩.

شیخ عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد یہ بھی فرمایا ہے کہ اس نیند کی حالت میں وہ یوں خواب دیکھے گا کہ میں جنت میں ہوں اور خود ان کے پاس ہوں، یہ بات کہنے کی تو نہ تھی، کہیں مسلمان بے فکر نہ ہو جائیں کہ بس جہنم میں جا کر مزے سے سوئیں گے، جی ہاں! کبھی جاگو گے تو ہو ہی نہیں سکتا، اگر تھوڑی دیر کو بھی جاگ گئے تو نانی یاد آجائے گی۔

(وعظ: افناء المحبوب، صفحہ نمبر: ۳۹۴، تسلیم و رضاء جلد نمبر: ۱۵)

کتاب العلم
اشرف الکلام فی احادیث خیر الانام ﷺ
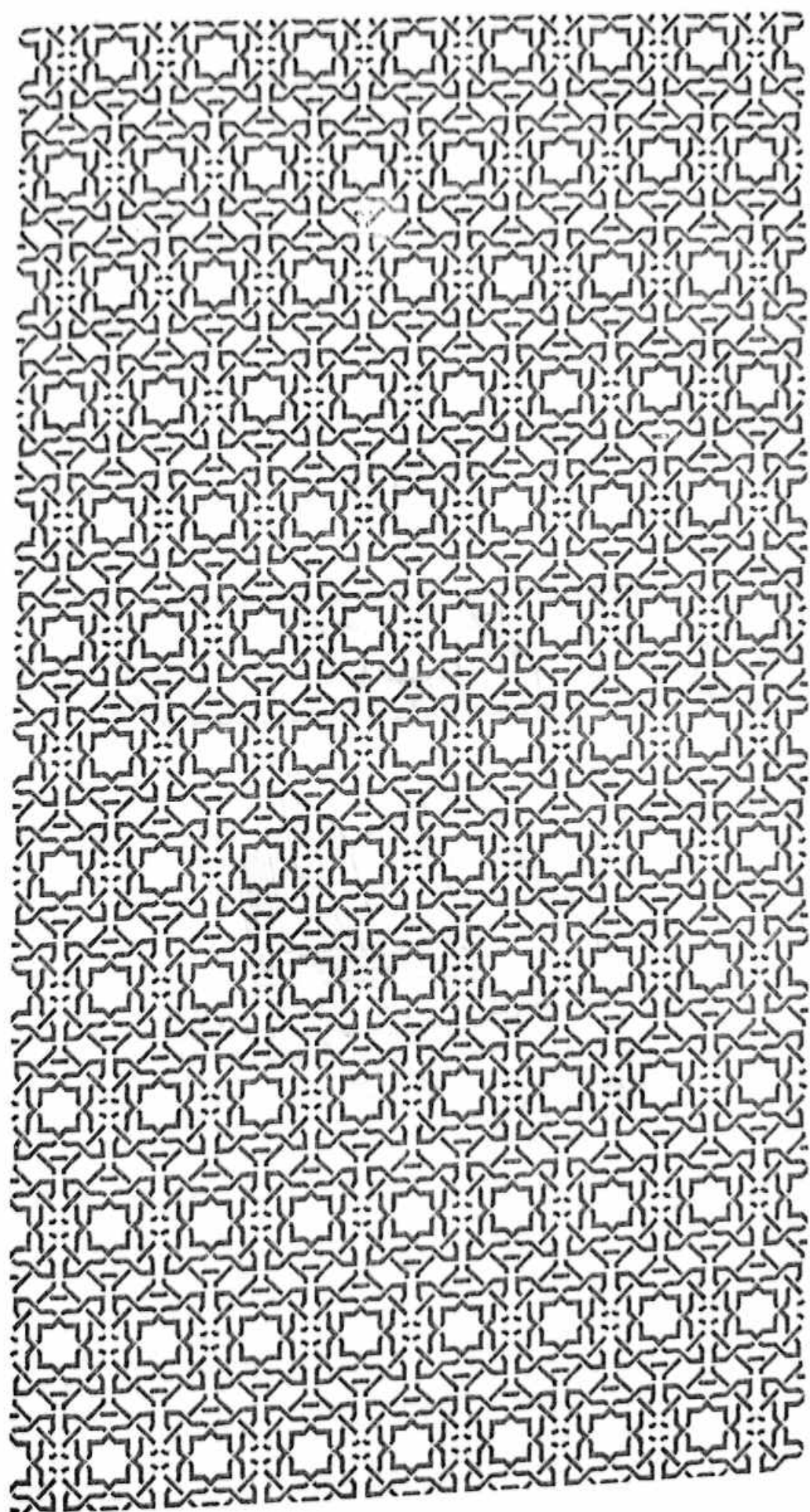
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کتاب العلم

وہ فقیہ جو شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ گراں ہے،

اس سے درسی فقہ مراد نہیں

فقیہ واحد أشد علی الشیطان من الف عابد [1]

(کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ گراں ہے)

اس سے درسی فقہ مراد نہیں، کیونکہ محض کتابیں پڑھنے سے شیطان کی چالیں سمجھ میں نہیں آتیں، بلکہ وہ معرفت ہے جو تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے، جس سے عارف کو دین کی سمجھ بوجھ ایسی کامل ہوجاتی ہے کہ شیطان کے تمام تارو پود (تانے بانے) کو توڑ دیتا ہے۔ شیطان بعض دفعہ دنیا کو دین کی صورت میں ظاہر کرتا، عارف اس دھوکے کو سمجھ کر لوگوں پر ظاہر کردیتا ہے جس سے لوگ دھوکے سے بچ جاتے ہیں، اس لیے وہ شیطان پر گراں ہے۔

(وعظ: کوثر العلوم، صفحہ نمبر: ۲۴۷، جلد نمبر: ۲ علم وعمل)

---

(۱) أخرجه الإمام الترمذی فی سننه عن ابن عباس رضی الله عنهما مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۶۸۱ باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة، سنن ابن ماجه: ۲۲۲.

اللہ رب العزت جس بلیغ کو ناپسند فرماتے ہیں، اس سے مراد بے تکلف اور بے فکر، زیادہ بولنے والا ہے

ایک حدیث میں ہے:

إن الله یبغض البلیغ من الرجال [١]

(اللہ تعالیٰ بلیغ لوگوں کو پسند نہیں فرماتے)

بلیغ سے مراد وہ نہیں جو اہلِ معانی کی اصطلاح میں ہے، بلکہ بلیغ سے مراد وہ شخص ہے جو بے تکلف بولتا چلا جائے، کیونکہ مذموم یہ ہی ہے اور بلاغت مصطلحہ مذموم نہیں، بلکہ محمود ہے (وَ قُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِیْغًا [٢]) بہرحال کثرتِ کلام مذموم ہے، حضرت شیخ فرید عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

دل ز پر گفتن بمیرد در بدن
گرچہ گفتارش بود در عدن

(زیادہ باتیں کرنے سے دل مرجاتا ہے، خواہ وہ باتیں درِ عدن کی ہی ہوں)

حضراتِ عارفین کو اس کا مشاہدہ شب و روز ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک کلمہ سے قلب سیاہ ہوجاتا ہے، اس کے متعلق تجربہ یہ ہے اور میں اس لفظ سے بھی شرماتا ہوں، کیونکہ در پردہ اس میں عارف ہونے کا دعوی ہے اور میں تو ان کی خاکِ پا بھی نہیں

---

(١) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن عبدالله بن عمرو رضی الله عنه مرفوعا، رقم الحدیث: ٢٨٥٣ باب ماجاء فی الفصاحة والبیان، وکذا أخرجه أبوداود فی سننه، رقم الحدیث: ٥٠٠٥

(٢) النساء الایة ٦٣

ہوں، بس یوں کہیے کہ تجربہ کاروں سے سنا ہے کہ ضروری گفتگو دن بھر ہوتی رہے تو اس سے قلب پر ظلمت کا اثر نہیں ہوتا، چنانچہ ایک کنجڑا دن بھر ''لے لو امرود'' پکارتا پھرے تو ذرہ برابر اس سے قلب میں ظلمت نہ آئے گی، کیونکہ بضرورت ہے اور بے ضرورت ایک جملہ بھی زبان سے نکل جائے تو دل سیاہ ہوجاتا ہے، پس شیخ فرید عطار رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا مطلب یہ ہوا کہ بے ضرورت باتیں کرنے سے دل سیاہ ہوجاتا ہے اور یہی مراد بلیغ سے حدیث میں ہے جو بے ضرورت زیادہ باتیں کرے اور بے تکلف، بے سوچے گفتگو کرے، کیونکہ ایسا وہی شخص کرسکتا ہے جو بے فکر ہو اور جس کے دل کو فکر لگا ہوا ہو، وہ بے تکلف گفتگو نہیں کرسکتا، میں دیکھتا ہوں کہ جس قدر علوم میں ترقی ہوتی جاتی ہے، اسی قدر کلام میں روانی کم ہوتی جاتی ہے اور اگر کبھی روانی زیادہ ہوتی ہے تو وہ مخاطبین کا فیض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخاطب کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں، ان کے افادہ کے لیے قلب میں مضامینِ مفیدہ کثرت سے وارد ہوجاتے ہیں، پس شیوخ ناز نہ کریں کہ ہم نے بڑے بڑے علوم واسرار بیان کردیئے، کیونکہ کبھی سامعین کی برکت سے بھی مضامین کا ورود ہوتا ہے اور اس وقت اس کی مثال قیف جیسی ہوتی ہے کہ وہ محض واسطہ ہے بوتل میں تیل پہنچانے کا، اب اگر قیف ناز کرنے لگے کہ میں نے تیل پہنچایا، یہ اس کی حماقت ہے، بلکہ اس کو بوتل کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس کی برکت سے اس کو بھی تیل سے کسی قدر تلبیس ہوگیا۔ ایک عالم کی حکایت ہے کہ ان کے وعظ میں ایک عارف موجود تھے، جو ان کی طرف متوجہ تھے، ان کی توجہ کا یہ اثر ہوا کہ وعظ میں عجیب عجیب علوم بیان ہوئے، درمیان میں واعظ کو عجب ہوا کہ آج تو میں نے بڑے بڑے علوم بیان کئے ہیں، عارف کو اس خطرہ کا کشف ہوگیا تو اس نے اپنی توجہ ان کی طرف سے ہٹالی، توجہ کا ہٹنا تھا کہ واعظ کو آمد بند ہوگئی، اس لیے کسی وقت روانی بیان میں ہوا اور علوم عجیبہ ہوجائیں تو اس کو سامعین کا فیض سمجھنا چاہیے، غرض کثرتِ کلام خود مقصود نہیں، بلکہ افادہ واستفادہ

کے لیے ذریعہ ہے اور مقصود عمل ہے۔

(وعظ: المرابطہ، صفحہ نمبر: ۴۸ تا ۴۹، حقیقت تصوف وتقوی، جلد نمبر: ۱۱)

عالم کے لیے مچھلیوں اور چیونٹیوں کے دعا کرنے کی دو وجوہات

حدیث میں ہے کہ عالم کے لیے مچھلیاں اور چیونٹیاں دعا کرتی ہیں۔ (۱)

لیڈر اور علماء:

گو آج کل لیڈروں کے نزدیک علماء عضوِ معطل اور بیکار ہیں، مگر حیوانات ان کے واسطے دعا کرتے ہیں، کیوں؟ دو وجہ سے: ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ نے ان کو اسی کام میں لگا دیا ہے کہ علماء کے واسطے دعا کریں، دوسرے اس واسطے کہ حیوانات کی خیر بھی بقاء علماء ہی کی وجہ سے ہے، کیونکہ بقاء عالَم علماء کی وجہ سے ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے:

لا تقوم الساعة حتی لا یقال فی الارض "الله، الله" (۲)

---

(۱) أخرجه الترمذی وابن ماجه فی سننهما وابن حبان فی الصحیح، رقم الحدیث: ۸۸ باب ذکر العلماء الذین لهم الفضل، لفظه: عن كثير بن قيس، قال: كنت جالسا مع أبی الدرداء فی مسجد دمشق، فأتاه رجل، فقال: يا أبا الدرداء، إنی أتيتك من مدينة الرسول فی حديث بلغنی أنك تحدثه عن رسول الله ﷺ، فقال أبو الدرداء: أما جئت لحاجة، أما جئت لتجارة، أما جئت الا لهذا الحديث؟ قال: نعم، قال: فانی سمعت رسول الله ﷺ، يقول: من سلك طريقا يطلب فيه علما، سلك الله به طريقا من طرق الجنة، والملائكة تضع أجنحتها رضا لطالب العلم ...الی اخر الحديث.

(۲) أخرجه الإمام مسلم فی صحيحه، رقم الحديث: ۲۳۵ باب ذهاب الإيمان فی آخر الزمان) لفظه: عن أنس، أن رسول الله ﷺ قال: " لا تقوم الساعة حتى لا يقال فی الأرض: الله، الله."

کہ جب تک خدا کا نام لیا جاتا رہے، اس وقت تک قیامت نہ آئے گی اور مشاہدہ ہے کہ دنیا میں اللہ کے نام کی بقاء علماء کی وجہ سے ہے۔
(وعظ: المرابطہ، صفحہ نمبر: ۵۸ تا ۵۹، حقیقت تصوف وتقویٰ، جلد نمبر: ۱۱)

ذکر اللہ، عالم اور متعلم دنیا کے مفہوم داخل نہیں

حضور ﷺ فرماتے ہیں:

"الدنیا ملعونة وملعون ما فیها إلا ذکر الله وما والاہ أو عالم أو متعلم"(۱)

(یعنی خدا کی رحمت سے دنیا دور ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے، وہ بھی خدا کی رحمت سے دور ہے، مگر خدا کا ذکر اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیز اور عالم یا متعلم)

یعنی ذکر اللہ اور اس کے مقدمات ومتعلقات اور عالم ومتعلم کو تو خدا کی رحمت سے بعد نہیں ہے، باقی سب رحمت سے بعید ہیں اور واقعی میں یہ استثناء منقطع ہے، متصل نہیں ہے، کیونکہ دنیا کے مفہوم میں ذکر اللہ اور عالم ومتعلم پہلے سے ہی داخل نہیں تو لعنت، یعنی بعد عن الرحمۃ (رحمت سے دوری) کا حکم خاص ان پر کر رہے ہیں جن کو دین سے تعلق نہ ہو، چنانچہ قرینہ اس کا وہ شعر ہے جو بعد میں کہتے ہیں:

اہلِ دنیا کافران مطلق اند
روز وشب در زق زق و در بق بق اند

(صرف کفار اہلِ دنیا ہیں، رات، دن زق زق، بق بق میں گرفتار رہتے ہیں)

---

(۱) أخرجه الإمام الترمذی فی سننه عن أبی هریرة ﷺ مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۳۲۲ باب ما جاء فی هوان الدنیا علی الله عز وجل)، سنن ابن ماجه رقم الحدیث: ۴۱۱۲

اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ تو لعنت سے بھی بڑھ کر ہے کہ یہاں سب اہل دنیا کو کافی ہی کہہ دیا، مگر ایک بزرگ نے اس کی خوب توجیہ فرمائی جس کے بعد یہ قرینہ ہو گیا بعد عن الرحمۃ کے محل کا، وہ توجیہ یہ فرمائی کہ اہل دنیا مبتدا اور کافران مطلق خبر نہیں ہے، بلکہ اہل دنیا خبر مقدم ہے اور کافران مطلق مبتدائے مؤخر ہے، یعنی جو کافران مطلق ہیں، وہی اہلِ دنیا ہیں، مومن اہل دنیا ہے ہی نہیں، کیونکہ ابھی حدیث سے معلوم ہو گیا ہے کہ خدا کے ذکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے ملعون نہیں ہیں تو کون مومن ایسا ہو گا جو خدا کے ذکر سے کچھ بھی علاقہ نہ رکھتا ہو گا، غرض وہی دنیا مذموم ہے جو آخرت بمعنی دین کے مقابلہ میں ہو۔

(وعظ: الصلاح والاصلاح، صفحہ نمبر: ۴۸۷ تا ۴۸۸، جلد نمبر: ۴، حقوق وفرائض)

علم کی فضلیت عمل کی وجہ سے ہے

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم [1]

کہ عالم کی فضلیت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضلیت ادنی امتی پر ہے۔

اس فضلیت کا منشاء یہ نہیں کہ علم کا نفع متعدی ہے اور عبادت کا نفع لازم، کیونکہ علم کا نفع بھی متعدی نہیں، لازم ہے، نفع اگر متعدی ہے تو تعلیم کا ہے، بلکہ فضلیت علم کا منشاء یہی ہے کہ وہ شرط عمل ہے، کیونکہ عبادت بدون علم کے نہیں ہو سکتی اور جو ہوتی ہے، وہ عبادت کی محض صورت ہوتی ہے، حقیقت نہیں ہوتی۔

(وعظ: اصل العبادۃ، صفحہ نمبر: ۱۱۴ تا ۱۱۵، جلد نمبر: ۷، حقیقت عبادت)

---

(۱) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن أبی أمامة الباهلی رضی الله عنه مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۶۸۵ باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة.

اللہ تعالیٰ کو بلا ضرورت کثرت کلام اور کثرت سوال ناپسند ہے

کثرت کلام ایسی چیز ہے، اس واسطے حدیث میں إن اللہ کرہ لکم قیل وقال[1] (یقیناً اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا تمہارے لیے کثرت کلام کو) کہہ کر حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے، ظاہراً تو اس میں کثرت کلام سے روکا ہے، لیکن جب ثابت ہوگیا کہ کثرتِ کلام اس قدر مفاسد کو ضمن میں لیے ہوئے ہے تو اس سے روکنا ان سب سے روکنا ہوگا۔ یہ حدیث کی بلاغت ہے کہ ذرا سے لفظ سے کس قدر اصلاحیں کی ہیں۔ یہ بیان ہوا حدیث کے ایک جملہ کا، اس کے بعد حدیث میں یہ لفظ ہے، کثرۃ السوال (اور کثرت سوال کو) اس سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ سوال کے معنی دو ہیں: ایک تو سب جانتے ہیں جس کا ترجمہ مانگنا اور ایک معنی اور ہیں جس کا ترجمہ ہماری زبان میں ہے پوچھنا، حضور ﷺ نے دونوں کی کثرت سے منع فرمایا ہے، یعنی نہ کثرت سے مانگو اور نہ کثرت سے پوچھو۔ لفظ کثرت سے معلوم ہوا کہ قلت کے ساتھ دونوں جائز ہیں، مگر یہ سمجھ لیجیے کہ تھوڑے سے مراد یہ نہیں کہ پیسہ دو پیسہ مانگ لینا جائز ہے اور زیادہ نہ مانگے یا ایک آدھ مسئلہ پوچھ لینے میں کچھ حرج نہیں، زیادہ نہ پوچھے، بلکہ دونوں صورتوں میں قلیل کا معیار یہ ہے کہ محتاج الیہ کا سوال جائز ہے، یعنی ضرورت کے وقت سوال جائز ہے اور بلا ضرورت جائز نہیں، خواہ سوال کے معنی مانگنے کے لیے جاویں یا پوچھنے کے، بہر تقدیر معنی یہ ہوئے کہ ضرورت کے وقت مانگنا بھی جائز ہے اور پوچھنا بھی، اور بلا ضرورت مانگنا بھی جائز نہیں اور پوچھنا بھی جائز نہیں، پھر ضرورت کے وقت جو سوال کیا جاوے، وہ چاہے قلیل ہو یا کثیر، وہ سب قلت میں داخل ہے اور جو سوال بے ضرورت کیا جاوے وہ کثرت میں

---

(۱) أخرجہ الشیخان فی صحیحہما عن للمغیرۃ بن شعبۃ رضی اللہ عنہ مرفوعاً.

داخل ہے، چاہے وہ ایک پیسہ ہی ہو یا ایک بات ہی ہو۔

(وعظ: ذم المکروہات، صفحہ نمبر: ۱۵۴ تا ۱۶۲، جلد نمبر: ۱۲۶ اصلاح اعمال)

”جو فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے“ اس سے کون مراد ہے؟

فقیه واحد أشد على الشيطان من ألف عابد۔[1]

کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

مراد فقیہ النفس ہے جو احکام کے ساتھ نفس و شیطان کے مکائد سے بھی عارف ہو اور سلف کی اصطلاح میں فقہ محض علمِ ظاہر کے ساتھ مختص نہ تھا، بلکہ علمِ باطن بھی اس میں داخل تھا، چنانچہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی تعریف

معرفة النفس مالها وما عليها

منقول ہے جس میں علمِ اخلاق وسلوک بھی داخل ہے، کیونکہ معرفۃ النفس مالہا وما علیہا اس کو بھی شامل ہے، پس حدیث میں فقہ کے وہی معنی ہیں جو سلف میں متعارف تھے، نہ وہ معنی جو متاخرین کی اصطلاح ہے۔ فقیہ ظاہر تو ہجومِ وساوس سے ذکر اور تلاوتِ قرآن کو چھوڑ بیٹھتا ہے جس سے شیطان اپنے مقصود میں کامیاب ہوجاتا ہے، مگر فقیہِ باطن کہتا ہے کہ اس حالت میں کام کو ہرگز نہ چھوڑے، بلکہ کام میں لگا رہے، چاہے کتنے ہی وسوسے آئیں گے، کچھ پروانہ کرے اور وساوس سے ہرگز پریشان نہ ہو، ان کو دفع کرنے کی کوشش کرے اور نہ ازخود ادھر متوجہ ہو، بلکہ اپنی توجہ کو ہمت کے ساتھ ذکر وغیرہ میں مشغول کرے اور وساوس سے بے توجہی اور بے التفاتی برتے، ان شاء اللہ چند روز میں خود ہی سب وسوسے جاتے رہیں گے اور شیطان اپنی

---

(۱) أخرجه الترمذي وابن ماجه في سننيهما عن ابن عباس رضي الله عنهما مرفوعا.

مراد میں ناکام ہو کر خود ہی پیچھا چھوڑ دے گا۔
(وعظ: ماعلیہ الصبر ،صفحہ نمبر: ۱۵۳ تا ۱۵۴ ،جلد نمبر: ۹ فضائل صبر و شکر)

اطلبوا العلم ولو بالصین کی حیثیت اور مطلب

انہوں نے انگریزی تعلیم کا ثبوت اطلبوا العلم ولو بالصین [۱] سے نکالا ہے اور استدلال اس طرح کیا کہ حضور ﷺ نے چین سے بھی طلب علم کا امر فرمایا ہے، حالانکہ وہاں اس وقت علم دین بالکل نہ تھا، محض مصنوعات کا علم تھا، معلوم ہوا کہ یہ علم بھی شرعاً مطلوب ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ حدیث ثابت نہیں، محدثین نے اس کو ضعیف، بلکہ بعض نے بے اصل کہا ہے۔ [۲]

دوسرے اگر بطریق تنزل اس کو مان بھی لیا جائے تو خود اس حدیث ہی کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ اس میں ایسے علم کی تحصیل کا ذکر فرما رہے ہیں جو چین میں نہ تھا، کیونکہ اس میں لفظ ولو ہے جو کہ لغۃً فرض و تقدیر کے لیے ہے اور

---

(۱) أخرجه فی شعب الإیمان عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله ﷺ: "اطلبوا العلم ولو بالصین، فإن طلب العلم فریضة علی کل مسلم" "هذا حدیث متنه مشهور، واسناده ضعیف" وقد روی من أوجه، کلها ضعیف.

(۲) قال السخاوی فی المقاصد الحسنة - (۱۲۱/۱)، مطبع دار الکتاب العربی، بیروت حدیث: اطلبوا العلم ولو بالصین، فان طلب العلم فریضة علی کل مسلم، البیهقی فی الشعب، والخطیب فی الرحلة وغیرها، وابن عبد البر فی جامع العلم، والدیلمی، کلهم من حدیث أبی عاتکة طریف بن سلمان، وابن عبد البر وحده من حدیث عبید بن محمد عن ابن عیینة عن الزهری کلاهما عن أنس مرفوعا به، وهو ضعیف من الوجهین، بل قال ابن حبان: انه باطل لا أصل له، وذکره ابن الجوزی فی الموضوعات، وستأتی الجملة الثانیة فی الطاء معزوة لابن ماجه وغیره مع بیان حکمها.

فرض معدومات کے ساتھ خاص ہوتا ہے، موجودات کو فرض نہیں کیا جاتا۔ اب تو اس حدیث سے بھی یہ ثابت ہوگیا کہ حضور ﷺ ایسے علم کی تاکید فرمارہے ہیں جو چین میں اس وقت مفقود تھا اور بطور فرض کے فرمارہے ہیں کہ اگر چہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو اور وہ علم دین ہے، نہ کہ علم مصنوعات۔

(وعظ: النسواں فی رمضان، صفحہ نمبر: ۱۸۰، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

وعظ تین افراد کہتے ہیں

حضور ﷺ نے فیصلہ فرمادیا ہے:

لا یقص إلا أمیر أو مأمور أو مختال [1]

یعنی وعظ تین شخص کہتے ہیں: ایک حاکم، دوسرے وہ جو مامور ہو، یعنی جس کو حاکم اسلام نے اس کام کے لیے مقرر کیا یا اہل حل وعقد نے جو حاکم کو بھی حاکم بناتے ہیں۔ یہ اہلِ علم کے سمجھنے کی بات ہے کہ اہل حل وعقد اصل ہیں اور حاکم ان کا نائب ہے، یعنی جو اہل الرائے ہوں، مثلاً علماء مشائخ، کیوں کہ یہی دین کے سمجھ دار لوگ ہیں، وہ جس کو وعظ کہنے کی اجازت دیدیں یا ان کا نائب جو امیر المومنین ہے، وہ کسی کو مامور کردے تو یا خود حاکم یا جس کو حاکم یا ایسے علماء متفق ہو کر مامور کردیں، وہی وعظ کہہ سکتا ہے۔ تیسرا اگر کہے تو وہ متکبر ہے، معلوم ہوتا ہے دنیا کا طالب ہے، چاہتا ہے کہ کچھ روپیہ کوئی رقم ہاتھ آجائے، اسے جائز نہیں وعظ کہنا۔

(وعظ: رمضان فی رمضان، صفحہ نمبر: ۱۶۵، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

---

(۱) أخرجه الامام أبو داود فی سننه عن عوف بن مالك الاشجعی مرفوعا، رقم الحدیث: ۳٦٦٥، (باب فی القصص)، مسند أحمد رقم الحدیث: ۲۳۹۷٤.

كتاب الطهارة
اشرف الکلام فی أحادیث خیر الأنام ﷺ
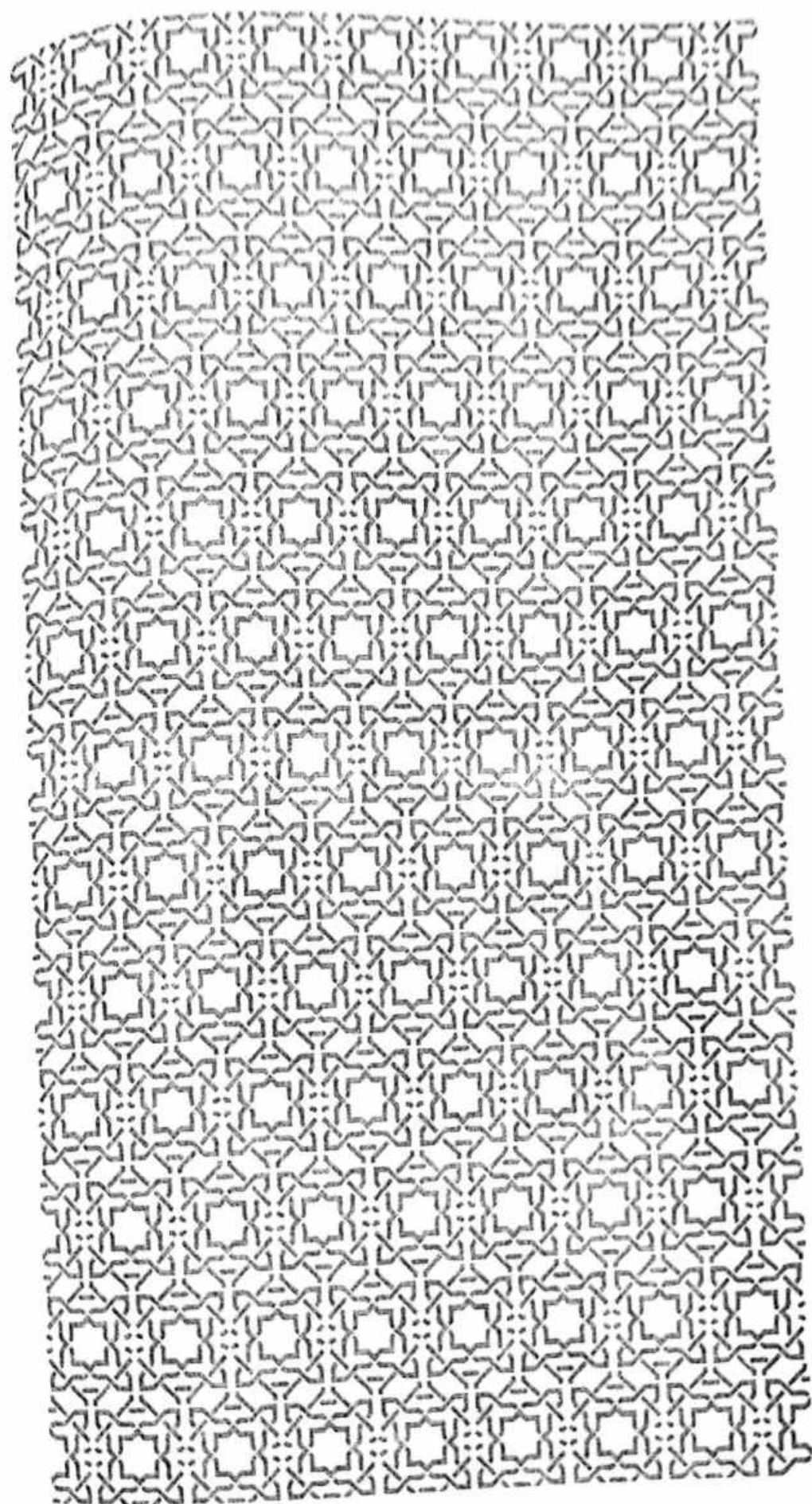
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الطہارۃ

وساوس کا نہ آنا مطلوب نہیں، بلکہ التفات نہ کرنا مطلوب ہے

من توضأ فأحسن الوضوء، ثم صلی رکعتین مقبلا علیهما بقلبه، لا یحدث فیهما نفسه غفر له ما تقدم من ذنبه او کما قال[1] (جس شخص نے وضو کیا اور اچھی طرح کیا، پھر دو رکعت اس طرح پڑھے کہ دل سے ان پر متوجہ ہو اور ان میں نفس سے باتیں نہ کرے، وہ جنت میں داخل ہوگا)

حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا: ”لا تتحدث فیهما نفسه“ (کہ اس کا دل بھی باتیں نہ کرے) بلکہ لا یحدث فیهما نفسه فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیار سے وساوس نہ لائے، گو خود آجائیں، اس کا مضائقہ نہیں، اور جب وساوس کا آنا مذموم نہیں تو اس کا نہ آنا بھی مطلوب نہیں، ہاں! وسوسہ کا از خود لانا مطلوب ہے، پس جو خود وسوسہ نہ لاتا ہو، اس کو مطلوب حاصل ہے، اب اس کو یہ چاہنا کہ بلا قصد بھی وساوس نہ آیا کریں، غیر مقصود کی طلب ہے۔

---

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن حمران، مولی عثمان عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مرفوعا.

احادیث میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا وسوسہ کی شکایت کرنا وارد ہے، جس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے ان کو کوئی ایسا وظیفہ نہیں بتلایا جس سے وساوس کا آنا بند ہو جائے، بلکہ حضور اقدس ﷺ نے عدمِ التفات کا امر فرمایا ہے:

بقوله ذالك صريح الايمان (۱) وبقوله فليستعذ بالله ولينته (۲)

جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے کو ذکر کی طرف متوجہ کردے اور وسوسہ کی طرف التفات نہ کرے، یعنی از خود اس کی طرف متوجہ نہ ہو، یہی مفہوم ہے، لینتہ کا، نہ یہ کہ اس کی نفی کی طرف متوجہ ہو، اس سے صاف معلوم ہوا کہ وساوس کا نہ آنا مطلوب نہیں، ورنہ رسول اللہ ﷺ اس کی مطلوبیت کو ظاہر فرماتے۔

(وعظ: کوثر العلوم، صفحہ نمبر: ۲۲۸ تا ۲۲۹، جلد نمبر: ۲ علم وعمل)

استقیموا ولن تحصوا کی تشریح

بعض لوگوں کو حدیث استقیموا ولن تحصوا (۳) مستقیم رہو اور اسے پورا شمار نہ کرو) سے شبہ ہوا ہے جس کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں مستقیم رہو، مگر تم سے احصا نہ ہو سکے گا اور کہتے ہیں کہ

---

(۱) أخرجه الإمام مسلم فی صحيحه عن أبی هريرة رضي الله عنه مرفوعا، رقم الحديث: ۲۰۹ باب بيان الوسوسة فی الإيمان ومن يقوله من وجدها، وكذا أخرجه أبو داود فی سننه رقم الحديث: ۵۱۱۱.

(۲) أخرجه الشيخان فی صحيحيهما عن أبی هريرة رضي الله عنه مرفوعا.

(۳) أخرجه الامام ابن ماجه فی سننه عن ثوبان رضي الله عنه مرفوعا، رقم الحديث: ۲۷۷ باب المحافظة عل الوضوء، وكذا أخرجه الإمام مالك رحمه الله فی الموطا، رقم الحديث: ۳۶ باب جامع الوضو.

دیکھو اس میں حضور ﷺ نے بتلا دیا کہ استقامت پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتی، اس کا احصا دشوار ہے، مگر یہ مطلب بیان کرنے والا بعینہ اس کا مصداق ہے کہ:

حفظت شیئا و غابت عنك اشیاء

(ایک چیز تم نے یاد کر لی، اور بہت سی چیزیں تم سے غائب رہیں)

صاحب! اگر و لن تحصوا کا متعلق وہی استقامت ہے جس کا امر کیا گیا تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ حضور ﷺ ایسے کام کا حکم فرماتے ہیں جو کبھی نہیں ہو سکتا، یہ تو لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا [1] کے صریح خلاف ہے کہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ استقامت حاصل کرو اور یہ بھی فرما رہے ہیں کہ تم سے نہ ہو سکے گی، تو پھر جو کام ہو ہی نہیں سکتا، اس کا امر ہی کس واسطے کیا گیا؟ اس لیے یہ مطلب غلط ہے۔ میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ

استقیموا ما استطعتم و لا تتعمقوا فیها فإنکم لن تحصوها و لا یشاد الدین أحد إلا غلبه.

یعنی جتنی استقامت تم سے ہو سکے حاصل کرو، یہ تو مامور بہ ہے، باقی اس میں تعمق و مبالغہ نہ کرو، کیونکہ یہ مامور بہ نہیں اور تعمق و مبالغہ سے جس اعلیٰ درجہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ تم سے نہ ہو سکے گا اور یہ تو ان لوگوں کے خلاف ہے، کیونکہ وہ استقامت کے اعلیٰ درجہ کو مامور بہ کہتے ہیں۔

اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ وہ اعلیٰ درجہ جس میں تعمق و مبالغہ ہو، مامور بہ نہیں ہے۔ باقی جو مطلب حدیث کا یہ لوگ سمجھے ہیں، وہ تو نص کے خلاف ہے، حق تعالیٰ نے

---

(۱) البقرة الایة: ۲۸٦.

وسعت سے زیادہ کہیں امر نہیں کیا۔

(وعظ: الاستقامت، صفحہ نمبر: ۸۷۳ تا ۳۷۹، جلد نمبر: ۱۳، دعوت وتبلیغ)

اللہ اکبر کہنے سے زمین و آسمان کی درمیانی فضا کا بھرنا

اور سبحان اللہ اور الحمد للہ سے پوری میزان کا بھر جانا:

حدیث ترمذی میں ہے کہ ایک بار اللہ اکبر کہنے سے آسمان وزمین کی درمیانی فضا بھر جاتی ہے اور سبحان اللہ کہنے سے آدھی میزان عمل اور الحمد للہ سے پوری میزانِ عمل بھر جاتی ہے۔ (۱)

یہ اس لیے فرمایا کہ شاید کسی کو اللہ اکبر کا ثواب سن کر یہ احتمال ہو کہ نہ معلوم میزان عمل بھی کسی چیز سے بھری ہوگی، کیونکہ ممکن ہے وہ آسمان وزمین کی فضا سے بھی زیادہ ہو تو ایک عمل سے اگر فضا بھی بھر جاتا ہے تو ممکن ہے وہ آسمان و زمین بھرنے کے لیے کافی نہ ہو اور ہم کو سابقہ پڑے گا میزان ہی سے، خصوصاً طالب علموں کو ایسے احتمالات بہت ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک تو کٹورا بھی حوض کے برابر ہوسکتا ہے، جب طلباء کے نزدیک کٹورہ بھی حوض کے برابر ہوسکتا ہے تو میزان عمل ان کے نزدیک زمین وآسمان سے بڑا ہو تو کیا بعید ہے، کیونکہ میزان عمل تو اللہ کی میزان ہے، اس لیے حضور ﷺ نے شبہ کو رفع کرنے کے

(۱) أخرجه الامام الترمذی فی سننه، رقم الحدیث: ۳۵۱۹، ولفظه: عن جری النهدی، عن رجل، من بنی سلیم، قال: عدهن رسول الله ﷺ فی یدی أو فی یده: التسبیح نصف المیزان، والحمد یملؤه، والتکبیر یملأ ما بین السماء والارض، والصوم نصف الصبر، والطهور نصف الایمان.: هذا حدیث حسن. وقد رواه شعب، وسفیان الثوری، عن أبی سحاق.

لیے فرمایا کہ:

الحمد للہ یملأ المیزان

الحمدللہ سے میزان عمل بھر جاتا ہے۔

اب وہ شبہ رفع ہوگیا کہ شاید میزان خالی رہے۔ ایسے ہی شاید کوئی نہ سمجھے کہ سبحان اللہ، الحمد للہ سے میزان عمل تو بھر ہی جائے گا، پھر اور عمل کی کیا ضرورت؟

اس کے دو جواب ہیں: ایک الزامی، ایک تحقیقی۔ الزامی جواب تو یہ ہے کہ سبحان اللہ، الحمدللہ سے میزان کا ایک پلہ ہی تو بھرے گا، کیونکہ اگر وہ بھی بھر گیا تو آپ جنت میں نہ جا سکیں گے، بلکہ اعراف میں رہیں گے اور اگر وہ بہت زیادہ بھر گیا کہ اعمال صالحہ کے پلے سے بھی بھاری ہوگیا تو جہنم میں جانا پڑے گا، اس لیے دوسرے پلہ کی فکر بھی لازم ہے جس میں گناہ رکھے جائیں گے اور ترکِ صلوٰۃ وترکِ صیام وترکِ زکوٰۃ وترکِ حج، یہ سب معاصی ہیں۔ اگر گناہوں کا پلہ بھاری ہوگیا تو نیکیوں کا پلہ بھر جانے سے کیا ہوگا۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جو سبحان اللہ والحمدللہ کا ثواب بیان فرمایا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کلمات کی یہ خاصیت ہے یہ ایسا ہے جیسے طبیب یہ کہے کہ بنفشہ میں یہ خاصیت ہے کہ وہ دماغ کا تنقیہ کرتا ہے، مگر سب جانتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تک اس کے ساتھ کوئی مضر شے استعمال نہ کی جائے جو اس کی خاصیت کو باطل کردے۔ اب اگر کوئی سنکھیا کھا کر بنفشہ پی لے تو بتلایئے بنفشہ سے کیا خاک نفع ہوگا اور اگر اس صورت میں بنفشہ کی خاصیت کا ظہور نہ ہو تو کیا حکیم کے دعوے کو غلط کہا جائے گا؟ ہرگز نہیں۔

عنایت ربی

ایسے ہی یہاں سمجھو کہ سبحان اللہ الحمد للہ کی واقعی یہ خاصیت ہے کہ میزان عمل کو بھر دیتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ کوئی منافی عمل نہ پایا جائے۔

(وعظ: الجبر بالصبر، صفحہ: ۲۷۱ تا ۲۷۷، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر و شکر)

کتاب الصلوٰۃ
اشرف الکلام فی اَحادیث خیر الانام ﷺ
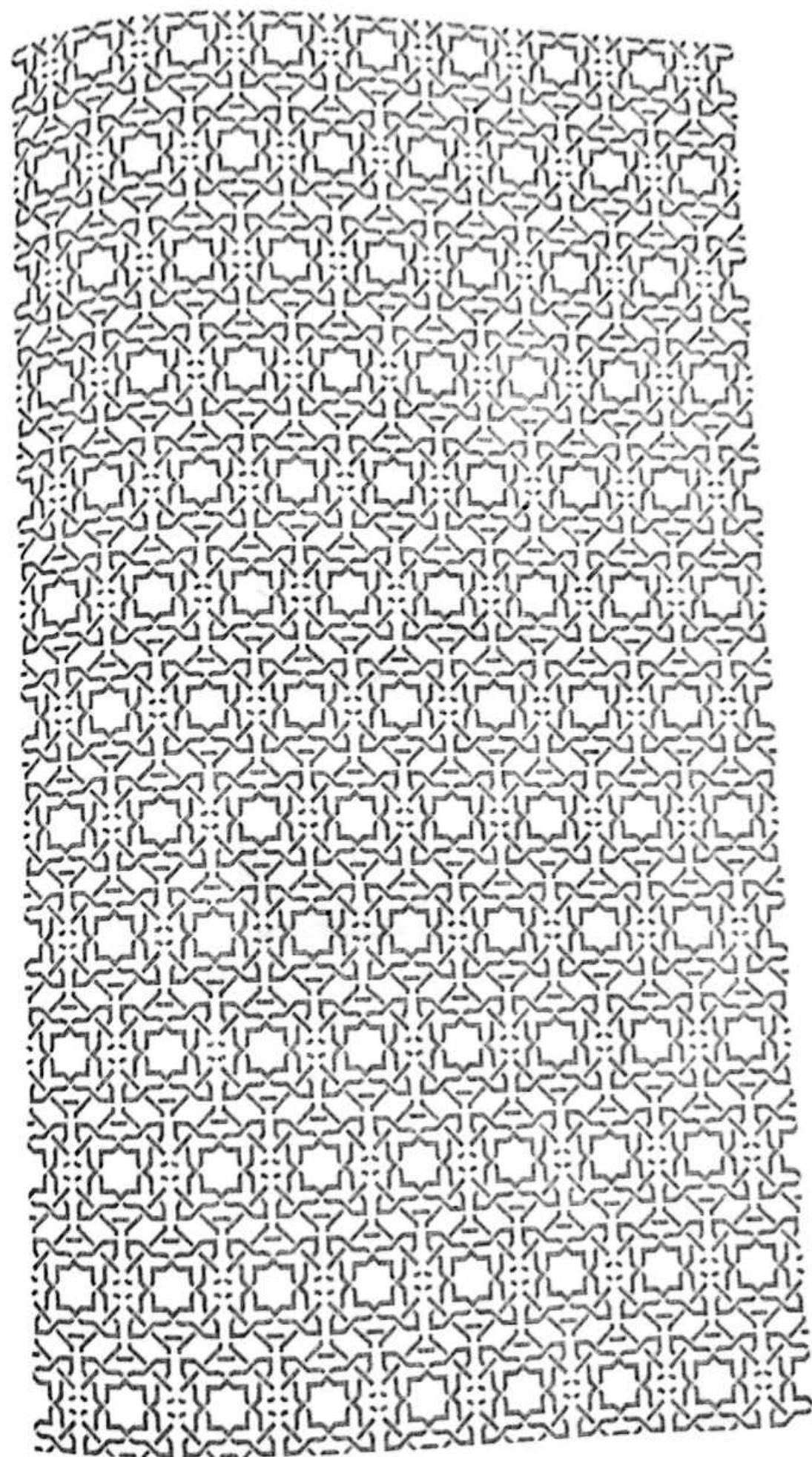
بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب الصلوٰۃ

بعض اعمال نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتے اور بعض موجب ثواب نہیں بنتے

انما الاعمال بالنیات (۱)

کا حکم گناہوں میں نہیں، گناہ کسی نیت سے بھی جائز نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ بعض اعمال نیت کے بغیر موجب ثواب نہیں ہوتے، جیسے مباحات اور بعض بغیر نیت کے صحیح نہیں ہوتے، جیسے نماز وروزہ وغیرہ۔

بے وضو نماز

چنانچہ اگر کوئی شخص نماز کی صورت بنالے، لیکن نماز کی نیت نہ کرے تو وہ نماز نہیں ہے۔

(وعظ: تعیم التعلیم، صفحہ نمبر: ۱۳۲ تا ۱۳۳، جلد نمبر: ۲، علم وعمل)

نماز میں استغراق کا ہونا کمال نہیں، بلکہ خشوع حاصل ہونا کمال ہے

کامل حضور ﷺ سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے؟ مگر آپ ﷺ کو کبھی نماز میں استغراق نہ ہوتا تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ میں یہ سوچ کر آتا ہوں کہ آج نماز میں تطویل کروں گا، مگر بچہ کی آواز سنتا ہوں تو اس خوف سے مختصر کردیتا ہوں کہ شاید

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه مرفوعا.

کوئی بچہ والی عورت نماز میں ہو اور بچہ کی آواز سے پریشان ہو، اس وقت عورتوں کو مسجد میں حاضر ہونے کی اجازت تھی، مگر جب سے فتنہ کا خوف پیدا ہوا، ممانعت ہوگئی، تو حضور ﷺ بچہ کا رونا نماز میں سنتے تھے، معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو نماز میں استغراق نہ ہوتا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں استغراق کا ہونا کمال نہیں۔

اس سے ایک اور مسئلہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ آپ ﷺ فرماتے ہیں مخافة ان تفتن امه، [1] یعنی احتمال تھا کہ اس کی ماں کو پریشانی ہو، معلوم ہوا کہ انبیاء کا کشف دائمی نہیں ہوتا، لہٰذا اولیاء کا بھی دائمی نہیں ہوسکتا اور اس سے بھی معلوم ہوا کہ خشوع استغراق کو نہیں کہتے، کیونکہ حضور ﷺ کو نماز میں خشوع یقیناً ہوتا تھا، اور کیوں کر نہ ہوتا جب حق تعالیٰ مطلق مومنین کاملین کے باب میں فرماتے ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲ [2]

(تحقیق ان مسلمانوں نے آخرت میں فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں)

پس جب ایمان کے لوازم سے خشوع ہے تو نیت کے لوازم سے بدرجہ اولیٰ ہوگا اور حضور ﷺ کو استغراق نہیں تھا، معلوم ہوا کہ خشوع اور حضور قلب اور شے ہے اور استغراق اور شئے ہے اور اگر دونوں ایک ہی ہوں تو اجتماعِ نقیضین (دو ضدوں کا جمع ہونا) لازم آئے گا، کیونکہ باقتضائے آیت حضور ﷺ میں خشوع ہے اور بدلالتِ حدیث استغراق نہیں، اگر یہ دونوں ایک ہی شے سے ہوتے تو ایک ہی شے کا

---

(۱) أخرجه الامام البخاری فی صحیحه، رقم الحدیث: ۷۰۸، باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبی) ولفظه: عن أنس بن مالك، یقول: ما صلیت وراء امام قط أخف صلاة، ولا أتم من النبی ﷺ وان كان لیسمع بكاء الصبی، فیخفف مخافة أن تفتن أمه.

(۲) المؤمنون الاية: ۱

ہونا اور نہ ہونا لازم آئے گا، اور یہ محال ہے، لوگ غلطی سے یہ سمجھ گئے کہ خشوع واستغراق ایک ہی شے ہے، اور خشوع ہے روحِ صلوٰۃ، تو استغراق بھی روحِ صلوٰۃ ہے اور جب استغراق نہیں تو روح نہیں، جب روح نہیں تو بے روح کی نماز کس کام کی؟ تو یہ سمجھے کہ ہماری نماز بے قدر ہے کہ اس میں استغراق نہیں، حالانکہ ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ استغراق اور شے ہے اور وہ روح صلوٰۃ نہیں، ورنہ لازم آئے گا کہ حضور ﷺ کی نماز بھی بے روح ہو۔

(وعظ: روح القیام، صفحہ نمبر: ۶۴ تا ۶۵، برکات رمضان، جلد نمبر: ۱۶)

ذکر اللہ کی طرف توجہ کو اللہ رب العزت اپنی ہی طرف توجہ شمار کرتے ہیں

بہر حال ذکر حقیقی وہ تھا کہ ذکر کا ذکر نہ ہو، مگر یہاں دوسرے دلائل سے ذکرِ ذکر ہی پر اکتفاء کیا گیا ہے کہ تم ذکرِ ذکر ہی رکھو، ہم اپنی رحمت سے اسے بھی لذکری میں داخل کر دیں گے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس کی کیا دلیل کہ صرف ذکر ذکر پر اکتفاء کرنے کی اجازت دیدی، اس کی دلیل حدیث میں ہے من توضاء ثم صلی رکعتین مقبلا علیهما بقلبه، لم یحدث فیهما نفسه[1] جس شخص نے وضو کیا، پھر دو رکعت نماز حضورِ قلب سے ادا کیں کہ ان میں وسوسہ نہ آیا) تحیۃ الوضوء کی فضلیت میں حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اچھی طرح سے وضو کر کے دو رکعت پڑھے اور ان پر متوجہ رہے، اب غور کرو کہ ان پر متوجہ رہنے کے کیا معنی؟ اس کے یہ معنی ہیں کہ نماز ہی کی طرف متوجہ رہو یہی ذکر الذکر ہوا، پس بادشاہ کی شان میں اگر قصیدہ کہو تو اگر

---

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن حمران، مولی عثمان عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مرفوعا.

ممدوح کا خیال نہ ہو تو مدح کا تو خیال ہو، اسی طرح اگر یہاں ذکر ہی کی طرف توجہ ہو کہ ہم اپنی رحمت سے اپنی ہی توجہ میں شمار کریں گے۔

(وعظ: روح القیام، صفحہ نمبر: ۱۰۵ تا ۱۰۶، برکات رمضان، جلد نمبر: ۱۶)

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ

کفارات لما بینھن ما اجتنب الکبائر (۱)

اور ما عام ہے تو ترجمہ یہ ہوا کہ سارے گناہوں کا کفارہ تو جب ہی ہے کہ کبائر سے بچے، ورنہ سب کا نہیں، صرف صغائر کا ہوگا، یہ لازم نہیں آتا کہ صغیرہ بھی معاف نہ ہو۔

(وعظ: مضارۃ المعصیۃ، صفحہ نمبر: ۸۷، جلد نمبر: ۱۸ مفاسد گناہ)

حضورِ اقدس ﷺ کا جنت ودوزخ کو زمین پر دیکھنا مستبعد نہیں

ایک حدیث میں جو نسائی میں موجود ہے کہ حضور ﷺ نے صلوۃِ کسوف کے موقع پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت و دوزخ کو دیکھا۔ (۲) بعض لوگ اس پر ہنستے ہیں کہ جنت و دوزخ تو آسمان وزمین سے بھی بڑی بتلائی جاتی ہیں، حضور ﷺ نے ان کو دیوار پر کیوں کر دیکھ لیا اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا؟ مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین ایجاد کرا کے اس استبعاد کو دور کر دیا۔ فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھوٹا کر کے دکھایا جا سکتا ہے اور خوردبین سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا

(۱) أخرجه مسلم فی صحیحه والإمام احمد فی مسنده، رقم الحدیث: ۸۷۱۶، ولفظه: عن أبی هریرة، قال: قال رسول الله ﷺ: " الصلوات الخمس، والجمعة الی الجمعة، کفارات لما بینهن ما اجتنبت الکبائر"، واللفظ لأحمد.

(۲) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما، لفظهما: عن أنس رضی الله عنه، قال قال النبی ﷺ: ما رأیت فی الخیر والشر کالیوم قط، انه صورت لی الجنة والنار، حتی رأیتهما دون الحائط، و کذا فی النسائی الا أنه لم یوجد فیه لفظ "مثلت لی".

کر دکھائی جاسکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنت و دوزخ کا فوٹو مسجد کی دیوار پر اتار دیا ہو اور حضور ﷺ کی شعاع میں خوردبین کی قوت رکھ دی ہو، جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ ﷺ کو اصلی حالت پر نظر آگئیں ہوں اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے: مثلت لی الجنۃ والنار۔ یہ نہیں فرمایا کہ جنت و دوزخ زمین میں آئی تھیں، بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ میرے لئے ممثل ہوگئیں۔

(وعظ: تفصیل الدین، صفحہ نمبر: ۳۸، جلد نمبر: ۳ دین و دنیا)

بچوں کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دینا عین حکمت ہے

حضور ﷺ نے فرمایا:

مروا صبيانكم بالصلوٰة اذا بلغوا سبع سنين، واذا بلغوا عشرا فاضربوهم[1]

(یعنی جب بچے سات برس کو پہنچیں تو ان کو نماز کا حکم کرو اور جب دس برس کے ہوں اور نہ پڑھیں تو مارو)

حالانکہ بچے اس عمر میں مکلف نہیں ہوتے، کیونکہ بالغ نہیں ہوتے، بارہ برس سے کم میں لڑکا بالغ نہیں ہوتا، البتہ لڑکی تو کم میں بالغ ہو جاتی ہے۔ تو یہ کیا بات ہے کہ ابھی بالغ بھی نہیں ہوئے اور حکم ہو رہا ہے نماز کا اور وہ بھی مار کر۔ میں کہتا ہوں واللہ! اس میں نہایت سہولت کی رعایت ہے، کیونکہ بالغ ہونے پر اگر دفعۃ ہجوم ہو جاتا سب احکام کا تو اک دم سے بیچارہ مصیبت میں پڑ جاتا، تعجب نہیں تھا کہ ایک دم سے ہجوم ہونے پر خودکشی کر لیتا یا شریعت کو چھوڑ بیٹھتا۔

---

(۱) أخرجه الامام أبو داود رحمه الله فی سننه عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، رقم الحديث: ۴۹۵ باب متى يؤمر الغلام بالصلوة)، وكذا أخرجه الامام احمد فی مسنده، رقم الحديث ۶۷۵۶

اگر شریعت بھی نہ ہوتی تو میں پوچھتا ہوں کہ عقلاء اس بارے میں کیا تجویز کرتے؟ یہی تجویز کرتے کہ پہلے سے اس کو تھوڑا تھوڑا احکام کا عادی بنایا جاوے، مگر شریعت نے تم کو یہ دولت مفت دی ہے، اسی لیے تو قدر نہیں ہوئی۔ شریعت کی خوبی مصیبت پڑنے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شریعت کی قدر تھی، ہمیں قدر نہیں، کیونکہ بلا مشقت کے ہمیں سب کچھ مل گیا ہے، چنانچہ اسی حدیث کو دیکھ لیجئے۔

(وعظ: شعبان فی شعبان، صفحہ نمبر: ۴۷۴ تا ۴۷۵، جلد نمبر: ۷ حقیقت عبادت)

فرائض سے کیفیت میں بڑھوتری ہوتی ہے اور نوافل سے کمیت میں

فرائض کی نسبت حدیثِ قدسی میں آیا ہے کی میرا بندہ جس قدر فرائض ادا کرنے سے مقرب بنتا ہے، اس قدر کسی شے سے نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ فرض بہت بڑی شے ہے اور نوافل کی نسبت ارشاد ہے:

لایزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتٰی أحبه، فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها[۱]

(یعنی میرا بندہ ہمیشہ نوافل سے قرب تلاش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں اور جب میں اس کو چاہتا ہوں تو میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے سنتا ہے اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے دیکھتا ہے اور میں ہی اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے پکڑتا ہے)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ میاں (توبہ توبہ) اس کا کان، ہاتھ ہوجاتے ہیں،

(۱) أخرجه الامام البخاری فی صحیحه عن أبی هریرة رضی الله عنه، رقم الحدیث: ۶۵۰۲ باب التواضع

مطلب یہ ہے کہ ان اعضاء سے اس سے کوئی کام حق تعالیٰ کے خلافِ مرضی نہیں ہوتا۔اب غور کیجیے کہ فرائض کی خاصیت یہ بیان فرمائی کہ جس قدر قرب ان سے ہوتا ہے، اس قدر کسی عبادت سے نہیں ہوتا، اور نوافل کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا: شیئاشیئا حاصل ہوتا رہتا ہے، جیسے لا یزال یتقرب اس پر دال ہے تو حاصل اس کا یہ ہے کہ زیادتِ قرب دو قسم کی ہے: ایک کیفیہ اور ایک کمیہ کا، اور وہ دونوں مطلوب ہیں تو فرائض سے تو کیف کے اعتبار سے قرب بڑھتا ہے اور نوافل سے کمیہ بڑھتا ہے۔اس کی ایسی مثال ہے، جیسے کوئی شخص سرکاری عہدہ دار ہے تو نفسِ قرب تو اس کو اپنا منصبی کام انجام دینے سے حاصل ہوگا۔اور اگر یہ کام نہ کرے تو قرب ہی نہ ہوگا تو یہ منصبی کام بہت بڑی شے ہے کہ اس نے اس کو سرکاری آدمی بنادیا، اب وہ چاہتا ہے کہ میرا قرب حاکم سے اور بھی زیادہ بڑھ جائے تو وہ حاکم کے خوش کرنے کے لیے ایسا کام اختیار کرے گا کہ وہ کام اس کے ذمہ نہیں ہے، مثلا اس کے لیے ڈالی لے جائے اور تحائف بھیجے نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ حاکم کا بہت مقرب ہو جائے گا، حتیٰ کہ حاکم کے پاس بیٹھنا بھی نصیب ہو جائے گا۔اللہ تعالیٰ اس تشبیہ سے پاک ہیں، لیکن بطور تمثیل کے سمجھنا چاہیے کہ عاشق کو نفسِ قرب کیفی سے تسلی نہیں ہے، وہ اپنی استعداد کے اعتبار سے کمال قرب کا طالب ہوتا ہے، مثلا محبوب نے اپنے پاس خوش ہو کر بٹھلالیا تو وہ کھسکتا ہوا اور آگے مل کر بیٹھنا چاہتا ہے، اس لیے حق تعالیٰ نے دو عبادتیں مقرر فرمائی ہیں: فرض اور نفل۔قرب کیفی کا تعلق تو فرض کے ساتھ ہے، فرض کے بعد کوئی درجہ کیف کا باقی نہیں رہتا، اور کمیہ کا تعلق نفل سے ہے اور کمیت قرب کے مراتب بے شمار ہیں، جس قدر بھی مراتب طے کرے گا، ختم نہ ہوں گے اور نہ سیری ہوگی، برابر دل چاہتا رہے گا کہ اور بڑھے اور بڑھے۔

فرائض اور قرب

خلاصہ یہ ہے کہ فرض کے ادا کرنے سے جو قرب حاصل ہوتا ہے، عاشق کو اس مقدار سے تسلی نہیں ہوتی۔ اگر نوافل نہ ہوتے تو وہ یقیناً تڑپ تڑپ کر مر جاتا، اس لیے کہ دل کا تقاضا ہوتا ہے کہ مراتب قرب کے طے کرے اور طریقہ کوئی تھا نہیں، اس لیے شدتِ شوق میں اگر جان دیدیتا تو تعجب نہ تھا اور اب نوافل حق تعالیٰ نے مقرر فرمادیئے ہیں کہ ان سے درجات طے ہوتے ہیں، چنانچہ اذکار اشغال اور روزے و نماز نفل سب اسی واسطے ہیں بندہ قرب کے درجات طے کرے، اس لیے فرائض محدود ہیں اور نوافل غیر محدود۔

(وعظ: التہذیب، صفحہ نمبر: ۴۵۴ تا ۴۵۵، جلد نمبر: ۱۰، فضائل صوم وصلوٰۃ)

ہر عمل یہ سمجھ کر کرو کہ شاید اس کے بعد نوبت نہیں آئے گی

جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

إذا قمت فی صلوٰتك فصل صلوٰۃ مودع [1]

(یعنی جب نماز کے لیے کھڑے ہو تو اس طرح نماز پڑھو، جیسے دنیا کو رخصت کر رہے ہو)

یعنی یہ سمجھ کر یہ عمر کا جز واخیر ہے۔ اس حدیث میں اگرچہ صلوٰۃ کا ذکر فرمایا گیا ہے، لیکن علت پر نظر کر کے تمام اعمال کو عام ہے، نماز کا ذکر بوجہ اس کی فضلیت کے فرمایا ہے، ورنہ ہر عمل میں اس مضمون کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ غفلت

---

(۱) أخرجه الامام ابن ماجه فی سننه عن أبی ایوب الانصاری رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث ۱۴۱۷، باب الحکمة، وکذا أخرجه الإمام أحمد فی مسنده، رقم الحدیث ۲۳۴۹۸، والمعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث ۳۹۸۷.

بدون اس کے زائل نہیں ہوسکتی اور ازالۂ غفلت کی ہر عمل میں ضرورت ہے، پس آدمی جو بھی عمل کرے، یہ سمجھ کر کرے کہ شاید اس کے بعد عمل کی نوبت نہ آوے۔

(وعظ: دواء العیوب، صفحہ نمبر: ۲۸۲، جلد نمبر: ۲۴ موت وحیات)

لیلۃ التعریس میں نماز فجر قضا ہونے پر شبہ اور اس کا الہامی جواب

آپ ﷺ نے فرمایا:

تنام عینی، ولا ینام قلبی [1]

کہ نیند میں میری آنکھیں ہی سوتی ہیں، قلب نہیں سوتا۔

لیلۃ التعریس میں نمازِ فجر قضا ہونے کا سبب

اس لیے سونے سے حضور ﷺ کا وضو نہ ٹوٹتا تھا، اس پر شاید لیلۃ التعریس کے قصہ سے کسی کو شبہ ہوگا، جب آپ ﷺ کا دل نہیں سوتا تھا تو پھر اس واقعہ میں آپ ﷺ کی نمازِ فجر کیوں قضا ہوئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ روشنی صبح کا دیکھنا آنکھ کا فعل ہے، قلب کا فعل نہیں، مبصرات کا ادراک قلب کو بواسطہ بصر ہی کے ہوسکتا ہے اور اس وقت آپ ﷺ کی آنکھیں سو رہی تھیں، اس لیے صبح کا ادراک نہ ہوسکا۔

اس پر پھر یہ اشکال ہوتا ہے کہ وقت کا اندازہ کرنا تو قلب کا فعل ہے، پھر حضور ﷺ نے وقت کا اندازہ کیوں نہ کرلیا؟ یہ اشکال اور اس کا جواب میں نے کہیں منقول تو نہیں دیکھا، یہ ابھی میرے قلب پر وارد ہوا ہے اور جواب بھی حق تعالیٰ نے ساتھ ساتھ قلب میں ڈال دیا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ قلب سے وقت کا

---

(۱) أخرجه الإمام البخاري رحمه الله في صحيحه عن أم المؤمنين عائشة رضي الله عنها، رقم الحديث: ٣٥٦٩ باب كان النبي ﷺ تنام عينه ولا ينام قلبه

اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے، جبکہ قلب کسی فکرِ اہم میں مشغول نہ ہو اور حضور ﷺ کا قلب اس وقت مشاہدہ جمالِ الٰہی میں مشغول تھا اور کامل یکسوئی کے ساتھ ادھر متوجہ تھا، کیونکہ آپ ﷺ آنکھیں بند کیے ہوئے تھے اور آنکھیں بند کر کے قلب کو پوری یکسوئی ہوتی ہے، جیسا کہ مشاہدہ ہے، اس لیے وقت کا اندازہ بھی نہ ہو سکا، دوسرا جواب بہت ہی سہل یہ ہے کہ نومِ عین سے مراد نعاس ہے اور نعاس میں بھی اندازہ پر قدرت نہیں ہوتی۔

(وعظ: التثبیت بمراقبۃ الممیت، صفحہ نمبر: ۴۱۷، جلد نمبر: ۲۲، ذکر و فکر)

قلیل عمل پر عظیم فضیلت و اجر

حضور ﷺ فرماتے ہیں:

من بنی لله مسجدا و لو کمفحص قطاة بنی الله له بیتا فی الجنة[1]

(یعنی اگر کوئی قطاۃ پرندہ کے آشیانہ کے برابر بھی مسجد بنائے تو اس کے لیے جنت میں گھر بنے گا)

تو دیکھیے کتنے قلیل عمل پر کتنی عظیم فضیلت فرمائی۔ بعض لوگ جن کو شبہات نکالنے کی عادت ہے، شاید یہ کہیں کہ یہ حضور ﷺ کا کلام نہیں، کیونکہ اتنی چھوٹی مسجد ہی نہیں ہوگی تو اگر چہ اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ تمام اہلِ زبان میں مبالغہ کلام کا حسن سمجھا جاتا ہے، مگر ہم حدیث کا دوسرا مطلب بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی نے مسجد میں مثلاً چار آنے دیئے جس سے عمارت میں اس کے حصہ میں گھونسلہ کے

---

(۱) ابن ماجه فی سننه، باب من بنی لله مسجداً، رقم الحدیث ۷۳۸ و کذا أخرجه ابن خزیمه و ابن حبان فی صحیحیهما و أحمد و أبو داود الطیالسی فی مسندیهما.

برابر جگہ آئی تو اس کو بھی جنت میں پورا گھر ملے گا، اگرچہ اس نے پوری مسجد نہیں بنوائی، تو اگر کسی نے خدا کی راہ میں ایک پیسہ بھی دیا، تب بھی نجات کے لیے ویسا ہی کافی ہے، جیسا کہ ہزار دو ہزار، بلکہ غرباء کے دو چار پیسے امراء کے ہزاروں سے بڑھ جاتے ہیں۔

(وعظ: حقوق السراء والضراء، صفحہ نمبر: ۳۸۹، جلد نمبر: ۴ حقوق وفرائض)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ محبوب عمل وہ ہے جس پر دوام کامل ہو

حدیث میں ہے:

احب الاعمال الی اللہ ادومها (۱)

(کہ حق تعالیٰ کی طرف سے سب اعمال میں زیادہ محبوب وہ ہیں جن پر دوامِ کامل ہو)

اس میں لفظ احب عاشق کی نظر میں دوام کی ضرورت کو بتلا رہا ہے، کیونکہ جب ایک چیز حق تعالیٰ کو محبوب ہے تو عاشق کو ان کے سامنے محبوب ہی چیزیں پیش کرنا لفظ احب سے دوام کی عدم ضرورت پر ہی استدلال کرے گا جس میں محبت و عشق نہ ہو، ورنہ عاشق تو یہ سن کر کہ محبوب فلاں چیز سے خوش ہوتا ہے، اس پر جان نثار کردے گا اور جب تک محبوب ہی منع نہ کرے، اس وقت تک اس کو اپنے اوپر لازم کرلے گا۔

میں پوچھتا ہوں کہ آخر عبادت اور عمل سے مقصود کیا ہے؟ ظاہر ہے رضائے حق مطلوب ہے تو عامل کو ضروری ہے کہ عمل اس طرح کرے اور اس میں وہ طریق اختیار کرلے جس سے محبوب خوش ہوتا ہے اور حدیث سے معلوم ہوچکا کہ حق تعالیٰ دوام

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما، عن عائشة رضي الله عنها مرفوعا.

سے خوش ہوتے ہیں تو دوام کا اہتمام ضروری ہے اور دوسری حدیث میں تو اس کی تصریح ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں:

یا عبد الله! لا تکن مثل فلان ، کان یقوم اللیل فترک قیام اللیل (۱)

اے عبداللہ بن عمر! تم فلاں شخص کی طرح نہ ہوجانا جو رات کو اٹھا کرتا تھا، پھر قیام لیل ترک کردیا۔

اس میں حضور ﷺ نے ایک معمول مستحب کے ترک پر صراحۃ کراہت کا اظہار فرمایا ہے، پس ثابت ہوا کہ مستحب کو معمول بنا کر بلا عذر ترک کردینا ایک گونہ مکروہ ہے، تو دوام ضروری ہے۔

(وعظ: ماعلیہ البصر، صفحہ نمبر: ۱۴۵ تا ۱۴۶، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر و شکر)

حضور اقدس ﷺ کی بددعا اور اس کا مطلب

رغم انف رجل ذکرت عندہ فلم یصل علی، رغم أنف رجل أدرک رمضان فلم یغفر له، رغم أنف رجل أدرک والدیه أو أحدہما الکبر عندہ فلم یدخل الجنة۔ (أو کما قال) (۲)

ترجمہ: تشریح آگے خود وعظ میں ہے۔

اس میں حضور ﷺ نے تین شخصوں پر بددعا کی ہے کہ ان کی ناک رگڑ

(۱) أخرجه الامام البخاری فی صحیحه عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی الله عنه مرفوعا، رقم الحدیث: ۱۱۵۲ باب من ترک قیام اللیل لمن کان یقومه

(۲) أخرجه الترمذی فی سننه عن أبی هریرة رضی الله عنه مرفوعاً، رقم الحدیث ۳۵۴۵۔ مسند احمد رقم الحدیث ۷۴۵۱

جائے، یہ ذلیل ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ ایسے ہی شخص پر بددعا کر سکتے ہیں جس کا جرم بہت سنگین ہو اور ان تین شخصوں کا جرم اس لیے سنگین ہے کہ انہوں نے نہایت سہل اور آسان کام میں کوتاہی کی ہے۔

اس پر شاید کوئی کہے کہ حضور ﷺ کی بددعا سے تو ہم کو بے فکری ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے حق تعالیٰ سے دعا کر رکھی ہے کہ جس کو میں بددعا دوں، اس کے حق میں میری بددعا کو قربت وصلوٰۃ زکوٰۃ و رحمت بنا دیا جائے تو آپ ﷺ کی بددعا ہی دعا ہو کر لگتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ گو آپ ﷺ کی بددعا ہو کر لگے، مگر اس سے بے فکری نہایت بھدا پن ہے، کیونکہ یقیناً بددعا غصہ میں ہوا کرتی ہے، تو جس کو آپ ﷺ نے بددعا دی ہے، وہ حضور ﷺ کے غضب وغصہ کا محل ضرور ہے تو کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ حضور ﷺ آپ سے ناراض ہوں؟ یقیناً کوئی عاشق اپنے محبوب کی ناراضگی اور غصہ کا تحمل نہیں کر سکتا، گو اس کا انجام سزا بھی نہ ہو، بلکہ عشق کا مقتضی تو یہ ہے کہ سزا گوارا ہوتی ہے، مگر محبوب کا غصہ اور ناراض ہونا گوارا نہیں ہوتا۔

دوسرے آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ جس حدیث میں آپ ﷺ نے حق تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ میری بددعا کو دعا بنا دیا جائے، وہ کون سی بددعا کے متعلق ہے؟ وہ خاص ہے اس بددعا کے ساتھ جو بطور بشریت کے آپ ﷺ کی زبان سے نکل جائے، ہر بددعا کے لیے یہ درخواست عام نہیں اور اس کا قرینہ خود اس حدیث کے الفاظ میں موجود ہے، چنانچہ آپ ﷺ فرماتے ہیں:

اللھم انما أنا بشر أغضب کما یغضبون، فایما عبد أذیته أو

شتمته أو لعنته، فاجعلها له زکوٰۃ ورحمۃ و قربۃ تقربه بها الیك۔ (۱)

اے اللہ! میں بشر ہی ہوں، غصہ ہوتا ہوں، جیسے بندہ غصہ کرتے ہیں، پس جس بندہ کو میں تکلیف پہنچاؤں یا اس کو برا کہوں یا اس پر لعنت کروں تو اس کو زکوٰۃ اور رحمت اور قربت اس کے لیے کر دیجیے، تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ آپ کا قرب حاصل کرے۔

اس میں اول ہی لفظ انما أنا بشر موجود ہے جو اس کا قرینہ ہے کہ اس کے بعد جو مضمون ہے، وہ کسی ایسے امر کے متعلق ہے جس کا منشاء بشریت ہے، ورنہ یہ لفظ فضول ہوگا، پس جو بددعا تشریع سے ناشی ہو، اس کے لیے یہ حکم نہیں ہے کہ وہ بھی زکوٰۃ ورحمت وقربت ہو اور حدیث رغم أنف رجل الخ میں جو بددعا ہے، وہ بشریت کی وجہ سے نہیں، بلکہ بطور تشریع سے ہے، کیونکہ بشریت کے طور پر جو بددعا ہوتی ہے، وہ کسی معین شخص یا معین جماعت پر ہوا کرتی ہے، جب کہ اس کی طرف سے کوئی امر ناگوار ظاہر ہوا ہو اور اس حدیث میں عام الفاظ کے ساتھ بددعا ہے۔

---

(۱) الشطر الأول: أخرجه الإمام احمد فی مسنده: عن أبی هریرة، عن النبی ﷺ: "انما أنا بشر، أغضب کما یغضب البشر، فأیما رجل آذیته أو جلدته، فاجعلها له زکاة وصلةا"، رقم الحدیث: ۷۳۱۱۔

والشطر الثانی أخرجه أیضاً الإمام أحمد فی مسنده عن أبی سعید الخدری، وعن أبی الزناد، عن الأعرج، عن أبی هریرة، قالا: قال رسول الله ﷺ: اللهم أنی أتخذ عندك عهدا لن تخلفنیه، فانما أنا بشر، فأی المؤمنین آذیته، أو شتمته، أو لعنته، أو جلدته، فاجعلها له زکاة وصلاة وقربة تقربه بها إلی یوم القیامة، رقم الحدیث: ۹۸۰۲۔

نیز اس کے سبب درود سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت آپ ﷺ نے یہ بددعا کی ہے، اس وقت کسی کی طرف سے کوئی امر ناگوار پیش نہ آیا تھا، بلکہ قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ خطبہ پڑھنے کے لیے منبر پر جارہے تھے، جب آپ ﷺ نے ایک درجہ پر قدم رکھا، فرمایا آمین، پھر دوسرے درجہ پر پیر رکھ کر فرمایا آمین، پھر تیسرے درجہ پر تشریف فرما ہو کر فرمایا آمین، صحابہ رضی اللہ عنہم کو حیرت ہوئی کہ آپ ﷺ یہ آمین آمین تین مرتبہ کس بات پر فرمارہے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تھے، جب میں نے منبر کے ایک درجہ پر پیر رکھا تو انہوں نے کہا:

رغم أنف رجل ذكرت عنده فلم يصل عليك

یعنی اس شخص کی ناک رگڑ جائے اور وہ ذلیل وخوار ہوجائے جس کے سامنے آپ ﷺ کا ذکر آئے اور وہ آپ ﷺ پر درود نہ بھیجے۔

میں نے کہا آمین، دوسرے درجہ پر میں نے پیر رکھا تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا:

رغم أنف رجل أدرك رمضان ولم يغفر له.

یعنی وہ شخص بھی ذلیل وخوار ہوجائے جس نے رمضان کو پایا اور سارا رمضان گزر گیا اور اس نے اپنی مغفرت نہ کرائی۔

میں نے کہا آمین، تیسرے درجہ پر میں پہنچا تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا:

رغم أنف رجل أدرك والديه أو أحدهما الكبر عنده فلم يدخل الجنة.

وہ شخص بھی ذلیل ہوجائے جس کے والدین یا ان میں سے ایک بوڑھا ہوگیا ہو اور وہ اس کی خدمت کر کے جنت میں داخل نہ ہوا۔

میں نے کہا آمین۔ تو یہ بددعا وہ ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے تھے اور حضور ﷺ نے اس پر آمین فرمائی، اس میں یہ احتمال بالکل نہیں ہوسکتا کہ بشریت کے طور پر آپ ﷺ نے بددعا کی ہوگی۔ پس یہ معمولی بددعا نہیں، اس سے بہت ڈرنا چاہیے۔

(وعظ: عصم الصنوف، صفحہ: ۳۷۹ تا ۳۸۱، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

سنن میں امتیاز کرنا کہ شارع کے نزدیک مقصود کون سا ہے اور غیر مقصود کون سا؟ یہ مجتہد کا کام ہے

شریعت میں دو قسم کی چیزیں ہیں: ایک تو وہ چیزیں ہیں جو مقصود ہیں اور ایک وہ ہیں جو مقصود نہیں ہیں، زائد ہیں، مگر محمود ہیں، لیکن یہاں مجتہد کی ضرورت ہوگی کہ وہ تمیز کرے کہ کون مقصود ہے اور کون مقصود نہیں، یہ ہر شخص کا کام نہیں، اس کی ایسی مثال ہے کہ طبیب نے ایک مریض کو اجازت دی کہ شلجم کھاؤ، اس نے مع پتوں کے پکا کر کھائے اور اس کو نفع ہوا، اب اس کا فیصلہ کرنا کہ قتلوں سے نفع ہوا یا پتوں سے یا دونوں کے مجموعہ سے؟ یہ طبیب کا کام ہے، یہاں دو چیزیں ہیں، ایک قتلے اور ایک پتے، ممکن ہے کہ مقصود قتلے ہوں اور مریض پتوں کو مقصود سمجھ لے یا مقصود پتے ہوں اور مریض قتلوں کو مقصود سمجھ لے، اس لیے اس میں فیصلہ کرنا مریض کا کام نہیں، بلکہ یہ کام طبیب کا ہے۔

اسی طرح سنن میں امتیاز کرنا کہ شارع کے نزدیک مقصود کون ہے اور غیر مقصود کون ہے، یہ کام مجتہدین کا ہے، ہر شخص کا کام نہیں اور کبھی اجتہاد میں اختلاف بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ حضور ﷺ سے نماز میں رفع یدین ثابت ہے اور عدم رفع بھی ثابت ہے، اب یہاں مجتہدین کا اختلاف ہوا، ایک مجتہد سمجھے کہ رفع مقصود ہے اور ترک رفع جو فرمایا تو بیان جواز کے لیے، مقصود نہیں اور ایک مجتہد عدم رفع کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نماز میں سکون چاہیے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔ (۱)

کہ حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے فرمایا کہ یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم نماز میں ہاتھ اٹھاتے ہو، (یعنی سلام کے وقت) نماز میں سکون اختیار کرو، پس مقصود عدم رفع ہے اور رفع بیان جواز کے لیے فرمایا، اب جنہوں نے رفع کو مقصود سمجھا ہے تو وہ اس میں یوں کہتے ہیں کہ یہ رفع جس سے منع فرمایا، یہ وہ نہیں ہے جو رکوع میں جانے اور اس سے اٹھنے کے وقت کیا جاتا ہے، بلکہ یہ وہ رفع ہے جو کہ سلام پھیرتے وقت کیا جاتا تھا، جیسا کہ بعض حدیثوں میں اس کی تصریح ہے۔ (۲)

کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جب نماز کا سلام پھیرتے تو ہاتھ اٹھا کر کہتے کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ، یہ ممانعت حضور ﷺ اس پر فرمائی، ہم اس بارہ میں یوں کہتے ہیں کہ مانا اس

---

(۱) أخرجه الطحاوی فی شرح معانی الآثارعن جابر بن سمرة أمرفوعا.رقم الحديث: ۲٦۳۲،(باب الاشارة فی الصلاة)،ولفظه: عن جابر بن سمرة , قال: دخل رسول الله ﷺ المسجد فرأى قوما يصلون وقد رفعوا أيديهم. فقال: مالی أراكم ترفعون أيديكم كأنها أذناب خيل شمس،اسكنوا فی الصلاة.

(۲) مسند الشافعی (۱/ ٤٤)، (باب استقبال القبلة فی الصلاة) ولفظه: أخبرنا سفيان، عن مسعر، عن ابن القبطی، عن جابر بن سمرة قال: أنا مع رسول الله ﷺ، فاذا سلم، قال أحدنا بيده عن يمينه وعن شماله: السلام عليكم، السلام عليكم، وأشار بيده عن يمينه وعن شماله، فقال النبی ﷺ: "ما بالكم تومئون بأيديكم كأنها أذناب خيل شمس، أولا يكفی أحدكم، أو: انما يكفی أحدكم، أن يضع يده على فخذه ثم يسلم عن يمينه وعن شماله: السلام عليكم ورحمة الله".

سے یہی رفع مراد ہے، مگر اس اسے ایک بات تو ضرور نکلی کہ اصل مطلوب نماز میں سکون ہے اور رفع اس کے خلاف ہے، پس مواقع مختلف فیہا میں بھی رفع مقصود نہ ہوگا، کیونکہ وہاں نماز کی حالت اصلی، یعنی سکون کے خلاف ہے اور عدم رفع چونکہ سکون کے موافق ہے اور اس لیے وہ مقصود ہوگا۔

اسی طرح اور جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے، اسی وجہ سے ہوا کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور ایک نے دوسری چیز کو۔

مثلاً آمین کہنا، ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود آمین پکار کر کہنا ہے اور اخفاء جو ہوا ہے تو وہ بیانِ جواز کے لیے اور ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود اخفاء ہے، کیونکہ یہ دعا ہے اور دعا میں اخفاء مقصود ہے، اگر پکار کر کبھی کہہ دیا ہے تو وہ اس لیے تاکہ معلوم ہوجائے کہ آپ ﷺ آمین بھی کہا کرتے ہیں، اگر کبھی پکار کر نہ کہتے تو خبر نہ ہوتی کہ آمین بھی آپ ﷺ کہا کرتے ہیں، جیسے کبھی کبھی حضور ﷺ نے اسی حکمت کے لیے سری نماز میں ایک آیت پکار کر پڑھ دی ہے تعلیم کی غرض سے۔

ایک مجتہد کی رائے یہ ہے اور ایک کی وہ رائے، یہ اختلاف کاہے سے ہوا؟ اسی وجہ سے ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور دوسرے نے دوسری چیز کو، اگر اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہی کا خاتمہ ہوجائے، بس یہ راز ہے اختلافِ مجتہدین کا، اسی بنا پر تمام افعال میں اختلاف ہوا ہے۔

(وعظ: احکام المال، صفحہ: ۸۷ تا ۸۸ جلد نمبر: ۸ حقیقت مال وجاہ)
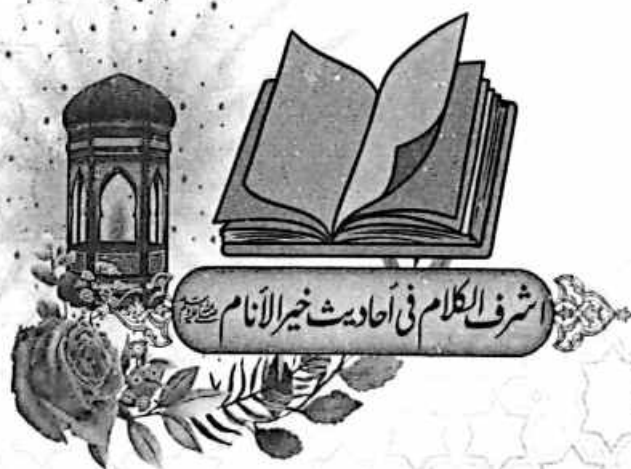
کتاب الجنائز
اشرف الکلام فی أحادیث خیر الأنام ﷺ
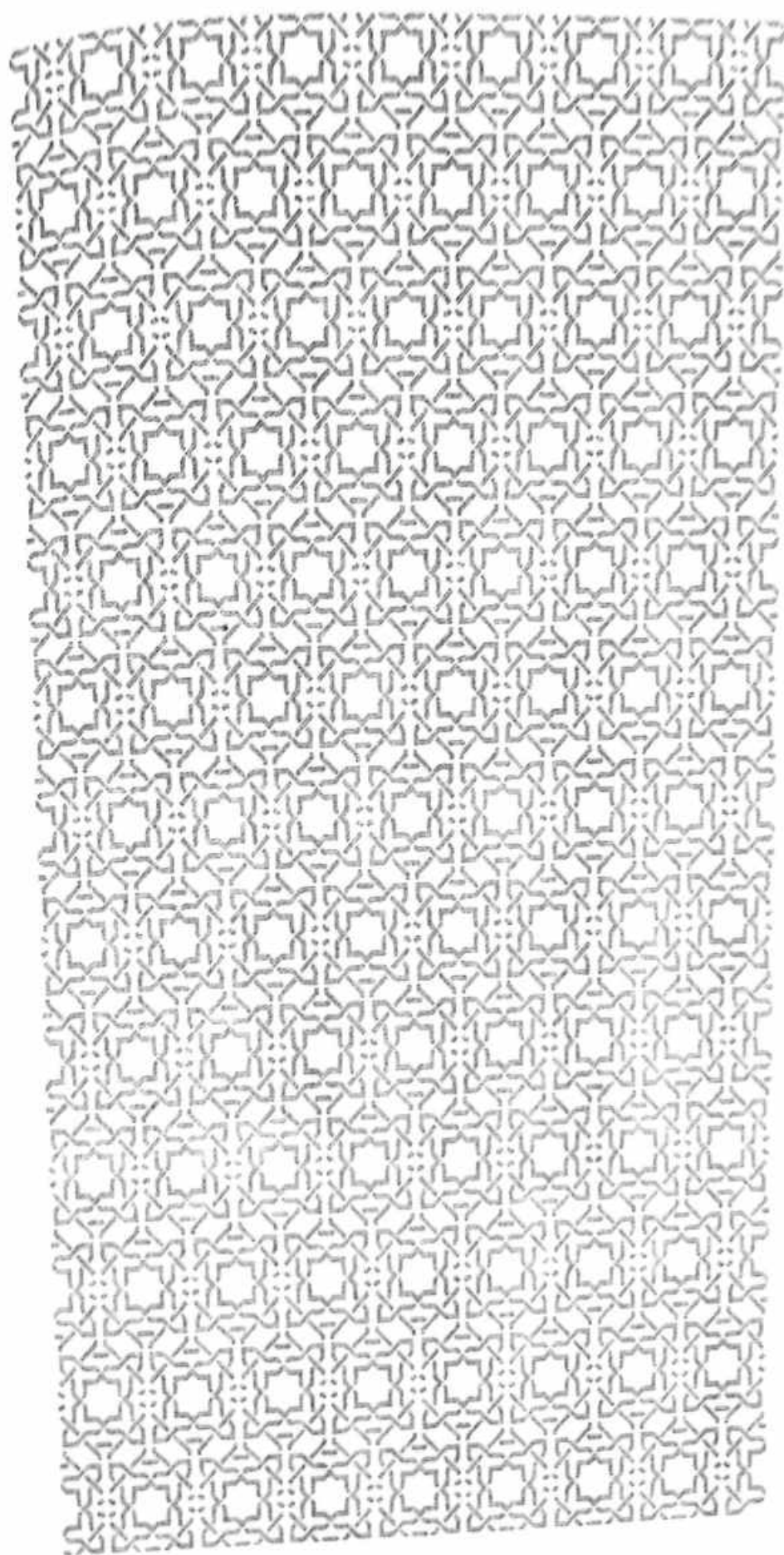
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الجنائز

غزوہ بدر میں حضور ﷺ نے ناز میں حق تعالیٰ کی شان میں ایک جملہ فرمایا

جنگ بدر میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے غلبہ کے لیے بہت دیر تک دعا کی، آخیر میں یہ بھی فرمایا:

اللھم إن تھلك ھذہ العصابة، لم تعبد بعد الیوم [1]

اے اللہ! اگر یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو دنیا میں کوئی آپ کا نام نہ لے گا، بھلا اگر کوئی اللہ کا نام نہ لیتا تو خدا کا اس میں کیا نقصان تھا؟ پس ظاہر میں یہ جملہ بہت سخت معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ سنا رہے ہیں کہ آپ کو کوئی نہ پوچھے گا، اس کی تاویل قریب بجز اس کے کچھ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر اس وقت خاص حالت کا غلبہ تھا، اس لیے ناز میں یہ جملہ فرما دیا۔

حضور ﷺ کا عبداللہ بن ابی منافق کی نمازِ جنازہ پڑھنے کی وجہ

دوسرا واقعہ اسی غلبہ حال کا عبداللہ بن ابی منافق کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا ہے [2]،

(۱) أخرجه الامام مسلم رحمه الله فی صحیحه عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث:۱۷۶۳ باب الامداد بالملائكة فی غزوة بدر، واباحة الغنائم

(۲) متفق علیه، أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما.

یہ شخص بڑا سخت منافق تھا، مگر اس کے بیٹے مسلمان تھے، انہوں نے حضور ﷺ کو اپنے باپ کے مرنے کی اطلاع دی اور دعا کی درخواست کی، چونکہ اس وقت تک منافقین کی نمازِ جنازہ سے صراحۃً ممانعت نازل نہ ہوئی تھی، اس لیے حضور ﷺ نے وعدہ فرمالیا کہ میں دعا کروں گا اور نماز بھی پڑھوں گا، چنانچہ آپ ﷺ نماز پڑھنے کو تیار ہو گئے، اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو نماز سے روکنا چاہا اور اس کے کلمات اور واقعات شمار کرنا شروع کئے کہ یارسول اللہ! یہ تو منافق تھا، اس نے فلاں دن یوں کہا تھا، فلاں وقت یوں کہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے لیے استغفار ودعا سے منع فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (١)

(اے رسول اکرم ﷺ! آپ ان منافقین کے لیے دعائے مغفرت کریں یا نہ کریں (اثر کے اعتبار سے یکساں ہے) حتٰی کہ آپ اگر ان کے لیے ستر مرتبہ بھی دعائے مغفرت کریں تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا)

حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ خواہ استغفار کروں یا نہ کروں اور اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ستر دفعہ سے زیادہ استغفار کرنے پر اس کی مغفرت ہو جائے گی تو میں ستر سے زیادہ استغفار کروں گا، غرض آپ ﷺ نے نماز پڑھادی، نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ آیت نازل ہوئی:

وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾ (٢)

---

(١) التوبة: ٨٠

(٢) التوبة: ٨٤

(ان منافقین میں سے جب بھی کوئی مرجائے تو آپ ان کے لیے دعا نہ کریں اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہوں، بیشک ان لوگوں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا انکار (کفر) کیا اور گناہگار ہو کر مرے)

جس میں آئندہ کے لیے صاف طور سے منافقین کے جنازہ کی نماز سے اور ان کی قبر پر جانے سے منع کر دیا گیا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ معلوم ہوا کہ آیت میری رائے کے موافق نازل ہوگئی تو ان پر بے انتہا خجلت کا غلبہ ہوا کہ یہ کیا ہوا کہ میری رائے کے موافق وحی نازل ہوئی، اب ان کو حضور ﷺ کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی تھی، سبحان اللہ! یہ ہے محبت اور ادب۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضور ﷺ کی رائے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے افضل ہوگئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے بھی حضور ﷺ ہی کی رائے تھی، وہ بھی حضور ﷺ ہی کا فیض تھا، کیونکہ کفار اور منافقین پر غیظ اور ان سے نفرت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ ہی کی برکت سے نصیب ہوئی، ورنہ آپ کی صحبت سے پہلے تو وہ خود ہی خالی تھے اور قتل رسول ﷺ کا منصوبہ باندھ کر آئے تھے، حضور پر ایمان لانے کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو کفار و منافقین سے نفرت اور غیظ عطا فرمایا، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ صرف عمر ہی تھے اور حضور ﷺ رسول بھی تھے اور عمر بھی تھے، بلکہ یوں کہوں کہ آپ ﷺ آدم بھی تھے، نوح بھی تھے، ابراہیم بھی تھے، موسیٰ بھی تھے، عیسیٰ بھی تھے۔

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپ ﷺ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن، دمِ عیسیٰ اور یدِ بیضا رکھتے ہیں جو

اوصاف و کمالات دیگر جملہ انبیاء علیہم السلام میں ہیں، وہ تنہا آپ ﷺ میں ہیں۔ حضور ﷺ میں تمام شانیں جمع تھیں، غیظ و غضب علی الکفار بھی آپ کے اندر تھا اور رحمت و رافت بھی اعلیٰ درجہ کی آپ میں تھی۔

غلبۂ رحمت

مگر آپ ﷺ میں غلبۂ رحمت ہی تو تھا، اس لیے جب تک کوئی بہانہ بھی رحمت کا ملتا تھا، آپ ﷺ رحمت ہی کا برتاؤ کرتے تھے، جب رحمت کا کوئی بہانہ، نہ ہوتا اس وقت غضب فرماتے (عبداللہ بن ابی گو منافق تھا، مگر کھلم کھلا کافر نہ تھا اور منافقوں کے احکام کفار معلنین کے احکام سے جدا تھے، ان کے ساتھ احکام حیات میں وہی برتاؤ ہوتا جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور موت کے احکام ہنوز نازل نہ ہوئے تھے، اس لیے بوجہ غلبۂ رحمت کے آپ ﷺ نے احکام حیات پر قیاس کرکے اس کے ساتھ اموات مسلمین جیسا برتاؤ کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوجہ غلبہ غیظ و شدت کے احکام حیات ضرورت و مصلحت پر مبنی سمجھ کر احکام ممات میں منافقین کو کفار معلنین پر قیاس کیا اور یہ بھی حضور ﷺ ہی کا فیض تھا اور یہ قیاس بھی آپ ﷺ سے مخفی نہ تھا، مگر حضور ﷺ نے غلبۂ رحمت کی وجہ سے پہلے قیاس کو ترجیح دی، کیونکہ جب تک آپ ﷺ کو موقعہ ملتا تھا، آپ ﷺ رحمت ہی کے پہلو کو اختیار فرماتے تھے اور حضور ﷺ کی یہ شان ہم مسلمانوں کے لیے بہت کچھ موجب تسلی ہے، کیونکہ:

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

دوستوں کو کب محروم کریں گے، جبکہ آپ ﷺ کی دشمنوں پر بھی نظرِ عنایت ہے۔

اور

چہ غم دیوار امت کہ باشد چوں تو پشتیبان
چہ باک از موج بحر آنرا کہ دارد نوح کشتیاں

امتیوں کو کیا غم، جب کہ آپ ﷺ جیسا ان کا معاون و مددگار ہے،
سمندر کے طوفان سے اس کو کیا غم جس کا کشتی بان حضرت نوح علیہ السلام
ہے۔

اب اس مقام پر میں ایک سوال علماء ظاہر سے کرتا ہوں، وہ یہ کہ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں، سے حضور نے تخییر کس طرح سمجھی؟ یہ تردید تو تسویہ کے لیے ہے کہ ان کے واسطے استغفار کرنا اور نہ کرنا برابر ہے، ان کو دعا استغفار سے کوئی نفع نہ ہوگا، چنانچہ اہل عربیت پر یہ بات مخفی نہیں، اسی طرح اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں، میں عدد کا ذکر تحدید کے لیے تھوڑا ہی ہے، اگر ستر مرتبہ استغفار کرو گے تو مغفرت نہ ہوگی، اس سے زیادہ کرو تو ہو جائے گی، بلکہ یہاں عدد کا ذکر ایسا ہے، جیسا محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ سو دفعہ بھی کہے گا جب بھی نہ مانوں گا، ہزار دفعہ کہے گا جب بھی کچھ نہ ہوگا، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہزار دفعہ سے زیادہ کہا جائے تو مان لیں گے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ بات ہرگز نہ مانی جائے اور عدد کا ذکر صرف بیانِ کثرت کے لیے ہوتا ہے، نہ تحدید کے لیے، پھر حضور ﷺ نے خُيِّرْتُ فَاخْتَرْتُ وَسَأَزِيْدُ عَلَى سَبْعِيْنَ مجھے اختیار دیا گیا اور میں ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کروں گا، کیسے فرمایا؟ علماء ظاہر اس کا شافی جواب نہیں دے سکتے اور جو لوگ محض ترجمہ قرآن پڑھ کر اجتہاد کے مدعی ہیں تو وہ تو کیا ہی جواب دیں گے؟ لیجئے! اب میں علماء باطن کا جواب عرض کرتا ہوں،

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حالت رحمت کے غلبہ کی وجہ سے اس وقت حضور ﷺ نے معانی کی طرف التفات نہیں فرمایا، بلکہ محض نفس الفاظ سے تمسک فرمانے لگے اور نفس الفاظ میں تخییر وحصر کی گنجائش ضرور ہے، گومحاورہ کے اعتبار سے گنجائش نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ غلبۂ حال کاملین پر بھی کبھی ہوجاتا ہے۔

(وعظ: الرابطہ، صفحہ نمبر: ۸۵ تا ۸۸، حقیقت تصوف وتقویٰ جلد نمبر: ۱۱)

حضور ﷺ کا منافق کو اپنا کرتہ پہنانے اور لعاب مبارک منہ ڈالنے کی وجہ

حضور ﷺ نے اس منافق کو اپنا کرتہ کیوں پہنایا اور اس کے منہ میں لعاب دہن مبارک کیوں ڈالا؟

شراح حدیث نے تو یہ لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے اس کے بیٹے کی خاطر سے جو مومن مخلص صحابی تھے، یہ سب کچھ کیا [1] (تاکہ ان کو معلوم ہوجائے کہ حضور ﷺ کی طرف سے اس کی نجات کی سعی میں کوئی کوتاہی نہیں رہی۔ آپ ﷺ نے دعا بھی کردی، نماز بھی پڑھ دی، اپنے تبرکات بھی عطا فرمادیئے، اب بھی اگر اس کی مغفرت نہ ہو تو یہ خود اسی کا قصور ہے) اور بعض نے کہا ہے کہ اس منافق نے جنگ بدر کے موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ (عم رسول ﷺ) کو ایک کرتہ پہنایا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی مکافات میں مرنے کے بعد اسے کرتہ پہنادیا (بلکہ مع شے زائد)۔

یہ سب توجیہات شراح نے کی ہیں، مگر ان باتوں سے ہم کو شفا نہیں ہوئی، ہمیں

(۱) عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری: ۶/۷۵ دار الفکر بیروت۔

تو اپنے استاد علیہ الرحمۃ کی بات پسند آئی کہ حضور ﷺ نے اس منافق کے ساتھ یہ معاملہ اس لیے فرمایا، تا کہ امت کو یہ ضروری مسئلہ بتلا دیں کہ اگر کسی میں ایمان نہ ہو تو پھر چاہے اس کے پاس لاکھ تبرکات ہوں اور چاہے رسول ﷺ جیسا شخص اس کے جنازہ کی نماز بھی پڑھ دے اور رسول ہی کی قمیص اس کا کفن ہو جائے اور حضور ﷺ کا لعاب مبارک اس کے منہ میں پڑ جائے جب بھی نجات نہیں ہو سکتی، اس لیے تنہا ان تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے، چنانچہ عبداللہ بن ابی کے پاس اصل سرمایہ ایمان کا نہ تھا، اس کے بارہ میں کہا گیا۔

(وعظ: تفصیل الدین، صفحہ نمبر: ۶۷، جلد نمبر: ۳، دین دنیا)

صحابی رضی اللہ عنہ کے قول ”آج ہمارے پاس اتنا مال ہے کہ سوائے مٹی کے اور کہیں اس کی جگہ نہیں“ کا مطلب

ایک صحابی کا انتقال ہونے لگا تو وہ رو رہے تھے، لوگوں نے ان کو تسلی دی کہ ما شاء اللہ! تم نے حضور ﷺ کے ساتھ فلاں فلاں غزوات میں شرکت کی اور خدا کے راستے میں اسلام کی بہت سی خدمتیں کی ہیں، ان شاء اللہ تم کو حق تعالیٰ بخش دیں گے، تو کیوں روتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ میں اس وجہ سے نہیں روتا، بلکہ میں اس واسطے روتا ہوں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں ہماری تنگدستی کی یہ حالت تھی کہ عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہوا تو ان کے کفن کے لیے صرف ایک چھوٹا سا کمبل تھا، جس کو سر کی طرف کھینچتے تو پیر کھل جاتے اور پیر کی طرف کھینچتے تو سر کھل جاتا تھا، حضور ﷺ نے حکم دیا کہ کمبل کو سر کی طرف کھینچ دیا جائے اور پیروں پر گھاس ڈال دی جاوے اور آج ہمارے پاس اتنا مال ہے کہ سوائے مٹی کے اور کہیں اس کی جگہ

نہیں۔ (۱)

اس کے دو مطلب بیان کیے گئے ہیں:

ایک یہ کہ سوائے زمین میں دفن کرنے کے اور کہیں اس کی جگہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ بجز عمارتوں میں خرچ کرنے کے اور کسی کام میں یہ روپیہ نہیں آتا تو وہ حضرات ایسے تھے کہ زیادہ مال جمع ہونے سے روتے تھے، اس کی ان کو خوشی نہ تھی۔

صاحبو! یہ وہ امراء تھے جن کی وجہ سے حضرات صوفیہ میں اختلاف ہوا ہے کہ صبر افضل ہے یا شکر افضل ہے؟

تو صوفیہ کرام کے اس قول میں ایسے شاکر مراد ہیں جیسے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھے نہ کہ ہم جیسے حرام خور جو خدا کی نعمتیں کھا کھا کر معاصی پر اور زیادہ دلیر ہو رہے ہیں۔ اگر صوفیہ کرام ہمارے زمانے کے امراء کو دیکھ لیتے تو وہ یہی فرماتے کہ صابر افضل ہے شاکر سے۔ (الا ماشاء اللہ)

پس آج کل کے امراء کو دین میں نیچا دیکھا دینا کچھ بھی مشکل نہیں، پھر تعجب ہے کہ ہم کو اس بات پر غیرت نہ آئی کہ ہم دنیا میں تو امراء سے کم رہے، دین میں بھی ان

---

(۱) أخرجه الشيخان فی صحيحيهما ولفظه: عن قيس بن أبی حازم، قال: دخلنا على خباب، نعوده، وقد اكتوى سبع كيات، فقال: إن أصحابنا الذين سلفوا مضوا ولم تنقصهم الدنيا، وإنا أصبنا ما لا نجد له موضعا إلا التراب. وكذا فی الصحيحين عن خباب بن الأرت رضي الله عنه، قال: هاجرنا مع رسول الله ﷺ نبتغی وجه الله، فوجب أجرنا على الله، ومنا من مضى، أو ذهب، لم يأكل من أجره شيئا، كان منهم مصعب بن عمير، قتل يوم أحد، لم يترك إلا نمرة، كنا اذا غطينا بها رأسه خرجت رجلاه، واذا غطى بها رجلاه خرج رأسه، فقال لنا النبی ﷺ: غطوا بها رأسه، واجعلوا على رجله الاذخر، و قال: ألقوا على رجله من الاذخر ومنا من قد ينعت له ثمرته فهو يهدبها.

ے بڑھے ہوئے نہ رہیں، بالخصوص اہلِ علم کو تو یہ غیرت ضرور ہونی چاہیے، پس ان کو لازم ہے کہ جس طرح اہلِ دنیا کسی وقت ترقی دنیا سے نہیں تھکتے، وہ بھی ترقی دین سے نہ جھکیں اور دین میں کمال حاصل کرتے رہیں۔

(وعظ: الکمال فی الدین، صفحہ نمبر: ۱۵۳، جلد نمبر: ۳ دین دنیا)

"قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ" ہونے کا مطلب

ایک حدیث میں آتا ہے:

روضۃ من ریاض الجنۃ او حفرۃ من حفر النار (۱)

کہ قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے، حالانکہ دخولِ جنت یا دخولِ نار تو قیامت کے بعد ہوگا، عالم برزخ میں دخولِ جنت و نار نہ ہوگا۔

اس کا ایک جواب تو علماء نے دیا ہے وہ یہ کہ برزخ میں جو مسلمانوں کی راحت اور کفار کو عذاب ہوگا، حضور ﷺ نے اس کو نعیم جنت اور عذاب جہنم سے تشبیہ دی ہے اور مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو برزخ میں ایسی راحت ہوگی کہ گویا وہ جنت کے باغ میں ہیں اور کفار کو ایسی تکلیف ہوگی کہ گویا کہ وہ جہنم کے گڑھے میں ہیں۔ اور صوفیاء نے کہا ہے کہ جنت و جہنم دو ہیں: ایک حقیقی اور ایک مثالی، اگر اس قول کو مان لیا جائے تو پھر اس حدیث میں تاویل نہ کرنا پڑے گی۔

صوفیہ کہتے ہیں کہ قبر میں مومن کے لیے جس جنت کی طرف کھڑکی کھولی جائے گی، وہ جنت مثالیہ ہے، اسی طرح کافر کے لیے جہنم کی طرف کھڑکی کھلے گی، وہ بھی مثالی جہنم ہے، پھر قیامت کے بعد حقیقی جنت و جہنم میں دخول ہوگا اور یہ اشکال نہ کیا

---

(۱) أخرجه الترمذی فی سننه عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث ۲۴۶۰، أبواب صفة القیامة.

جائے کہ مومن اور کافر کے لیے جنت وجہنم میں داخل ہونے کے بعد تو پھر خروج نہ ہوگا، پھر مسلمان اور کافر اس جنتِ مثالیہ سے قیامت کے دن کیونکر نکلیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عدم خروج وغیرہ یہ احکام جنت وجہنم حقیقیہ کے ہیں، مثالیہ کے یہ احکام نہیں، اس سے خروج ہوسکتا ہے، بلکہ صوفیاء نے تو یہ کہا ہے کہ دنیا میں بھی کفار کو جہنم اور مومنین کو جنت محیط ہے، کیونکہ اعمال سیہ جہنم ہیں اور اعمالِ صالحہ جنت ہیں اور حقیقی جنت ودوزخ کا ثواب وعذاب انہی اعمال کی صورتِ جوہریہ ہے، بس دنیا میں بھی ہر شخص یا جنت میں یا دوزخ میں، مگر حال کے بعد تو یہ احاطہ معلوم ہوسکتا ہے، بدون حال کے اس احاطہ کا ادراک دشوار ہے، بس اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں۔

(وعظ: التثبیت بمراقبۃ المبیت، صفحہ نمبر: ۴۲۶، جلد نمبر: ۲۲ ذکر وفکر)

میری قبر کو عید مت بنانا

حدیث "لا تتخذوا قبری عیدا" [۱] (میری قبر کو عید مت بنانا) موئے مبارک کو عید بنانا حرام ہوگیا۔ یہ حضور ﷺ کی غایت بلاغت ہے کہ آپ ﷺ نے قبر کو ذکر میں اختیار فرمایا جس سے ملبوس وشعر وغیرہ سب کے احکام خود بخود معلوم ہوگئے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم وسلف کا تبرکات کے ساتھ معاملہ

علاوہ ازیں صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلفِ صالحین نے تعیید کو کبھی اختیار نہیں کیا، حالانکہ ان کے پاس ہم سے زیادہ تبرکاتِ نبویہ ﷺ موجود تھے اور ان کو ہم سے زیادہ ثواب کے کاموں میں سبقت تھی، اگر یہ کوئی خیر ہوتی تو سلف میں اس کی کچھ تو اصل ہوتی۔

(وعظ: شکر النعمۃ بذکر الرحمۃ، صفحہ نمبر: ۱۸۹، جلد نمبر: ۱۳ رحمت دو عالم ﷺ)

---

(۱) أخرجه الإمام أبو داود فی سننه عن عائشة رضی اللہ عنہا، رقم الحدیث: ۲۰۴۲ باب زیارة القبور، مسند احمد رقم الحدیث: ۸۸۰۴، مصنف ابن أبی شیبة رقم الحدیث: ۷۵۴۲

جس شئی میں انقطاع کا خوف ہوتا ہے، اس میں لذت نہیں ہوتی

فرمایا:

اکثروا ذکر ھاذم اللذات (۱)

یعنی لذات کی قطع شکستہ کرنے والی شے (موت) کو بہت یاد کیا کرو۔ سبحان اللہ! کیا خوبصورت عنوان ہے۔ حکم فرمایا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ موت کو یاد کیا کرو، بلکہ موت کو ہاذم اللذات سے تعبیر فرمایا، اس میں بڑی گہری بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہ بات یہ ہے کہ آدمی جو گناہ کرتا ہے یا دنیا کے مال وجاہ میں منہمک ہوتا ہے تو مقصود اور غایت سب کی تحصیل لذت ہے اور جب یہ یاد کرے گا کہ یہ سب ایک دن ختم ہو جائے اور اس کا تصور ہوگا تو مزہ ہی نہ آئے گا اور جب مزہ ہی نہ آئے گا تو وہ گناہ بھی چھوٹ جائے گا۔ دنیا میں اس کی بہت مثالیں موجود ہیں، مثلاً کسی بڑے عہدے پر ہے، مثلاً ڈپٹی کلکٹر ہے، لیکن اس پر کوئی مقدمہ بھی قائم ہے جس سے خوف غالب ہے کہ اس عہدہ سے برطرف کر دیا جائے گا، اس کو اس کلکٹر میں خاک بھی لذت نہ ہوگی۔ غرض کلیہ قاعدہ ہے کہ جس شے میں انقطاع کا خوف ہوتا ہے، اس میں لذت نہیں رہتی۔

موت ہر لذت کو ختم کرنے والی ہے

پس حاصل حدیث شریف کا یہ ہوا کہ اگر تم سے گناہ بوجہ لذت کے نہیں چھوٹتے تو ہم علاج بتاتے ہیں کہ تم یہ یاد کر لیا کرو کہ یہ لذت سب ختم ہونے والی ہیں، جب اس کا تصور کامل ہوگا تو گناہ چھوٹ جائیں گے اور موت سے تو تمام لذات کا خاتمہ ہو جاتا ہے، بہت ظاہر ہے۔

(وعظ: ذکر الموت، صفحہ نمبر: ۳۰ جلد نمبر: ۲۴ موت وحیات)

---

(۱) أخرجه الامام الترمذی رحمه الله فی سننه عن أبی هریرة ﷺ مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۳۰۷ باب ماجاء فی ذکر الموت، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۸۲۴

احب لقاء اللہ سے مراد عین موت کے وقت اشتیاق لقاء ہونا ہے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من احب لقاء اللہ، احب اللہ لقاءہ، ومن کرہ لقاء اللہ کرہ اللہ لقاءہ (۱)

کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنا چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا چاہتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی لقاء سے کراہت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کی لقاء سے کراہت فرماتے ہیں۔

اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ کلنا یکرہ الموت (ہم میں ہر شخص موت کو مکروہ سمجھتا ہے) یعنی حق تعالیٰ کی لقاء تو موت کے بعد ہوگی اور موت سے طبعاً ہر شخص کو کراہت ہے تو من احب لقاء اللہ کا مصداق کون ہوگا؟ سب من کرہ لقاء اللہ ہی کے مصداق ہوں گے اور اس کا جواب حضور ﷺ کے سوا کون دے سکتا تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ محبت و کراہت مراد ہے، سو مومن موت کے وقت لقاء اللہ کا مشتاق ہو جاتا ہے، جبکہ اس کو فرشتے بشارتیں سناتے اور تسلی دیتے ہیں اور جنت کی نعمتیں اور راحتیں دکھلاتے ہیں، اس وقت اس کی وہ حالت ہوتی ہے، جیسے ایک پرندہ پنجرہ میں ہو اور اس کو ایک ایسے سبزہ زار رکھ دیا جائے جہاں چار طرف پھول پھلواری اور ہر قسم کے میوہ جات ہوں اور اس طرح کہ ہم جنس پرندے آزادی کے ساتھ اس باغ میں میوے وغیرہ کھاتے پھرتے ہوں اور خوشی سے چہچہاتے ہوں تو اس وقت یہ پرندہ جو پنجرہ میں مقید ہے، پھڑ پھڑاتا ہے اور پنجرے سے نکلنے اور اپنی ہم جنسوں کے ساتھ سبزہ زار میں چلنے پھرنے کا مشتاق ہوتا ہے اور کافر موت کے

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن عائشة رضي الله عنها مرفوعا.

وقت حق تعالیٰ کے پاس جانے سے کراہت کرتا ہے، کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ عذاب کے فرشتے ڈراؤنی صورت میں چاروں طرف کھڑے ہیں، میری روح نکلی اور عذاب دینا شروع کیا، اس وقت اس کی روح جسم سے نکلنا نہیں چاہتی، جیسے پنجرے کے گرد چاروں طرف بلیاں دانت نکالے بیٹھی ہوں تو اس وقت پرندہ پنجرہ سے نکلنا نا چاہے گا، بلکہ کوشش کرے گا کہ پنجرے ہی سے چمٹا رہے، کیونکہ اسی میں خیر ہے، پنجرہ سے باہر قدم رکھا اور بلیوں نے اس کو دبوچا تو یہ کراہت مراد ہے جو عین موت کے وقت ہوتی ہے، باقی طبعی کراہت مراد نہیں ہے، کیونکہ طبعاً ہر ایک کو عزیز ہے۔

(وعظ: خیر الحیات وخیر الممات، صفحہ نمبر: ۱۹۰ تا ۱۹۱، جلد نمبر: ۲۴ موت وحیات)

⑤ مومن سے دفنانے کے بعد جو پوچھا ئے گا "ما تقول فی حق هذا الرجل" کی عاشقانہ کی تشریح

حدیث میں ہے کہ جب مومن دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے پاس فرشتے آکر تین سوال کرتے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہوتا ہے:

ما تقول فی حق هذا الرجل؟

یعنی یہ کون بزرگ ہیں؟

وہ کہتا ہے کہ یہ محمد ﷺ ہیں جو ہمارے پیغمبر ہیں جو ہماری ہدایت کے لیے حق تعالیٰ کے یہاں سے بینات لائے اور آیات لائے، یہ ہے مضمون حدیث کا۔[1]

یہاں یہ سوال کیا گیا ہے کہ ہذا محسوس باشارہ حسیہ کے لیے ہے، وہاں قبر میں حضور ﷺ کہاں ہوں گے جو ہذا سے پوچھا جائے گا؟

---

(۱) أخرجه الترمذی فی السنن عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ مرفوعاً، رقم الحدیث: ۱۰۷۱، ابواب الجنائز، باب ماجاء فی عذاب القبر.

جمہور نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہر مومن کے ذہن میں اس وقت حضور ﷺ حاضر ہوں گے علم ضروری کے طور پر، حق تعالیٰ کی تائید سے اس کی صورت یہ ہوگی کہ مومن کے قلب میں اس وقت علم ضروری کے طور پر یہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کی نسبت پوچھ رہے ہیں، یہ جواب بالکل کافی ہے، لیکن بعض اہلِ لطائف اس طرف بھی گئے ہیں۔ یہ تھا تو احتمال کے درجہ میں، مگر عشاق نے محقق کرلیا ہے شوق میں، اس کا دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا، ہاں تمنا اور شوق کے درجہ میں کیا حرج ہے، اگر اس امید سے متلذذ ہو۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ اس کے اور رسول ﷺ کے درمیان میں جتنے حجاب ہیں، وہ سب اٹھادیئے جائیں گے اور حضور ﷺ جلوہ نما ہوں گے، اب چونکہ یہ شخص مشرف بالزیارت ہے اور پہچانتا ہے کہ یہ آپ ﷺ ہیں، اس لیے فرشتوں کے سوال کا جواب آسانی کے ساتھ دے رہا ہے۔

اور یہ رفع حجاب تو ہے، اس میں بھی دو احتمال ہیں: ایک تو یہ کہ حضور ﷺ اپنی جگہ پر رہیں، یہ اپنی جگہ پر رہے اور درمیان کے حجاب اٹھیں اور یہ کہ حضور ﷺ ہی کرم فرمائیں۔ بعض عشاق شدتِ شوق میں اس طرف چلے گئے کہ حضور ﷺ خود مومن کی قبر میں تشریف لائیں گے۔

بعض عشاق نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر موت کی تمنا اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی زیارت کے شوق میں کرے تو جائز ہے ہی شوقاً الی لقاء رسول اللہ بھی تمنا موت کی جائز ہے، کچھ حرج نہیں۔

استاذی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت زندہ دل تھے، ان پر شوق کی حالت غالب تھی، صاحبِ حال بزرگ تھے، اس حدیث کے متعلق کسی طالب علم نے سوال کیا تھا کہ قبر میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت مشہور ہے، اس کی کیا اصل ہے؟ یہ سن کر مولانا پر حالت طاری ہوگئی اور یہ شعر پڑھا ۔

کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدیں ساں
بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

وہ کشش جو عشق اپنے اندر رکھتا ہے، اس کی خاصیت یہ ہے کہ محبوب اگر جنازہ پر نہ آئے گا تو مزار پر ضرور آئے گا۔

اور فرمایا کہ مقتضی تو اس تعلق کا جو ہم کو جناب رسول مقبول ﷺ کے ساتھ ہے، یہ تھا کہ حضور ﷺ کی عمر اتنی طویل ہوتی کہ آپ ہر امتی کے جنازہ پر خود تشریف لا کر نمازِ جنازہ پڑھتے، مگر خدا کی حکمتیں ہیں آپ ﷺ کی وفات ہی میں مصلحت تھی، خیر! اگر یہ دولت حاصل نہ ہو سکی تو کیا عشق کی خاصیت خالی جا سکتی ہے؟ اگر جنازہ پر نہیں تو مزار ہی پر لا کر کھڑا کر دیا کہ دیکھ لو، یہ وہی محبوب ہیں جن کے شوق اور محبت میں تم نے عمر گنوادی اور اپنے آپ کو فنا کر دیا۔

مگر یہ سب مشتاقین کے نکات ہیں اور ممکن ہے کہ ان کے گمان کے موافق ان کے اس شوق کو پورا بھی کر دیا جائے، کیا عجب ہے کہ گو یہ زیارتِ عام نہ ہو، لیکن حق تعالیٰ بعض خاص خاص عشاق کی کششِ شوق میں یہ خاصیت محقق کر دیں اور اس کی اس امید کو انا عند ظن عبدی بی کی بناء پر پورا کر دیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔

(وعظ: رمضان فی رمضان، صفحہ نمبر: ۲۲۳، ۲۲۴، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

زلزلہ آئے تو فرار مستحب، جبکہ طاعون سے فرار ممنوع

زلزلہ آئے تو فرار مستحب ہے، ہاں طاعون سے فرار ممنوع ہے، وہاں قرار ضروری ہے۔ (۱)

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن اسامة رضي الله عنه مرفوعاً، ولفظه: قال قال رسول الله ﷺ ان هذا الطاعون رجز سلط على من كان قبلكم وعلى بنى اسرائيل فاذا كان بأرض فلا تخرجوا منها فرارا منه وإذا كان بأرض فلا تدخلوها.

وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ طاعون سے تو مرجانا غالب نہیں ہے، کیوں کہ وہ لگتا نہیں، چنانچہ جب طاعون ہوتا ہے، اگر اموات اور احیاء کا شمار کیا جائے تو عدد احیاء کا زیادہ ہوگا۔ اگر کسی جگہ دس ہزار آدمی ہوں گے تو چھ ہزار اموات کی تعداد نہ ہوگی۔ اگر وہ لگتا ہوتا تو واقعی اس کا عکس ہوتا۔ پس چونکہ زلزلہ کا سبب ہلاک ہونا غالب ہے، اس لیے اس کا تو اعتبار کیا گیا اور طاعون کا سبب ہلاک ہونا غالب نہیں ہے، بلکہ محتمل باحتمال مغلوب ہے، اس لیے اس کا سبب اعتبار نہیں کیا گیا۔

(وعظ: الصیام، صفحہ نمبر: ۱۱۴، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

اہلِ بلد کو تین دن کے بعد تعزیت سے ممانعت کی وجہ

مشاہدہ ہے کہ جس شخص پر اسبابِ غم وارد نہ ہوئے ہوں، اس کو دوسروں کی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوتا، نہ اس کو دوسروں کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے۔ یہ راز ہے طبعی غم میں تین دن مقرر فرمائی ہے، اس لیے تین دن کے بعد اہل بلد کو تعزیت جائز نہیں،[1] کیونکہ غم تو ہلکا ہوگیا، اب تعزیت کرنا نشتر مار کر مرہم پٹی کرنا ہے۔

جیسے ایک سرحدی چوروں کے ہاتھ سے زخمی ہوگیا تھا، کسی ہندوستانی نے اس کی بڑی خدمت کی، یہاں تک کہ اچھا ہوگیا تو سرحدی نے کہا اگر تم کبھی ہمارے وطن آؤ تو ہم تمہارے احسان کا بدلہ دیں گے۔

اتفاق سے یہ سرحد کی طرف گیا اور اس کا مہمان ہوا اور منتظر رہا کہ دیکھیے میرے احسان کا کیا بدلہ دیتا ہے، اس کی بیوی کو معلوم ہوا کہ یہ مہمان وہ ہندوستانی ہے جس نے شوہر کی خدمت کی تھی تو اس نے اس سے کہا کہ اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ،

---

(۱) وفی تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، باب الجنائز، فصل تعزیة أهل المیت (۲۴۶/۱)
قوله لا بأس بتعزیة أهل للیت، وأکثرهم علی أن یعزی إلی ثلاثة أیام، ثم یترك لئلا یتجدد الحزن.

کیونکہ میرا خاوند تمہارا تذکرہ کیا کرتا تھا کہ ایک ہندوستانی نے ہمارے ساتھ بڑا احسان کیا ہے کہ ہم زخمی تھے، ہم کو اچھا کیا، اگر وہ یہاں آجائے تو ہم بھی اس کو زخمی کر کے خدمت اور مرہم پٹی سے اچھا کریں گے، وہ یہ سن کر بھاگا اور احسان کے بدلہ سے باز آیا۔

تو جو لوگ تین دن کے بعد تعزیت کرتے ہیں، وہ بھی تندرست دل کو زخمی کر کے مرہم پٹی کرتے ہیں، البتہ باہر سے آنے والوں کو تین دن کے بعد بھی تعزیت جائز ہے، کیونکہ صاحب واقعہ اس کی تعزیت کو ضرورت پر محمول کرے گا، اس لیے اس کے دل پر اس سے نشتر نہیں لگے گا، بلکہ اگر یہ غریب تعزیت نہ کرے، بلکہ خاموش بیٹھا رہے تو صاحب واقعہ کو اس کی شکایت پیدا ہوگی کہ میرے غم کے متعلق ایک لفظ بھی ہمدردی کا نہ کہا، پھر اس کے آنے سے کیا فائدہ ہوا۔ نیز آنے والے کا دل بھی سکوت سے منقبض ہوتا ہے، اس کا دل تقاضا کرتا ہے کہ دو چار کلمے تسلی کے ضرور کہے۔ شریعت مقدسہ کی پاکیزگی ملاحظہ کیجئے کہ باہر سے آنے والوں کو تین دن کے بعد بھی تعزیت کی اجازت دے دی، تا کہ طرفین کے جذبات کی رعایت ہو جائے، مگر اہل بلد کے لیے میعاد مقرر رہے۔

مجھے ایک جنٹلمین کی حکایت بہت پسند آئی جو عقل و انتظام میں مشہور تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوا تو انہوں نے اس کے لیے بھی ایک مسل مقرر کر کے جو شخص زبانی یا تحریری تعزیت کرتا، اس کا قول اور اپنا جواب مسل میں درج کر دیتے اور اس کے لیے ایک میعاد مقرر کر دی تھی، جب وہ میعاد گزر گئی، مسل داخل دفتر کر دی گئی، اس کے بعد جو شخص آتا اور کچھ کہنا چاہتا، آپ اس سے پہلے ہی پوچھ لیتے کہ کیا آپ میرے والد ماجد صاحب کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ اگر وہ کہتا جی ہاں! تو کہہ دیتے کہ تعزیت کی مسل داخل دفتر ہو چکی ہے، کیونکہ میعاد گزر گئی، اس لیے اب اس کے متعلق میں سننا نہیں چاہتا، دوسری بات کیجیے۔

میرا اس حکایت سے یہ مقصود نہیں کہ آپ بھی مسل مقرر کیا کریں، یہ تو ان کا غلو

فی الانتظام تھا، بلکہ مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ تعزیت میعاد کے قابل ضرور ہے، عقل بھی اس کے لیے تعیین میعاد کی مقتضی ہے، چنانچہ شریعت نے اس کے لیے تین دن مقرر کیے ہیں۔ تین کے عدد میں ایک خاص خاصیت ہے، اس لیے مسح خفین اور سفر و ہجران مسلم (کسی مسلمان سے تعلق ختم کرنا) وغیرہ کے لیے تین دن کی حد مقرر ہے اور تجربہ بھی ہے کہ تین دن کے بعد غم ہلکا ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ شاید اس پر یہ کہیں کہ جس کے دل کو لگتی ہے، اس کو تو پھر بھی خیال آتا ہے، میں اس کو مانتا ہوں، مگر یہ ضرور کہوں گا کہ تین دن کے بعد وہ حال نہ ہوگا جو ابتداء میں تھا۔

(وعظ: الصبر والصلوٰۃ، صفحہ نمبر: ۱۹۳ تا ۱۹۴، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر و شکر)

جس کے تین بچے مر گئے ہوں، وہ اس کے لیے جہنم کی آگ سے آڑ بن جائیں گے، والدین کے لیے اولاد کی شفاعت کی ضرورت کا مطلب

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے تین بچے مر گئے ہوں، وہ اس کے لیے جہنم کی آگ سے آڑ بن جائیں گے، کسی نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! کسی کے دو بچے مرے ہوں، فرمایا وہ بھی۔ پھر کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! جس کا ایک ہی بچہ مرا ہو، فرمایا وہ بھی۔ پھر کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! جس کا ایک بھی بچہ نہ مرا ہو تو فرمایا:

أنا فرط لأمتي ولن يصابو بمثلي (۱)

کہ میں اپنی امت کا آگے جا کر سامان کرنے والا ہوں اور میری موت

---

(۱) أخرجه الامام الترمذی فی سننه، رقم الحديث: ۱۰۶۲، ولفظه: قال: سمعت جدی أبا أمی سماك بن الوليد الحنفی يحدث، أنه سمع ابن عباس يحدث، أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: من كان له فرطان من أمتی أدخله الله بهما الجنة، فقالت عائشة: فمن كان له فرط من أمتك؟ قال: ومن كان له فرط يا موفقة، قالت: فمن لم يكن له فرط من أمتك؟ قال: فأنا فرط أمتی لن يصابوا بمثلی، و كذا رواه الامام أحمد فی مسنده، رقم الحديث: ۳۰۹۸.

ایسا حادثہ میری امت پر کوئی نہ آئے گا۔

اس لیے ان کے واسطے میری وفات کا صدمہ ہی مغفرت کو بس ہے۔ نفدیک بآبائنا وامہاتنا یارسول اللہ

فلو أن رب الناس بقى محمدا

سعدنا و لكن أمره كان ماضيا

اگر اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کو باقی رکھتے تو یہ ہماری سعادت تھی، مگر خدا کا حکم نافذ تھا، اس لیے وہ اس جہان سے چلے گئے۔

یعنی میں آگے جا کر اپنی امت کے لیے مغفرت کی سعی وسفارش کروں گا۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ جیسے بے اولادوں کے لیے حضور ﷺ کی شفاعت کافی ہے، ایسی ہی اولاد والوں کے لیے بھی کافی تھی، اولاد کی شفاعت کی کیا ضرورت تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کو زیادت تسلی کے لیے اس کی ضرورت تھی دو وجہ سے: ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ تو ادب وخوف کے ساتھ شفاعت فرمائیں گے اور بچہ ضد کے ساتھ شفاعت کرے گا، یہ بچے جس طرح یہاں والدین پر ضد کرتے ہیں، قیامت میں اللہ تعالیٰ پر بھی ضد اور ناز ونخرے کریں گے، چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ بچہ جنت کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو جائے گا، اس سے کہا جائے گا اندر جاؤ، کہے گا نہیں جاتے، پوچھیں گے کیوں؟ کہے گا جب تک ہمارے ماں باپ ہمارے ساتھ نہ ہوں گے، اس وقت تک ہم جنت میں نہیں جا سکتے تو اس سے حق تعالیٰ فرمائیں گے:

أيها الطفل المراغم ربه أدخل أبويك الجنة. (۱)

---

(۱) أخرجه الامام ابن ماجه فى سننه مرفوعا، رقم الحديث:١٦٠٨، (باب ما جاء فيمن أصيب بسقط)، ولفظه: عن أسماء بنت عابس بن ربيع، عن أبيها، عن على رضي الله عنه، قال: قال=

اے اپنے پروردگار سے ضد کرنے والے بچے جا اپنے ماں باپ کو بھی جنت میں لے جا۔

دوسرے عقلاً عدد بڑھنے سے زیادہ قوت ہوتی ہے، گو حضور اکرم ﷺ کو انضمام ضمیمہ کی ضرورت نہیں، آپ تنہا ہی اکفی ہیں، مگر طبعا عدد بڑھنے سے تسلی زیادہ ہوتی ہے۔

نیز حدیث میں آتا ہے کہ جب کسی مسلمان کا بچہ مرتا ہے اور ملائکہ اس کی روح کو لے کر آسمان پر پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے ارشاد فرماتے ہیں:

أخذتم ولد عبدی؟ قالو اللّٰهم نعم ثم يقول هل قبضتم ثمرة فؤاد عبدی؟ قالوا اللهم! نعم، فيقول فماذا قال عبدی؟ قالوا اللهم حمدك و صبر، فيقول ابنو العبدی بيتا فی الجنة و سموه بيت الحمد أو كما قال. (۱)

کیا تم نے میرے بندہ کے بچہ کو لے لیا؟ وہ کہتے ہیں اے اللہ ہاں! پھر فرماتے ہیں کیا تم نے میرے بندہ کے جگر گوشہ کو لے لیا؟ وہ کہتے ہیں اے اللہ ہاں! پھر فرماتے ہیں کہ میرے بندہ نے کیا کہا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں اے اللہ! اس نے آپ کی حمد کی (مراد شکر ہے) اور صبر کیا، اس پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں (کہ گواہ رہو کہ میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا

= رسول الله ﷺ: "ان السقط ليراغم ربه، اذا أدخل أبويه النار، فيقال: أيها السقط المراغم ربه أدخل أبويك الجنة، فيجرهما بسرره، حتى يدخلهما الجنة".

(۱) أخرجه الإمام الترمذی فی سننه مرفوعا، رقم الحديث: ۱۰۲۱، (باب فضل المصيبة اذا احتسب)، ولفظه: عن أبی موسى الأشعری، أن رسول الله ﷺ قال: "اذا مات ولد العبد قال الله لملائكته: قبضتم ولد عبدی، فيقولون: نعم، فيقول: قبضتم ثمر فؤاده، فيقولون: نعم، فيقول: ماذا قال عبدی؟ فيقولون: حمد واسترجع، فيقول الله: ابنوا لعبدی بيتا فی الجنة، وسموه بيت الحمد".

اور) اس کے لیے جنت میں ایک محل تیار کرو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔

یہ تو چھوٹوں کے مرنے پر وعدہ ہے جس سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ بچوں کے مرنے پر نعم البدل عطا فرماتے ہیں، یعنی مغفرت اور جنت کا محل اور بڑوں کے مرنے پر بھی اسی طرح اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔

(وعظ: الجبر بالصبر، صفحہ نمبر: ۲۵۹ تا ۲۶۰، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر و شکر)

حدیث میں ہے کہ جس عورت کے تین بچے مر گئے ہوں، وہ جنت میں داخل ہوگی، صحابی نے سوال کیا یا رسول اللہ! جس کے دو مرے ہوں، فرمایا وہ بھی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ دو کے بعد ابی ابن کعب نے کہا میرا ایک ہی بچہ مرا ہے، فرمایا ایک بھی۔ (۱)

ایک روایت میں بچوں میں لم یبلغو الحنث کی بھی قید آئی ہے۔ (۲)

یعنی جس کے بچے نابالغ مر گئے ہوں، اس کے واسطے جنت ہے۔ اس بلوغ کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ یہاں حقیقی بلوغ مراد ہے، یعنی جو خاص علامات ظاہر ہونے کے بعد ہو اور فقہاء نے جو پندرہ برس کی عمر پر بلوغ کا حکم کیا ہے اور وہ بھی علی الاختلاف۔ یہ بلوغ فی احکام الدنیا کے لیے ایک معیار ہے، حقیقی بلوغ کا معیار نہیں، پس جس طرح شہید کی دو قسمیں ہیں: ایک شہیدِ آخرت، یعنی شہید فی الاحکام الاخرویہ

---

(۱) أخرجه الترمذی فی سننه عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً، ولفظه: قال قال رسول الله ﷺ: من قدم ثلاثة لم يبلغوا الحلم كانوا له حصنا حصيناً من النار. قال أبو ذر: قدمت اثنين قال: واثنين، فقال ابی بن كعب سيد القراء قدمت واحدا، ولكن إنما ذاك عند الصدمة الأولى رقم الحديث: ۱۰۶۱، باب ماجاء فی ثواب من قدم ولده.

(۲) أخرجه الامام البخاری فی صحيحه عن أنس بن مالك أمر فوعا، رقم الحديث: ۱۳۸۱، (باب ما قيل فی أولاد المسلمين)، ولفظه: قال رسول الله ﷺ: ما من الناس مسلم، يموت له ثلاث من الولد لم يبلغوا الحنث، لادخله الله الجنة بفضل رحمته اياهم.

دوسرے شہید فی الاحکام الدنیویہ۔ اسی طرح بلوغ کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک بلوغ حقیقی، یعنی بلوغ فی الاحکام الاخرویہ، وہ تو خاص علامات کے ظہور پر ہوگا۔ دوسرے بلوغ فی الاحکام الدنیویہ، یہ پندرہ برس کی عمر سے ہوجاتا ہے۔ اب اگر کوئی بچہ عمر کے لحاظ پندرہ برس کا ہوگیا، مگر اس میں علامت بلوغ نہ پائی گئی ہوں، یہ سب اجر و فضیلت اس سے متعلق ہوگی۔

(وعظ: آداب المصاب، صفحہ نمبر: ۳۲۳، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر وشکر)

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچے جنت میں بھی بچے ہی رہیں گے اور ان کی خصلتیں بھی بچوں کی سی رہیں گی، وہی ضد کرنا اور اپنی بات پر اڑ جانا، سر ہوجانا، مگر یہ حالت دخول جنت سے پہلے ہوگی، پھر جنت میں پہنچ کر باپ بیٹے سب برابر ایک قد کے ہوجائیں گے۔ حدیث میں آیا ہے یہ بچے اڑ جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم جنت میں نہ جائیں گے، جب تک کہ ہمارے ماں باپ کو ہمارے حوالے نہ کیا، ہم تو ان کو اپنے ساتھ ہی لے کر جنت میں جائیں گے تو حق تعالیٰ فرمائیں گے:

ایھا الطفل المراغم ربه أدخل أبویك (۱)

کہ اے ضدی بچے! اپنے خدا سے دور کرنے والے! جا، اپنے والدین کو بھی جنت میں لے جا! اس وقت یہ خوش خوش جنت میں اپنے ماں باپ کے ساتھ جائیں گے تو یہ بے گناہ بچے اللہ میاں سے بھی آپ ہی بخشش کے لیے ضد کریں گے۔

(وعظ: الأجر النبیل، صفحہ نمبر: ۴۹۴، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر وشکر)

---

(۱) تقدم تخریجه.

باب الصدقة
اشرف الکلام فی أحادیث خیر الأنام ﷺ
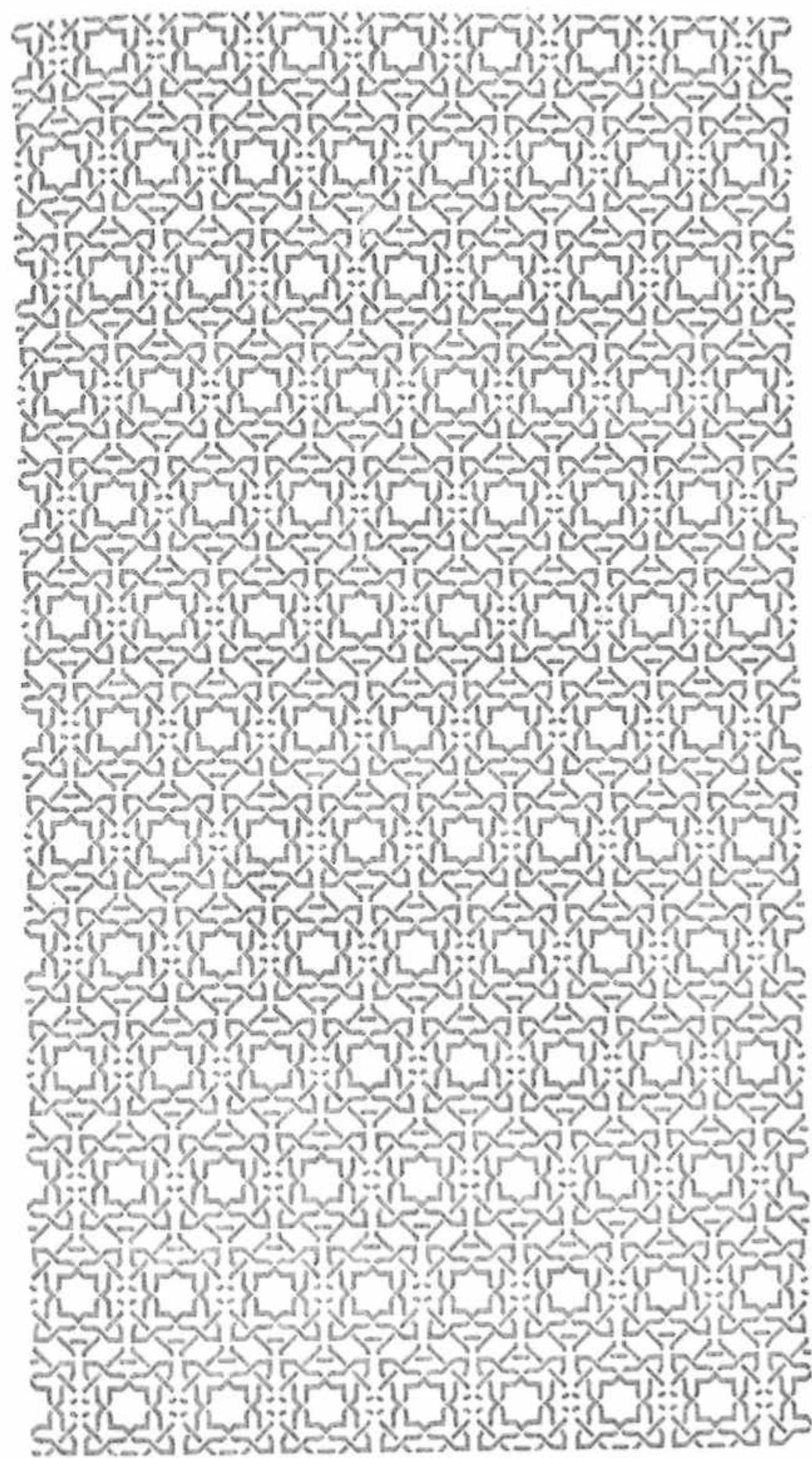
بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

باب الصدقۃ

قرض کا ثواب صدقہ سے زیادہ ہونے کی وجہ اور

''ایک کے عوض اٹھارہ ملیں گے'' کی وجہ

ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا کہ قرض میں ایک کے عوض اٹھارہ ملیں گے، حضور ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ اے جبریل! یہ کیا بات ہے کہ قرضہ کا ثواب صدقہ سے زیادہ؟ کیا اچھا جواب دیا کہ صدقہ تو وہ شخص بھی لیتا ہے جس کو ضرورت نہ ہو اور قرض وہی لیتا ہے جس کی جان پر آبنی ہو تو ایسے شخص کی امداد زیادہ فضیلت ہے۔ (۱)

تو قرضہ کی فضیلت کا راز آپ کو اس حدیث ابن ماجہ سے معلوم ہو گیا ہوگا اور اٹھارہ کے عدد کی تعیین کا راز بھی میں جمعہ کو بیان کر چکا تھا، اب پھر بتلاتا ہوں کہ یہ عدد بظاہر تعجب انگیز ہے کہ نہ دس نہ بیس، برابر صدقہ کے ہوتا تو دس ہونا چاہیے تھا، دوگناہ ہوتا تو بیس کا عدد ہونا چاہیے تھا تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ اصل عدد تو بیس ہوتا ہے،

---

(۱) أخرجه الامام ابن ماجه فی سننه عن أنس بن مالك رضي الله عنه مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۴۳۱ باب القرض، لفظه: قال رسول الله ﷺ: "رأیت لیلة أسری بی علی باب الجنة مکتوبا: الصدقة بعشر أمثالها، والقرض بثمانیة عشر، فقلت: یا جبریل ما بال القرض أفضل من الصدقة؟ قال: لأن السائل یسأل وعنده، والمستقرض لا یستقرض الا من حاجة".

کیونکہ قرض والا بہت ہی حاجت مند ہوتا ہے، ایسے شخص کی امداد صدقہ لینے والے سے مضاعف فضیلت رکھتا ہے، مگر چونکہ وہ روپیہ پھر لوٹ آوے گا، اس لیے دو عدد کہ روپیہ کا مضاعف ہے ثواب سے کم ہو گئے۔

(وعظ: القرض، صفحہ نمبر: ۳۱۶ تا ۳۱۷، تدبیر و توکل جلد نمبر: ۲۱)

دو حدیثوں کے درمیان ظاہر التعارض کا حل

صدقہ کے بارے میں ارشاد ہے:

خیر الصدقة جهد المقل (۱)

بہتر صدقہ تنگ دست کا صدقہ ہے جس میں جمع بین المجاہدتین ہے اور ایک دوسری حدیث میں جو ظاہراً اس کے خلاف آیا ہے کہ خیر الصدقة ما کان عن ظهر غنی (۲) کہ بہتر صدقہ وہ ہے جس کے بعد اپنے پاس غنی باقی رہے۔ ان دونوں میں تطبیق کے لیے بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ اختلاف باعتبار اختلاف اشخاص کے ہے، حدیث اول باعتبار اقویاء کے ہے اور حدیث ثانی باعتبار ضعفاء کے ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ دونوں حدیثوں میں اختلاف ہی نہیں، بلکہ ہر ایک دوسرے کی مفسر ہے اور مطلب یہ ہے کہ جهد المقل اس وقت بہتر ہے جب کہ اس کے بعد دل میں غنا باقی رہے اور جو ایسا نہ ہو تو جهد المقل بہتر نہیں، بلکہ اب وہ صدقہ بہتر ہے جس کے بعد ظاہر میں غنا باقی رہے۔

(وعظ: الجمعین بن النفعین، صفحہ نمبر: ۳۶۶، جلد نمبر: ۲۴ موت و حیات)

(۱) أخرجه الامام أبو داود فی سننه عن عبدالله بن حبشی الخثعمی رضی الله عنه مرفوعا، رقم الحدیث: ۱۴۴۹ باب طول القیام، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۵۲۶

(۲) متفق علیه، أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن حکیم بن حزام رضی الله عنه مرفوعا.

کتاب الصوم
شرف الکلام فی احادیث خیر الانام ﷺ
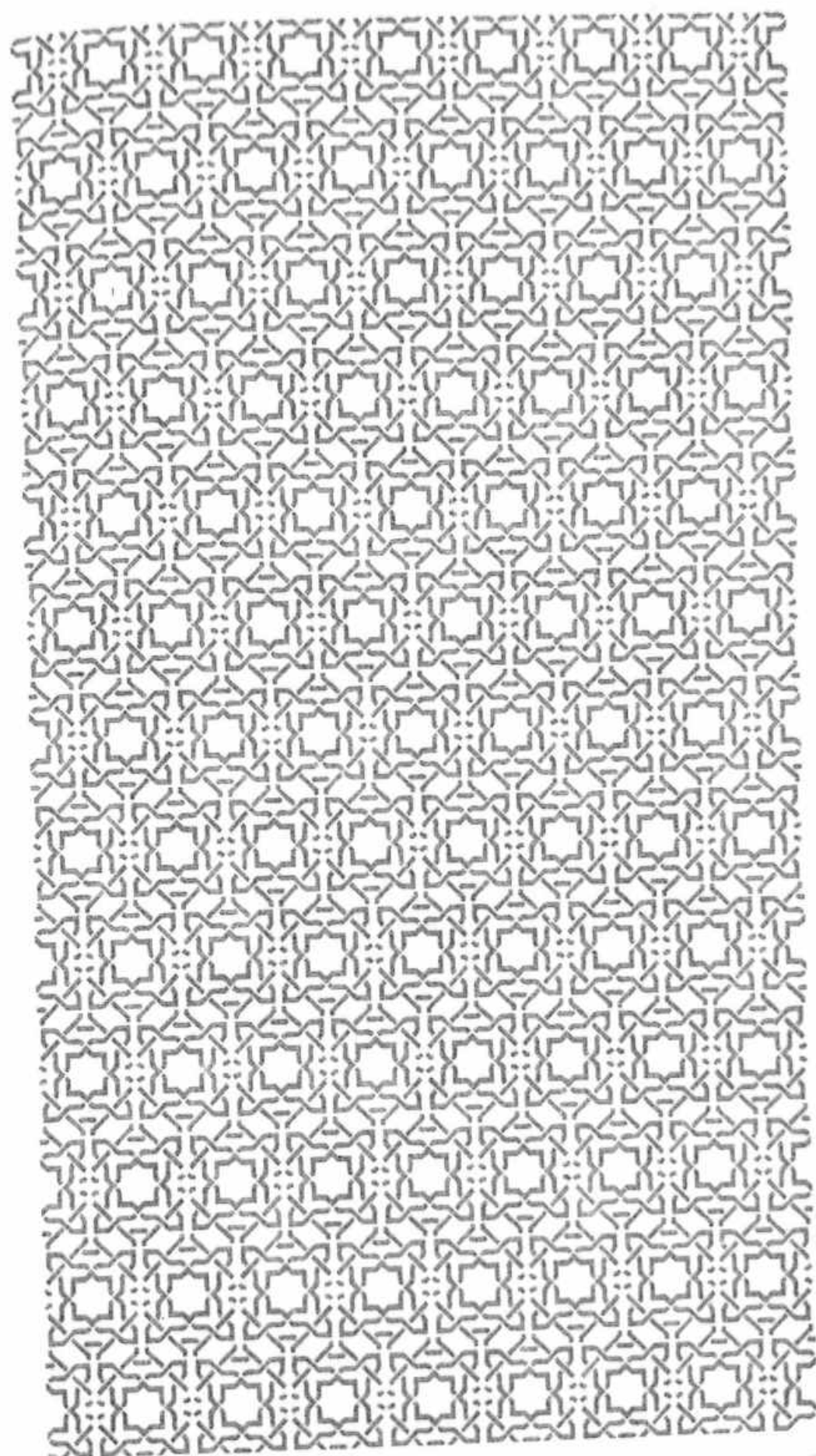
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کتاب الصوم

شہوت کی رگ کو ملنے کے لیے روزوں میں لزوم ضروری ہے

ایک غیر مقلد عالم میرے پاس آئے اور کئی روز تک مجلس میں بیٹھے، ان کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی مجھ سے سوال کرتا تو وہ خود جواب دینے لگتے کہ حدیث میں اس کے متعلق یہ آیا ہے، میں خاموش رہتا۔ ایک دن ایک شخص نے یہ سوال کیا کہ مجھ پر شہوت کا غلبہ ہے، وہ مولوی صاحب جلدی سے بولے کہ روزہ رکھو، حدیث میں اس کا بھی علاج ہے، فان الصوم له وجاء [۱] روزہ اس کی رگ شہوت کو مل دے گا، سائل نے کہا میں نے روزہ بھی رکھا تھا، مگر اس سے شہوت اور زیادہ ہوگئی، اب وہ مولوی صاحب تو خاموش ہوگئے، ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا، میں نے بزرگوں کے طفیل اس کا بھی جواب دیا، میں نے کہا کہ روزہ میں ابتداءً شہوت کا غلبہ ہوتا ہے، کیونکہ اس سے طبیعت میں لطافت پیدا ہوتی ہے اور لطافت سے شہوت بڑھتی ہے، مگر زیادہ روزے رکھنے سے پھر شہوت کم ہوجاتی ہے اور حدیث میں لزومِ صوم کو علاج فرمایا ہے، نہ کہ مطلق صوم کو اور لزوم مقتضی ہے اعتیاد و تکرار کو (کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جیسے زیادہ کثافتِ طبع سے شہوت کم ہوجاتی ہے، اسی طرح زیادہ لطافت سے بھی کم ہوجاتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر روزہ کی کیا ضرورت ہے، بلکہ یہ طریقہ بتلانا چاہیے کہ

---

(۱) متفق علیہ، أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن ابن مسعود ﷺ مرفوعاً.

بہت پیٹ تن کے کھائے، اناپ شناپ کھائے، اس سے بھی شہوت کم ہوجائے گی تو یہ صورت خطرناک ہے، کیونکہ بہت کھانے سے قسم قسم کے امراض پیدا ہوجائیں گے جن سے جان کا خطرہ ہے اور روزہ ان خطرات سے خالی ہے۔

(وعظ: المرابطہ، صفحہ نمبر: ۹۱، حقیقت تصوف وتقویٰ جلد ۱۱)

''جس کا رمضان سلامتی سے گزرا، اس کا پورا سال سلامتی سے گزرے گا'' کا مطلب

حدیث مرفوع روایت کی ہے:

من سلم له الجمعة سلم له ما بينه وبين الجمعة الاخرىٰ ومن سلم له رمضان سلم له السنة كلها.[1]

رہا یہ کہ رمضان میں یہ خاصیت بالکیفیت ہے یا بالخاصہ ہے؟ دونوں کا احتمال ہے، اگر بالخاصہ ہے تو تب تو وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں اور بالکیفیت ہے تو یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ مہینہ بھر کسی عمل سے رکنے میں اس سے اجتناب کی عادت ہوجاتی ہے، اب سال بھر اس سے بچنا سہل ہوجاتا ہے، اسی طرح کسی عمل کے کرنے میں بھی

---

(۱) شعب الإيمان للبيهقي ٢٨٤/٥ (٣٤٣٥-٣٤٣٤) وحلية الأولياء لأبي نعيم ١٤٠/٧ وقال البيهقي: هذا لا يصح عن هشام، وأبو مطيع الحكم بن عبد الله البلخي ضعيف، وإنما يعرف هذا الحديث من حديث عبد العزيز بن أبان أبي خالد القرشي، عن سفيان، وهو أيضاً ضعيف بمرة. وقال العرقي في "تخريج أحاديث ٤٣١/١: وقد رواه بجملته ابن حبان في "الضعفاء" وأبو نعيم في "الحلية" من حديث عائشه. وهو ضعيف، وأصله عند مسلم ٢٠٩/١ (٢٣٣) من حديث أبي هريرة رضي الله عنه بلفظ: أن رسول الله ﷺ كان يقول: "الصلوات الخمس والجمعة إلى الجمعة ورمضان إلى رمضان مكفرات ما بينهن إذا اجتنب الكبائر".

ایسا ہی سمجھو، مگر سہولت کے معنی یہ ہیں کہ اگر اب اس عادت سے کام لو تو سہولت ہوجائے گی، یہ معنی نہیں کہ عادت سے کام لینے کی بھی ضرورت نہ رہے گی، جیسے کسی شخص کی آنکھیں بنائی گئیں اوران میں روشنی آگئی تو آنکھ کے درست ہوجانے کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اس سے کام لے گا، آنکھیں کھولے گا تو نظر آئے گا، اگر کوئی احمق کہے کہ میں تو آنکھ نہ کھولوں گا، کھولنے سے نظر آیا تو فائدہ ہی کیا ہوا، آنکھ بننے کے تو یہ معنی ہیں کہ بدون کھولے بھی نظر آئے تو ایسی تیسی اس احمق کی، پس یہ مطلب نہیں کہ رمضان لاٹھی لے کر تم گناہوں سے روکے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کی ایسی برکت ہے کہ اس میں گناہوں کو اہتمام سے چھوڑ کر بعد میں اس برکت سے کام لینا چاہو تو گناہوں کا چھوڑنا آسان ہوگا، ورنہ پھر یہ عالم ابتلا ہی کیا ہوا؟ اگر جبراً تم سے گناہ چھڑا دیئے جائیں۔

(وعظ: التحصیل والتسہیل مع التکمیل مع التعدیل، صفحہ نمبر: ۱۷۵ تا ۱۷۶، حقیقت تصوف وتقویٰ جلد نمبر: ۱۱)

کسی نیک کام کو رمضان کے لیے مؤخر کرنا مقصود نہیں

هذا شهر المواساة، هذا شهر يزاد فيه رزق المؤمن، من تقرب فيه بخصلة من الخير كان كمن ادى فريضة فيما سواه (۱)

یعنی یہ مہینہ ہمدردی کا ہے، اس مہینہ میں مومن کا رزق زیادہ کیا جاتا ہے، جو اس میں نفل کام کرے اس کو اور دنوں کے فرض کے برابر ثواب ملے گا اور جو اس میں فرض ادا کرے اس کو اور دنوں کے ستر فرضوں کے برابر ثواب ملے گا۔ اس میں کس قدر ترغیب وتحریض ہے صدقہ، خیرات اور اعمالِ صالحہ کی کہ رمضان میں رکعاتِ نافلہ کا

---

(۱) أخرجه ابن خزيمة فى صحيحه عن سلمان الفارسى رضي الله عنه مرفوعا، رقم الحديث: ۱۸۸۷ باب فضائل شهر رمضان ان صح الخبر، شعب الايمان رقم الحديث: ۳۳۳۶

ثواب فرض نمازوں کے برابر ملتا ہے اور جو فرض کو اس ماہ میں ادا کرتے ہیں، ان کو ستر فرضوں کا ثواب ملتا ہے۔

تعجیل فی الخیر

مگر اس سے بعض لوگوں نے کیسا الٹا مطلب سمجھا کہ بعض لوگ رمضان سے پہلے بعض نیک کاموں کو روکے رکھتے ہیں، مثلاً کسی کی زکوٰۃ کا سال شعبان میں پورا ہوگیا، اب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، رمضان کے انتظار میں روکے رکھتا ہے، چاہے رمضان میں اس کو توفیق ہی نہ ہو، روپیہ چوری ہی ہوجائے یا رمضان کے انتظار میں محتاج کا قلیہ (ہلاکت) ہوجائے۔ یاد رکھو! شارع علیہ السلام کا اس ترغیب سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رمضان کے انتظار میں نیک کاموں کو روکا جائے، بلکہ شارع کا مقصود تاخیر عن رمضان سے روکنا ہے، اگر رمضان تک کسی کو توفیق نہ ہو تو رمضان میں ہرگز دیر نہ کرے جو کرنا ہو کر ڈالے، تقدیم علی رمضان سے روکنا نہیں، و شتان بینهما (ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے)

(وعظ: تقلیل المنام بصورۃ القیام، صفحہ نمبر: ۶۳ تا ۶۴، برکات رمضان جلد ۱۶)

روزے کا سفر سے تشبیہ دینے کی وجہ

حدیث مرفوع ہے:

سیاحۃ ھذہ الامۃ الصیام[1]

---

(۱) ذکرہ الماوردی فی تفسیرہ: ۱۲۹/۲، وقال: روی أبو ہریرۃ مرفوعا عن النبی ﷺ سیاحۃ أمتی الصوم. وأخرج الطبری فی تفسیرہ: ۵۰۶/۱۴ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت: سیاحۃ ھذہ الأمۃ الصیام . وفی اسنادہ ابراہیم بن یزید الخوزی، =

(اس امت کی سیاحت، یعنی سفر ہجرت روزہ ہے)

حالانکہ سیاحت کے معنی سفر کے ہیں، چنانچہ سائحین کی تفسیر مہاجرین سے وارد ہے، لیکن تشبیہا روزہ سفر ہجرت قرار دیا گیا اور ظاہر ہے کہ وجہ تشبیہ مشقت ومجاہدہ ہے، پس اس سے مجاہدہ کا روح صوم ہونا ظاہر ہوگیا، چنانچہ ابن عیینہ سے منقول ہے:

انما سمی الصائم سائحا لترکه اللذات کلها من المطعم والمشرب والنکاح (۱)

(کھانے پینے اور جماع کی تمام لذتوں کے چھوڑنے کی وجہ سے روزہ دار کا نام سائح رکھا گیا ہے)

اور ایک حدیث مرفوع میں ہے:

سیاحة امتی فی سبیل الله (۲)

(میری امت کی سیاحت اللہ تعالی کے راستے میں جہاد کرنا ہے)

اور ظاہر ہے کہ دو مرفوع حدیثوں میں تطابق ضروری ہے، پس اس سے صوم اور مجاہدہ کا اتحاد اور اظہر ہوگیا اور مجاہدہ کا روح صوم ہونا اور اظہر ہوگیا۔ سیاحت کے متعلق روایات کمالین سے لی لیں۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں اسی روح کی طرف اشارہ ہے۔ (وعظ: روح الصیام، صفحہ نمبر: ۱۳۶، برکات رمضان جلد ۱۶)

= وهو متروك الحديث كما في التقريب: ۹۵.

(۱) تفسير الخازن: ۲ / ۴۱۰ التوبة الاية: ۱۱۱، ۱۱۰ قال سفيان بن عيينة: انما سمى الصائم سائحا لتركه اللذات كلها من المطعم والمشرب والنكاح.

(۲) أخرجه الامام أبو داود في سننه عن أبي أمامة رضي الله عنه، رقم الحديث: ۲۴۸۶ (باب في النهي عن السياحة)، والمعجم الكبير للامام الطبراني رقم الحديث: ۷۷۰۸

افطاری کے وقت ایک ظاہری اور ایک روحانی خوشی ہوتی ہے

للصائم فرحتان: فرحة عند الإفطار، وفرحة عند لقاء الرحمن[1]

(یعنی روزہ دار کو دو فرحتیں ہوتی ہیں: ایک افطار کے وقت، دوسری فرحت لقاء رب کے وقت جو آخرت میں ہوگی)

اور اس حدیث میں گو ظاہراً روزمرہ کے افطار کا ذکر ہے، لیکن قیاس کہیے یا دلالۃ النص کے اعتبار سے سمجھئے، لفظ سے عموم لیجئے، اس میں دوسرے افطار پر بھی دلالت ہے، یعنی افطار اکبر، سو اس کا بھی یہی حکم ہے، اس اعتبار سے اس افطارِ اکبر کے باب میں یہ بھی ارشاد ہوگا کہ اس افطار کے وقت بھی ایک فرحت ہوتی ہے۔

فرحت روحانیہ

باقی یہ کہ افطار کے وقت کس بات کی خوشی ہوتی ہے؟ سو ایک خوشی تو اہل ظاہر کو ہے کہ کھانا پینا ملا اور ایک خوشی افطار کے وقت اہل حقیقت کو ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کی توفیق سے عبادت تام ہوئی، یہ ہے وہ فرحت روحانیہ جس کا لحاظ فطر اکبر، یعنی عید کے روز بھی کرنا چاہیے۔ اور اسی پر کیا منحصر ہے؟ شریعت میں تو تمام احکام کے متعلق مصالح دنیویہ واخرویہ دونوں موتوع (امانت رکھا گیا) ہیں، تاکہ جو جس کا مذاق ہے، اپنے مذاق کے موافق خواہ دینی یا دنیوی مصلحت سمجھ کر ہر طرح اس کا امتثال کرہی لے۔ اہلِ صورت کا خیال صورت کی طرف جاتا ہے، اہلِ معنیٰ کا ذہن کی طرف منتقل

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن أبي هريرة ﷺ مرفوعا، وكذا في السنن للإمام النسائي رقم الحديث: ۲۲۱۵، ولفظه: للصائم فرحتان: فرحة عند فطره، وفرحة عند لقاء ربه.

ہوتا ہے اور جو جامع ہیں، ان کو دونوں کا لحاظ ہوتا ہے۔

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت روبہ بوار باب معنی را

(اس کے عالم کی حسن کی بہار ظاہر پرست لوگوں کے دل وجان کو اپنے
حسن صوری سے اور حقیقت پرست لوگوں کے دل وجان کو اپنے حسن
معنوی سے تر وتازہ رکھتی ہے)

یہی شریعت مقدسہ کی کیفیت ہے کہ صورت ومعنی دونوں کی جامع ہے، یعنی مصالحِ دینیہ ومصالحِ دنیویہ دونوں کی رعایت ہے، لیکن اصل مقصود مصالحِ دینیہ ہیں، ہاں! مصالحِ دنیویہ بھی اس پر مرتب ہو جاتے ہیں۔

(وعظ: روح الافطار، صفحہ نمبر: ۱۴۳، برکات رمضان جلد ۱۶)

للصائم فرحتان: فرحة عند الإفطار، وفرحة عند لقاء الرحمن

کہ ایک فرحت افطار کے وقت ہوتی ہے، ایک فرحت لقاءِ رب کے وقت قیامت میں ہوگی۔ پھر افطار کے وقت جو فرحت ہوتی ہے، اس کے بھی دو پہلو ہیں: ایک کو اہلِ معنی نے سمجھا، ایک کو اہلِ ظاہر نے سمجھا، اسی پر یہ مضمون چلا تھا، پس اہلِ ظاہر کے کھانے پینے کی فرحت ہوتی ہے، اہلِ معنی کو روزہ پورا ہونے کی فرحت ہوتی ہے اور اس فرحت معنویہ سے اس دوسری فرحت کا نمونہ جو فرحة عند لقاء ربه (لقاءِ رب کے وقت فرحت) آخرت میں ہوگی، ان کے پیشِ نظر ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ فرحت ہوتی ہے عمل پورا ہونے سے اور جس وقت عمل پورا ہوتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ وہ ہوتا ہے جو حدیثوں میں در بابِ فضیلتِ عید کے آیا ہے کہ حق تعالیٰ فرشتوں کو جمع کر کے فرماتا ہے کہ اے فرشتو! کیا جزا ہے اس اجیر کی جس نے

اپنے عمل پورا کرلیا ہو؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اس کی جزاء یہی ہے کہ اسے اجرت پوری دی جائے، حق تعالیٰ فرماتا ہے پس انہوں نے روزے رکھے جو ہمارے یہاں مقبول ہوگئے توتم گواہ رہنا کہ ہم نے سب کی مغفرت کردی،(۱) پس ایک حدیث سے افطار کے فرحت اور ایک حدیث سے تمام عمل کے وقت مغفرت ثابت ہوئی۔ اور یہ مقدمہ ظاہر اور اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ افطار کا وقت تمام عمل کا وقت ہے تو اس افطار کے وقت مغفرت کا ہونا ثابت ہوا اور یہی مغفرت ہے، جس کو خواہ جزاء کہیے، خواہ لقاء رب کہیے تو ہر افطار کے وقت فرحت لقاء رب بھی معنا حاصل ہے جس کا ظہور تم کو آخرت میں ہوگا، اسی لیے اس کو پہلے فرحت پر عطف کیا، پس باعتبار حصول کے یہ معطوف نقد ہے اور باعتبار ظہور کے ادھار ہے، پس یہی لقاء یا مشاہدہ روح ہے اور اس افطار کی اور ہر روز افطار صغیر ہے اور عید افطار کبیر ہے، پس عید کی روح کی مشاہدہ حق ہوا اور گو ظاہرا یہ ادھار ہے، مگر حقیقت میں نقد ہے اور یہ ذوقی بات ہے کہ نقد ہے، البتہ اگر ذوق نہ ہو تو خیر ادھار ہی سمجھو گے کہ جب وہاں جائیں گے تو لقاء رب یا مغفرت ہوگی۔

ذوقِ قرب

اور اگر ذوق ہے تو سب نقد ہے۔

(وعظ: روح الافطار، صفحہ نمبر: ۱۶۶، برکات رمضان جلد نمبر: ۱۶)

ریان کی نسبت باب کی طرف کی توجیہات

پھر آخرت کے لطف کی خبر دی کہ باب یسمی ریانہ یعنی وہ دروازہ تر بتر

(۱) أخرجه البيهقي في سننه عن أنس بن مالك ﷺ مرفوعاً، رقم الحديث ۳۴۴۴، وكذا أخرجه ابن حبان في "الضعفاء".

ہوگا، جو اس میں داخل ہوگا، وہ تربتر و سیراب ہو جائے گا۔

اگر کسی کو خیال ہو کہ ہم باب الریان کو کیا سمجھیں گے، عربی تو جانتے ہی نہیں، پھر یہ نام سن کر وہاں کیا مزہ آوے گا؟ تو خوب سمجھئے کہ اہلِ جنت کی زبان عربی ہوگی، وہاں سارے عربی دان ہو جاویں گے، باب الریان کو بھی سمجھو گے اور اس کا نام بھی ریان ہوگا، دیکھنے میں بھی ریان ہوگا، یعنی تربتر۔

بعض نے کہا ہے کہ ریان کی اسناد باب کی طرف حقیقی ہے، یعنی وہ دروازہ خود بھی تروتازہ ہوگا کہ اس میں نہریں ہوں گی، فوارے ہوں گے، وہ بھیگا ہوا ہوگا، مگر یہ نہیں کہ اس میں کیچڑ ہوگی، یعنی بعض نے کہا ہے کہ اسنادِ مجازی ہے، یعنی دروازہ کو ریان کہنا باعتبار ان لوگوں کے ہے جو اس میں وارد ہوں گے، یعنی وہ تروتازہ ہو کر جاویں گے۔ اس کے بعد ایک گفتگو اس میں ہے کہ جنت کی چیزیں جس حالت پر ہوں گی، آیا وہ چیزیں خود بھی اس حالت کا ادراک کریں گی یا نہیں؟ بعض نے کہا ہے کہ ان کو بھی ادراک ہوگا، مثلاً دروازہ تربتر ہوگا تو وہ اپنے تربتر ہونے کا ادراک بھی کرے گا۔

(وعظ: احوال واقعی، صفحہ نمبر: ۳۶۵ تا ۳۶۶، جلد نمبر: ۱۶ برکات رمضان)

رمضان کے تینوں عشروں کی دلنشین تشریح

هو شهر أوله رحمة، واوسطه مغفرة، وآخره عتق من النار [1]

ترجمہ یہ ہے کہ ماہ رمضان ایسا مہینہ ہے کہ اس کا اول حصہ رحمت ہے، اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آگ سے آزادی ہے۔

---

(۱) أخرجه ابن خزيمة في صحيحه، رقم الحديث: ۱۸۸۷ باب فضائل شهر رمضان إن صح الخبر.

میں نے کہا تھا کہ اس حدیث کو دو باتوں کے بیان کے لیے پڑھا ہے، مگر اول اس حدیث کی شرح کر دوں تو پھر ان کو بیان کروں تو سمجھنا چاہیے کہ یہ جو فرمایا گیا کہ اس کا اول حصہ رحمت ہے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ رحمت ایک لطف ہے، چونکہ ابتداء حصہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے عمل کرنے کی توفیق عطا ہوتی ہے کہ بدون اس توفیق کے کوئی عمل بھی نہیں ہوسکتا، اس لیے اولہ رحمۃ فرمایا گیا، کیونکہ صوم وغیرہ کی توفیق دینا، عبادت کی توفیق دینا بہت بڑی رحمت ہے۔

حقوقِ روزہ

اور چونکہ ارشاد خداوندی ہے کہ

إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱)

نیکیوں سے برائیاں معاف ہوجاتی ہیں۔

تو جب اول رمضان توفیق ہو جانے سے اعمالِ نیک شروع کیے تو ان سے گناہ معاف ہونے شروع ہوئے، جب ان کی بدولت گناہ معاف ہو گئے تو وسطِ رمضان مغفرت ہوا، اسی کو فرماتے ہیں: واوسطه مغفرة اور ظاہر ہے کہ گناہوں کا معاف ہو جانا یہی دوزخ سے بچنا ہے تو اس پر متفرع ہو کر یہ ارشاد صحیح ہوا کہ وآخرہ عتق من النار۔ اور یہ تقسیم یا تو مجموعہ شہر کے اعتبار سے لی جاوے تو اس میں رات بھی آجاوے گی اور اس صورت میں روزہ کی تخصیص نہ ہوگی، بلکہ اعمالِ لیل کا بھی اس فضیلت میں داخل ہوا اور یا باعتبار اجزاء متفرقہ کے کہ وہ صرف دن کے اوقات ہیں، جیسے اس قول میں یہی مراد ہوتا ہے کہ رحمة

(۱) ھود الایة: ۱۱۴

الشهر كله تو ظاہر ہے کہ ضمیر مہینہ کی طرف اجزاء متفرقہ، یعنی نہار کے اعتبار سے راجع ہوگی۔

پس اسی طرح حدیث میں بھی احتمال ہے تو اس صورت میں یہ مصلحت خاص ہوجاوے گی روزہ کے ساتھ اور اسی طرح اس تقسیم میں دوسرے اعتبار سے بھی دو احتمال ہیں، یعنی ایک یہ ممکن ہے کہ یہ تینوں اثر ہر حصہ میں ہوں، لیکن غلبہ اثر کے اعتبار سے تقسیم فرما دیا گیا، یعنی چونکہ اول حصہ رمضان میں وصفِ رحمت کا غلبہ تھا، اس لیے اس کو رحمت کہا گیا، گو مغفرت و عتق اس میں بھی ہو اور وسط میں مغفرت غالب تھی، اس پر مغفرت کا اطلاق کیا گیا اور اخیر حصہ میں عتق من النار (دوزخ سے آزادی) کا وصف غالب تھا، اس لیے اس کو عتق من النار کہا گیا۔

(وعظ: اکمال الصوم والعید، صفحہ نمبر: ۴۲۶ تا ۴۲۹، برکات رمضان جلد نمبر: ۱۶)

اسی واسطے رمضان سے پہلے مستقلا روزہ رکھنے کو بھی منع فرمایا[۱]، لیکن اس میں فرق کیا ہے کہ تقدیم کو تو حرام نہیں کیا اور تاخر کو حرام کیا؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ تقدم میں احتمال اس بات کا بھی ہے کہ ممکن ہے آج رمضان ہو، کیونکہ بعض دفعہ ایسا ہوجاتا ہے کہ ۲۹ کا چاند دس پانچ جگہ نظر آوے اور دو چار جگہ نظر نہ آوے، پس ممانعت خفیف ہوئی، تاکہ ممانعت بھی اپنے حد پر رہے اور رمضان کے ختم پر اس وقت تک عید کرنا جائز نہیں، جب تک رویت کا تیقن نہ ہوجائے اور جب تیقن ہوجاوے تو اب اس میں احتمال رمضانیت کا نہیں،

---

(۱) أخرجه الشيخان رحمهما الله في صحيحيهما عن أبي هريرة رضي الله عنه مرفوعا.

اس لیے رمضان کے بعد متصلا، یعنی عید کے روز، روزہ رکھنا حرام ہوا۔ [1] ھذا من المواھب

(وعظ: اکمال الصوم والعید، صفحہ نمبر: ۴۳۶، برکات رمضان جلد نمبر: ۱۶)

روزہ نام ہے تخلق بأخلاق اللہ کا

روزہ نام ہے تخلق باخلاق اللہ کا اور یہی معنے ہیں حدیث "الصوم لی و أنا أجزی به" [2] کے کہ روزہ میرے لیے ہے اور اس کی جزا میں خود دوں گا، اہل ظاہر نے اس کی شرح میں یہ کہا ہے کہ روزہ میں خلوص زیادہ ہے، اس میں ریا نہیں ہوسکتی، کیونکہ اس کی حقیقت ترک ہے جو عدمی ہے اور ریاء وجودی میں ہوا کرتی ہے، اس لیے اس کو لی فرمایا ہے، یعنی اس کو میرے ساتھ خاص خصوصیت ہے بوجہ اس کے کہ اس میں غیر اللہ کو دکھلانے کی گنجائش نہیں، مگر عارفین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ روزہ میں شان تنزیہ ہے، اس میں تشبہ بحق و تخلق باخلاق اللہ ہوتا ہے، اس سے خدا تعالیٰ کے ساتھ مناسبت ہوجاتی ہے، لی کی یہ تفسیر کی ہے۔

(وعظ: تقلیل الکلام، صفحہ نمبر: ۱۳۴ جلد نمبر: ۲۷ فضائل علم)

---

(۱) أخرجه الشيخان فی صحيحيهما، و كذا أخرجه الامام الترمذی فی سننه، رقم الحديث: ۷۷۳ (باب ماجاء فی كراهية الصوم فی أيام التشريق) ولفظه: عن عقبة بن عامر قال: قال رسول الله ﷺ: يوم عرفة، ويوم النحر، وأيام التشريق، عيدنا أهل الاسلام، وهی أيام أكل وشرب، وفی الباب عن علی، وسعد، وأبی هريرة، وجابر، ونبيشة، وبشر بن سحيم، وعبد الله بن حذافة، وأنس، وحمزة بن عمرو الاسلمی، وكعب بن مالك، وعائشة، وعمرو بن العاص، وعبد الله بن عمرو: وحديث عقبة بن عامر حديث حسن صحيح.

(۲) أخرجه الشيخان رحمهما الله فی صحيحيهما عن أبی هريرة رضی الله عنه مرفوعا.

رمضان کے مہینے کو عید کا مہینہ کہنے کی وجہ

شہرا عید لا ینقصان [1] (عید کے دو مہینے کم نہیں ہوتے) اس کی تفسیر بھی خود حدیث میں آئی ہے کہ وہ رمضان اور ذی الحجہ ہیں، ذی الحجہ کا شہر عید فرمانا تو ظاہر ہے کہ اس میں عید کا دن ہے، لیکن رمضان کو اس وجہ سے عید فرمایا کہ یہ فرحت کا مہینہ ہے کہ ہر روز افطار کے وقت اس میں فرحت ہوتی ہے اور یا یہ وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس طرح اشارہ کیا کہ جس معنی کو اسے عید کا مقابل سمجھتے ہو، یعنی امساك عن الغذاء (غذاء سے باز رکھنا) سو اس معنی کے اعتبار سے بھی یہ عید ہی کا مہینہ ہے، یعنی اس میں روحانی غذائیں ملتی ہیں، بلکہ جو حقیقی غذائیں اس ماہ میں ملتی ہیں، وہ عید میں میسر بھی نہیں آتیں:

وذكرك للمشتاق خير شراب
وكل شراب دونه كسراب

اے محبوب! آپ کا ذکر سب سے اچھی غذا ہے (اور ماسوا ذکر کے جو بھی غذا ہے، وہ مثل سراب کے دھوکا ہے)

اور حقیقت میں تو کچھ تعجب بھی نہیں، کسی پر عاشق ہو جاؤ، محبوب یہ کہے کہ دو شقیں ہیں اور پلاؤ اور قورمہ، فرینی مزعفر لیتے ہو تو ہم سے ملاقات نہ ہوگی اور اگر ہمارے پاس بیٹھنا چاہتے ہو تو یہ بھی نہ ملے گا، بلکہ فاقہ سے پڑا رہنا ہوگا، تم خود دیکھ لو کہ تمہارا ذہن کیا حکم کرے گا؟ اس پر تو تنبیہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ محبوب کو اختیار کرے گا۔

(وعظ: روح الجوار، صفحہ نمبر: ۱۹۴ برکات رمضان جلد نمبر: ۱۶)

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما، ولفظه: عن عبد الرحمن بن أبي بكرة، عن أبيه رضي الله عنه، عن النبي ﷺ، قال: "شهران لا ينقصان، شهرا عيد: رمضان، وذو الحج".

حدیث تضاعف ثواب فی رمضان سے مراد تاخیرِ طاعات الی رمضان نہیں، بلکہ تعجیلِ اعمال فی رمضان ہے

حدیث تضاعفِ ثواب فی رمضان (۱) کے باب میں شارع کا مقصد نہیں سمجھا اور رفقہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر عمل کیا کہ تفاضل حسنات کے لیے طاعات کو مؤخر کرنے لگے کہ اگر کسی کا زکوٰۃ کا سال ۲۸ شعبان کو پورا ہوتا ہے تو وہ ۲۸ کو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، بلکہ رمضان کے لیے اس کو ملتوی کرتا ہے، چاہے غریب مسکینوں کا (جن کا یہ مال زکوٰۃ شرعی حق ہے) خاتمہ ہی ہوجائے۔ ارے! تم کو کیا خبر ہے کہ مساکین پر کیا گزر رہی ہے، تم کو یکم رمضان کا انتظار ہے اور اس غریب کی روح کو ایک ایک گھڑی کا انتظار ہے، بس وہ حال ہوگا تا تو بمن می رسی من بخدا می رسم (جب تک تو مجھ تک پہنچے گا، میں خدا تک پہنچ جاؤں گا) صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ حدیث کا مطلب یہ نہیں جو آپ نے سمجھا، رسول اللہ ﷺ کا مقصود یہ نہیں کہ رمضان تک طاعات کو مؤخر کیا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ رمضان میں طاعات کے اندر جلدی کی جائے، یعنی جس طاعت کی ہمت ہوسکے اور جس عمل صالح کی توفیق ہوسکے، اس کو جلدی رمضان ہی میں کردو، رمضان کے بعد کے لیے مؤخر نہ کرو، کیونکہ رمضان میں ثواب زیادہ ہے، پس تضاعفِ حسنات کا مقصود تو تعجیلِ اعمال فی رمضان تھا، لوگوں نے اس سے تاخیرِ

---

(۱) أخرجه ابن خزيمة فی صحيحه عن سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ، رقم الحديث: ۱۸۸۷ باب فضائل شهر رمضان ان صح الخبر، شعب الايمان رقم الحديث: ۳۳۳۶، قال الحافظ فی التلخيص الحبير: (۲۵۷/۳) "حديث ضعيف".

اعمال الی رمضان سمجھ لیا۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

(اس فرق کو دیکھو کہ کہاں سے کہاں تک ہے)

اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ جس شخص کا سال زکوۃ ۲۸ شعبان کو پورا ہو تو کیا وہ شعبان ہی میں صدقہ کردے، اس کے جواب میں، میں یہی کہوں گا کہ ہاں دیر نہ کرے، رمضان کا انتظار نہ کرے، رہا یہ سوال کہ کیا شعبان میں وہی ثواب ہوگا جو رمضان میں ہوتا ہے، تم اس کا ٹھیکہ لیتے ہو، اس کا جواب یہ ہے کہ میں ٹھیکیدار تو نہیں ہوں، ہاں ٹیکہ دار ہوں کہ اللہ ورسول ﷺ کے بیان کردہ قواعد پر ٹیک لگا کر کہتا ہوں کہ اللہ و رسول ﷺ کو تاخیرِ طاعت مطلوب نہیں، بلکہ تسارع وتسابق الی الخیرات مقصود ہے، چنانچہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ [1] (نیکیوں میں سبقت کرو) وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ [2] (وہ نیکیوں میں سبقت لے جاتے ہیں) نص میں وارد ہے، اس لیے میں جزم کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تاخیر فی الخیر شارع کو ہرگز مطلوب نہیں اور میں قواعد سے کہتا ہوں کہ جس کو شعبان میں صرف کا موقع ملے، وہ ہرگز تاخیر نہ کرے، اس کو شعبان ہی میں اتنا ثواب ملے گا جو شاید رمضان کے ثواب سے بھی بڑھ جائے، کیونکہ انفاق فی رمضان سے کمیۃ ثواب بڑھتا ہے اور تعجیل وسبقت فی الخیر سے کیفیۃ ثواب زیادہ ہوتا ہے اور کیفیت میں کمیت سے زیادہ مطلوبیت ہے۔ صاحبو! میں اس کی نظیر علماء کے کلام سے اپنے پاس رکھتا ہوں، حدیث میں ہے کہ مسجد محلہ میں نماز پڑھنے سے ۲۵ نمازوں کا

---

(۱) البقرۃ: الایۃ ۱۴۸

(۲) آل عمران: الایۃ ۱۱۴.

ثواب ملتا ہے اور جامع مسجد میں ۵۰۰ نمازوں کا، (۱) مگر محلہ والوں کو یہ جائز نہیں کہ محلہ کی مسجد چھوڑ چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھنے جایا کریں، اگر ایسا کروگے تو گناہ ہوگا۔ (۲) اس مقام پر علماء نے لکھا ہے کہ جامع مسجد کی نماز اس شخص کے حق میں کمیۃ زیادہ ہے اور مسجد محلہ کی نماز کیفیۃ زیادہ ہے (کیونکہ اس کے ذمہ مسجد کی آبادی واجب ہے تو یہ شخص مسجد میں نماز بھی پڑھتا ہے اور واجب عمارت کو بھی ادا کرتا ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے واجب عمارت ادا نہ ہوگا، کیونکہ اس کے ذمہ اس کی عمارت وآبادی واجب نہیں، بلکہ یہ واجب جامع مسجد کے محلہ والوں کے ذمہ ہے ۱۲) ہاں! اگر کوئی جامع مسجد کے محلہ میں جا بسے تو اور بات ہے، پھر اس کو کیفیت وکمیت دونوں میں ترقی ہو جائے گی، گو قرب سے بعد اقدام کا بھی خسارہ ہو جائے گا۔ بس تم اپنے حساب وقواعد کو رہنے دو، اس میں پانچ کو جانے دو، جو حکم ہو جائے، اس کو مان لو، اپنی طرف سے حساب نہ لگاؤ کہ اس وقت جمع کرنے میں ثواب کم ہوگا، رمضان میں زیادہ ہوگا۔ صاحبو! یہ تسلیم کہ رمضان میں زیادہ ہوگا، مگر یہ آپ کو کیوں کر معلوم ہوا کہ اس وقت کم ہوگا، ممکن ہے اس وقت ہی زیادہ مل جائے، کیونکہ اس وقت خرچ کروں گا تو ادا ہوگا اور رمضان تک تاخیر کروگے تو قضا ہو جائے گا اور ادا میں جو لطف ہے، وہ بات قضا میں کہاں؟

---

(۱) سنن ابن ماجه، رقم الحديث ۱۴۱۳، فی باب ماجاء فی الصلاة فی المسجد: عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله ﷺ: صلاة الرجل فی بيته بصلاة، وصلاته فی مسجد القبائل بخمس وعشرين صلاة، وصلاته فی المسجد الذی يجمع فيه بخمس مائة صلاة، وصلاته فی المسجد الاقصى بخمسين الف صلاة، وصلاته فی مسجدی بخمسين الف صلاة، وصلاة فی المسجد الحرام بمائة الف صلاة.

(۲) حاشية ابن عابدين (ردالمحتار ۱/ ۶۵۹) مطبع ایچ ایم سعید کراچی.

(وعظ: التحصیل والتعدیل مع التکمیل والتعدیل، صفحہ نمبر: ۱۳۹ تا ۱۴۱، حقیقت تصوف وتقوی جلد نمبر ۱۱)

لخلوف فم الصائم أطیب عند الله من ریح المسك اور دوسری حدیث میں تطبیق

میری سمجھ میں تو یہ آتا نہیں کہ رمضانیت کی فضیلت تقلیل طعام پر موقوف ہے۔

اب یہاں پر ایک شبہ باقی رہا، وہ یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے:

خلوف فم الصائم أطیب عند الله من ریح المسك (۱)

یعنی صائم کے منہ کی بدبو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے۔

اور یہ بو اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ معدہ میں کچھ نہ ہو۔ جب معدہ بالکل خالی ہوتا ہے تو اس سے کچھ روائح اوپر کی طرف صعود کرتے ہیں، ان کا اثر منہ میں بھی آتا ہے، تو اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم کھانا مطلوب ہے، ورنہ اگر زیادہ کھایا اور وہ کھایا معدہ میں رہا تو خلوف کا وجود کہاں ہوگا، اور لیجیے ایک دوسری حدیث ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کو روزہ سے سوائے بھوک پیاس کے کچھ وصول نہیں ہوتا۔ (۲)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ روزہ میں بھوک پیاس مطلوب ہیں۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں حدیثوں سے یہ لازم نہیں آتا کہ کم کھانا کم پینا مطلوب ہے۔

---

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن أبی ہریرة رضی الله عنه مرفوعا.

(۲) أخرجه الإمام احمد فی مسنده عن أبی هریرة رضی الله عنه مرفوعًا، رقم الحدیث: ۸۸۵۶، "رب صائم حظه من صیامه الجوع والعطش =

اول حدیث کی مثال تو ایسے ہے جیسے ماں کہے کہ مجھے تو اس بچہ کا پیشاب بھی پیارا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ماں کو مقصود یہ ہے کہ بچہ اس کے اوپر پیشاب کرے۔ مقصود تو اس کی محبوبیت کا اظہار ہے، پس مطلب یہ ہے کہ اگر روزہ کی یہاں تک نوبت پہنچے کہ اس کے منہ سے بدبو آنے لگے تو اللہ تعالی کے نزدیک ناپسند نہیں۔ اب اس سے لازم نہیں کہ ایسی حالت پیدا کیا کرو کہ یہ مطلوب ہے۔

دوسری حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص نے روزہ میں معاصی نہیں چھوڑے تو اس کو اگرچہ بھوک پیاس کی بھی مشقت لاحق ہو تو کوئی فائدہ نہیں ہے، اس سے مطلوبیت کیسے لازم آئی؟ اگر کسی کو اس کے خلاف تحقیق ہو تو مہربانی فرما کر وہ مجھ کو بتا دیں۔ مجھ کو اپنے قول پر اصرار نہیں، جو میری سمجھ میں آیا ہے، وہ بیان کر دیا ہے۔

(وعظ: الصیام، صفحہ نمبر: ۱۴۴ تا ۱۴۵، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

ولله عتقاء من النار کی تشریح

حضور ﷺ نے رمضان شریف کی فضیلت ارشاد فرمائی ہے کہ ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ:

یاباغی الخیر! اقبل... الخ (۲)

یعنی اے خیر کے طلب کرنے والے چل، متوجہ ہو اور اے شر کے طلب کرنے

= ورب قائم حظه من قیامه السهر" وکذا ابن ماجه فی سننه، رقم الحدیث ۱۶۹۰.

(۲) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن أبی هریرة آمرفوعا، رقم الحدیث: ٦٨٢، (باب ما جاء فی فضل شهر رمضان)، ابن ماجه رقم الحدیث: ١٦٤٢.

والے! اب تو رک جا۔ تیسرا جملہ و للّٰہ عتقاء من النار اللہ تعالیٰ بہت سے بندوں کو اس ماہ کی برکت سے آزاد کردیتے ہیں۔ محتمل ہے، یعنی یا تو وہ بھی فرشتہ کی ندا ہو، یعنی فرشتہ کہتا ہے کہ اس وقت خدائے تعالیٰ کے یہاں عام رہائی ہورہی ہے، اے شخص تو بھی مستحق رہائی ہوجا۔

دیکھو جب کوئی شاہی خوشی ہوتی ہے تو ہر قیدی کوشش کرتا ہے چھوٹنے کی، تو اس وقت رمضان المبارک کا مہینہ ہے، خدائے تعالیٰ کا فضل عام ہورہا ہے، قیدی چھوٹ رہے ہیں، تم پر بھی تعزیراتِ آخرت کی بہت سی دفعات لگ چکی ہیں، اس لیے تم بھی انہی قیدیوں میں ہو، پس تم بھی سعی کرو کہ تمہاری رہائی ہوجائے اور یا یہ جملہ حضور ﷺ نے اپنی طرف سے فرمایا ہو، دونوں کا حاصل ایک ہوگا۔

(وعظ: نداء رمضان، صفحہ نمبر: ۷۹ تا ۸۰، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

ندائے فرشتہ خود سننا اور دوسرے کا خبر دینا دونوں قابل عمل ہیں

حدیث یا باغی الخیر... الخ [1]

میں ندائے فرشتہ کا ذکر ہے اور ذکر بھی اس طرح کہ روزمرہ ندا ہوتی ہے، مگر کوئی اس کو سنتا نہیں، پھر ندا پر عمل کی کیا صورت ہے؟

جواب یہ ہے کہ جیسے خود سننا قابلِ عمل ہے، دوسرے کا خبر دینا بھی قابل عمل ہے، پس ہم رسول اللہ ﷺ سے اس کی خبر معلوم کر کے عمل کرسکتے ہیں، اگرچہ ہمارے حواس اس قابل نہیں کہ فرشتہ کی ندا کو سن سکیں تو یہ ہماری کمی ہے۔

(وعظ: نداء رمضان، صفحہ نمبر: ۸۵، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

---

(۱) للمصدر السابق

بہ گمانِ شبِ قدر اس میں عبادت کی تو شبِ قدر ہی کا ثواب ملے گا

میں کہتا ہوں کہ اگر اتفاق سے وہ رات شبِ قدر نہ بھی ہوئی اور تم نے بہ گمان شب قدر اس میں عبادت کی تو ان شاء اللہ تم کو شبِ قدر ہی کا ثواب عطا ہوگا اور یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں ہے، حدیث میں اس کی اصل ہے، حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنما الأعمال بالنيات (۱)

پھر ممکن ہے کہ اس کلیہ سے کسی کی تشفی نہ تو دوسری حدیث موجود ہے، حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

الصوم يوم تصومون و الفطر يوم تفطرون و الأضحیٰ يوم تضحون (۲)

جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک شخص نے نہایت کوشش سے رمضان کے چاند کی تحقیق کی اور اس تحقیق کی بناء پر روزے رکھنے شروع کر دیئے، پھر ختم رمضان پر عید کے چاند کی اس طرح چھان بین کی اور اس کی بناء پر عید کر لی، اسی طرح عید الاضحیٰ میں بھی کیا اور چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ تینوں تحقیق خلافِ واقع تھیں تو اس صورت میں دل شکستہ نہ ہونا چاہیے، بلکہ جس دن روزہ رکھا، وہی دن عند اللہ باعتبار مقبول روزہ کا تھا اور جس دن عید کی، وہی دن عید کا تھا، یعنی روزہ اور عید دونوں مقبول ہیں، پس اسی طرح میں کہتا ہوں کہ اگر شب

---

(۱) تقدم تخريجه.

(۲) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن أبی هريرة مرفوعا، رقم الحديث: ٦٩٧، (باب ما جاء فی أن الفطر يوم تفطرون، والأضحی يوم تضحون)، سنن الدارقطنی رقم الحديث: ٢١٨١.

قدر کی نیت سے عبادت ہوئی ہے اور اتفاق سے وہ شبِ قدر نہ ہوئی تو ثواب شبِ قدر کامل جائے گا۔

(وعظ: احکام العشرۃ الأخیرۃ، صفحہ نمبر: ۳۰۹، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

رمضان میں شیاطین قید کر دینے کے باوجود گناہ ہونے کی وجہ

حدیث میں آیا ہے:

اذا دخل رمضان صفدت الشياطين.[1]

کہ جب رمضان آتا ہے تو شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر رمضان میں گناہ کیوں ہوتے ہیں؟ اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ سب قید نہیں ہوتے، بلکہ بڑے بڑے شیاطین قید ہوتے ہیں جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض روایات میں مردة الشیاطین (بڑے بڑے شیاطین) آیا ہے تو چھوٹے قید نہیں ہوتے اور رمضان میں صدور معاصی انہی کی وجہ سے ہوتا ہے، مگر میرے نزدیک اگر سب بھی قید ہو جائیں، تب بھی کچھ اشکال نہیں، کیونکہ معاصی کا سبب تقاضائے نفس بھی ہے، پس شیاطین کے قید ہو جانے کے بعد جو گناہ ہوتے ہیں، ان کا منشاء تقائے نفس ہے۔

مگر اب یہ سوال ہوتا ہے کہ جب چھوٹے شیاطین قول اول پر اور تقاضائے نفس قول ثانی پر گناہ کرانے کے لیے موجود ہیں تو پھر شیاطین کے قید ہونے سے کیا

---

(۱) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن أبی هریرة رضی الله عنه مرفوعا، رقم الحدیث: ۶۸۲، باب ما جاء فی فضل شهر رمضان، "اذا كان أول ليل من شهر رمضان صفدت الشياطين، ومردة الجن، وغلقت أبواب النار الى اخر الحديث،" والسنن لابن ماجه: ۱۶۸۲، شرح السنة للبغوی، رقم الحدیث: ۱۷۰۴ (۲۱۴/۶) واللفظ له.

فائدہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی نفع ہے چوروں کی جماعت کم ہو جائے، رمضان سے پہلے اگر ہزار چور تھے تو اب سورہ گئے اور دوسرے قول پر تو صرف ایک ہی رہ گیا اور ظاہر ہے کہ ایک چور کا ہونا ایک جماعت کے ہونے سے سہل ہے، اس کا مقابلہ آسان ہے، یہی وجہ ہے کہ رمضان میں اور دنوں سے گناہ کم ہوتے ہیں۔

(وعظ: علاج الحرص، صفحہ نمبر: ۲۷۴، جلد نمبر: ۸ حقیقت مال وجاہ)

أنا أجزی به کی تشریح

ایک اور بات بھی یاد آئی کہ

أنا أجزی به [1]

میں خود ہی اس کی جزا دوں گا۔

ایک نسخہ اُنا اُجزی بہ بصیغہ مجہول بھی مشہور ہے، اس کے معنی مشہور یہ ہیں کہ روزہ میرا ہے اور اس کے بدلہ میں دیا جاؤں گا، یعنی اس کا بدلہ یہ ہے کہ میں اس کو ملوں گا اور یہ مضمون گو فی نفسہ صحیح ہو کہ حق تعالیٰ اس کے بدلے میں مل جائیں گے۔

اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آ گئی کہ خلیفہ ہارون الرشید نے ایک دن دربار کیا

---

(۱) أخرجه الشيخان فی صحيحيهما عن أبی هريرة رضی الله عنه مرفوعا، ولفظه: "يقول الله عز وجل: الصوم لی وأنا أجزی به، يدع شهوته وأكله وشربه من أجلی، والصوم جنة، وللصائم فرحتان: فرحة حين يفطر، وفرحة حين يلقى ربه، ولخلوف فم الصائم أطيب عند الله من ريح المسك".

اور حکم کیا کہ جو شخص جس شے پر ہاتھ رکھ دے گا، اس کو وہی شے دی جائے گی، چنانچہ لوگوں نے اپنی خواہشوں کے موافق ایک ایک شے پر ہاتھ رکھ دیا، ایک لونڈی نے ہارون الرشید کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا، ہارون نے کہا یہ کیا؟ کہا جب آپ میرے ہو گئے تو یہ چیزیں میری ہو گئیں، اس لیے میں نے آپ کو انتخاب کیا ہے۔ بس جس کو خدا تعالیٰ مل گئے، اس کو سب نعمتیں مل گئیں۔

غرض یہ مضمون تو فی نفسہ صحیح ہے، مگر غلطی یہ ہے کہ اس حدیث سے نکالا جاتا ہے جو شخص ذرا بھی عربیت سے مس رکھتا ہوگا، وہ ہرگز اس سے یہ معنی نہ سمجھے گا، اس لیے کہ عربیت کے اعتبار سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جزا دیا جاؤں گا، یعنی نعوذ باللہ مجھ کو کوئی جزا دے گا، نہ یہ کہ میں جزا میں مل جاؤں گا، کہ یہ اس کا ترجمہ نہیں ہے، پس یہ نسخہ غلط ہے، صحیح وہی ہے۔

أنا أجزی به، یعنی میں اس کو جزا دوں گا اور روزہ کی فضیلت یہ کیا کچھ کم ہے کہ فرماتے ہیں کہ میں جزا دوں گا؟ خیر یہ مضامین تو تبعاً بطور لطیفہ کے ہیں۔

روزہ اور فدیہ

مجھ کو "فانہ لی" (وہ روزہ میرے ہی لیے ہے) سے ایک مضمون خاص مستنبط کرنا ہے جو کہ نہایت کار آمد ہے، وہ یہ ہے کہ جب یہ فرمایا کہ روزہ میرا ہے تو جب ہم نے روزہ رکھا تو گویا ہم زبان حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ لیجئے حضور! یہ آپ کے لیے ہے، اب آپ یہاں سے سبق حاصل کیجیے کہ اگر حاکم ضلع کے لیے کوئی شے تحفہ کے طور پر بھی لے جاؤ، خاص کر جب کہ حاکم خود فرمائش بھی کرے تو اس کا کس قدر اہتمام کرو گے، جہاں تک ہو سکے گا، عمدہ صاف ستھری شے لے جاؤ گے اور اگر احتمال بھی اس میں عیب کا ہوگا تو اس کو ردی کر دو گے، دوسری منگاؤ گے۔ ذرا گریبان میں منہ

ڈال کر حق تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر کہنا کہ روزہ میں بھی اتنا یا اس سے آدھا ہی اہتمام ہوا ہے؟

(وعظ: الصوم، صفحہ نمبر: ۱۰۳ تا ۱۰۴، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

باب الاعتکاف
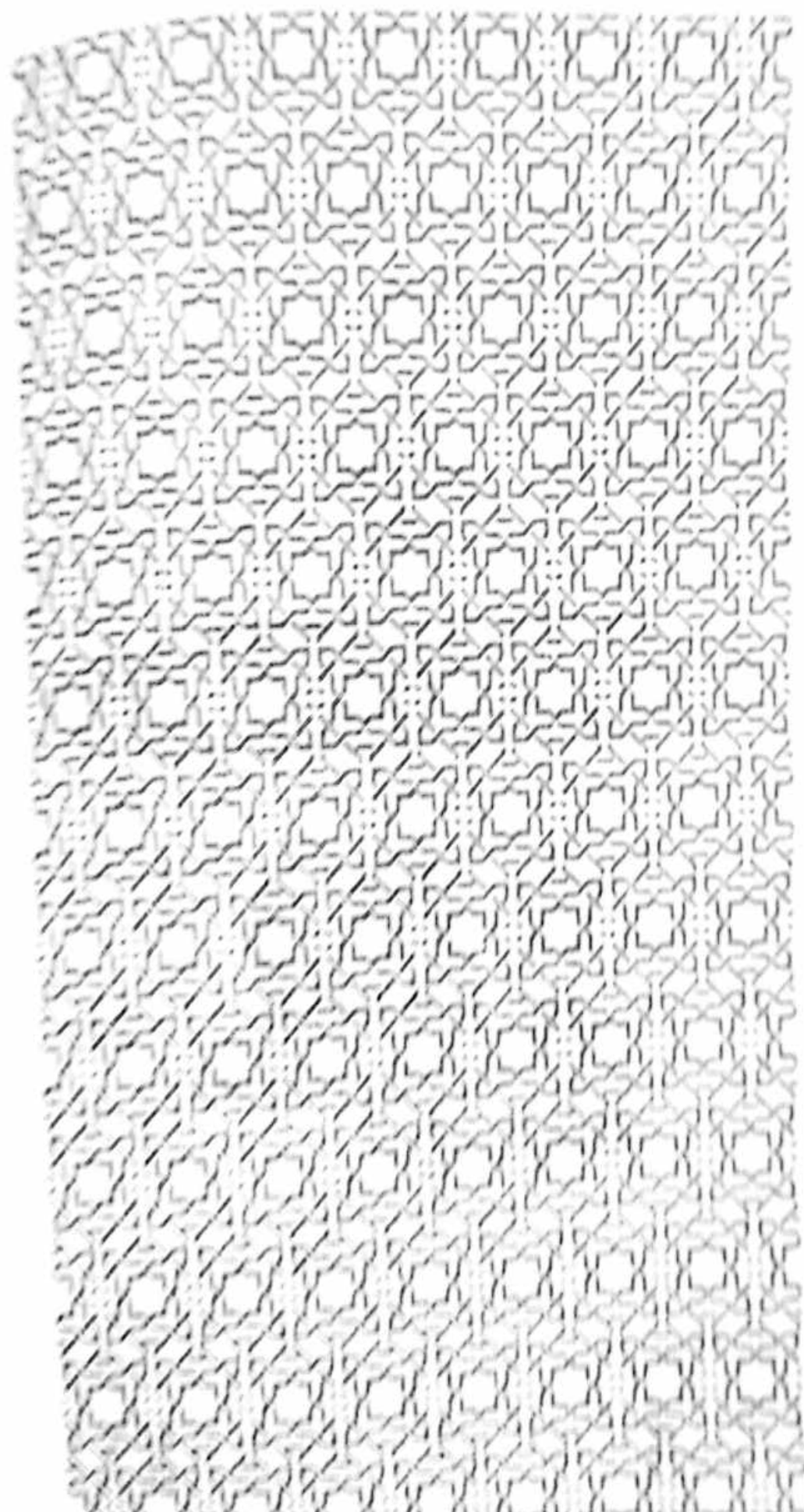
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب الاعتکاف

اعتکاف اور خلوت میں گناہوں سے بچنے کے درمیان لطیف فرق

حدیث شریف میں ہے:

(ھو ای المعتکف) یعکف الذنوب، ویجری له من الحسنات کعامل الحسنات کلها رواه ابن ماجه [1]

کہ معتکف گناہوں سے الگ رہتا ہے۔ اور اس کے لیے نیکی کرنے والے کی طرح نیکیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اس پر بظاہر ایک اشکال وارد ہوتا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص اعتکاف نہ کرے اور ویسے ہی گھر کو بند کر کے خلوت اختیار کرے، وہ بھی گناہوں سے بچ سکتا ہے، پھر اعتکاف کی اس میں کیا خصوصیت ہے؟ اور اگر خصوصیت نہیں تو اس حکم کو بعنوان

---

(۱) أخرجه الامام ابن ماجه فی سننه عن ابن عباس رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحديث: ۱۷۸۱ باب فی ثواب الاعتکاف، ولفظه: أن رسول الله ﷺ قال فی المعتکف هو یعکف الذنوب، ویجری له من الحسنات کعامل الحسنات کلها.

وقال البوصیری فی مصباح الزجاجة ۲/ ۲۵ هذا إسناد فيه دفرقد بن یعقوب السبخی وهو ضعیف، وذکره ابن الملقن فی "البدر المنیر" ۵/ ۷۷۰، وقال وفرقد هذا وثقه ابن معین وضعفه أحمد والدارقطنی.

معتکف بیان کرنا صحیح نہ ہوگا، کیونکہ بقاعدۂ بلاغت مسند الیہ مشتق میں مادہ اشتقاق علت حکم ہوا کرتا ہے، پس مطلب یہ ہوا کہ کف عن الذنوب کی علت اعتکاف ہے اور یہ مطلب بدون خصوصیت کے صحیح نہیں ہوسکتا۔ جواب یہ ہے کہ گناہوں ترک کرنے کی دو قسمیں ہیں اور ہر ایک کا جدا جدا حکم، سو ایک ترک تو اصلی ہے، یعنی گناہ کا عدم اصلی کے ساتھ منعدم ہونا اور ایک وہ ترک ہے جو عزم کے ساتھ ہو، یعنی ترک کو قصد کے ساتھ متعلق کیا۔ سو اول قسم ہو تو کوئی ثواب نہیں ملتا، اس لیے کہ ثواب اعتقادِ قصد پر ہے، دوسرے ایسے تروک تو غیر متناہی ہیں تو چاہیے ہر آن میں غیر متناہی اجر ملا کرے اور اس کا کوئی قائل نہیں، اس کا التزام خلافِ اجماع ہے اور دوسری قسم پر ثواب ہوتا ہے، یعنی کسی معصیت کی طرف التفات ہو اور اس سے اپنے کو روک لیا، اس پر ثواب ملتا ہے، یہ قاعدہ تو عام ہے۔

خصوصیاتِ اعتکاف

اب سمجھو! کہ اعتکاف میں یہ تخصیص ہے کہ معتکف کو تمام تروک پر ثواب ملتا ہے، گو وہ اس کے ذہن میں بھی نہ ہوں اور ان سے ان کے ترک کا قصد بھی نہ کیا ہو، بس یہ خصوصیت ہے اعتکاف میں جو مطلق خلوت میں نہیں جس کی وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا: هو (ای المعتكف) يعكف الذنوب اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس کے بعد حضور ﷺ کا ارشاد ہے ويجزى له من الحسنات كعامل الحسنات كلها یعنی جن حسنات پر یہ قادر تھا اور اعتکاف کی وجہ سے نہیں کرسکتا، گو اس نے ان کی نیت بھی نہ کی ہو، ان سب کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے (اور دلیل اس عموم کی الحسنات كلها کا عموم ہے) پس جب

معتکف کے لیے تمام حسنات کا ثواب لکھا جاتا ہے تو اس سے پہلے جملہ کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام گناہوں سے بچنے کا ثواب بھی لکھا جاتا ہے، گو اس نے ان سے بچنے کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ اہلِ اختلاط نے جو عزلت میں یہ خرابی بیان کی تھی کہ اس کی وجہ سے آدمی خدمتِ خلق کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے، اعتکاف اس سے بھی بری ہے، کیونکہ اس میں تمام طاعات کا جن پر معتکف قادر تھا، مگر اعتکاف کی وجہ سے نہ کر سکا ثواب ملتا ہے، پس مطلق خلوت اعتکاف کے برابر نہیں ہے، گو گناہوں سے بچنا اس میں بھی ممکن ہے۔

(وعظ: فی خیر مقدم، صفحہ نمبر: ٣٠٧ تا ٣٠٩، برکات رمضان جلد نمبر: ١٦)

معتکف کو تمام نیکیوں کا ثواب ملنے کی وجہ

حدیث میں جو آیا ہے:

(ھو أی المعتکف) یعکف الذنوب، ویجزی له من الحسنات کعامل الحسنات کلھا(١)

(معتکف تمام گناہوں سے رکا رہتا ہے اور تمام نیکیوں کا اس کو ثواب ملتا ہے۔)

الحسنات میں الف، لام عہد کا نہیں، جیسا اب تک سمجھا جاتا ہے، جس کی بناء تھی کہ اعتکاف میں خاص حسنات کا صدور ہوتا ہے، کل حسنات کا صدور خلافِ مشاہدہ ہے، بلکہ استغراق کا ہو سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ معتکف اپنے ایامِ اعتکاف میں گویا ہر نیکی کر رہا ہے، اس کو سب نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ جب انتظار

---

(١) حوالہ سابقہ

الصلوٰۃ کے حکم میں ہے [1] اور معتکف منتظرِ صلوٰۃ ہے تو وہ مصلی کے حکم میں ہوا اور صلوٰۃ ام العبادات ہے تو اس کا ادا کرنے والا گویا تمام عبادتیں کر رہا ہے، پس معتکف بحالت اور اعتکاف سب عبادتیں ادا کر رہا ہے۔ صاحبو! اس سے زیادہ اور کیا فضیلت ہوگی۔

(وعظ: احکام العشرۃ الأخیرۃ، صفحہ نمبر: ۳۱۰ جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

(۱) اوپر یہ بات ارشاد فرمائی کہ معتکف کو ایامِ اعتکاف میں ہر وقت وہی ثواب ملتا ہے جو کہ نمازی کو نماز میں ملتا ہے، دلیل اس کی یہ حدیث ہے "لا یزال احدکم فی الصلاۃ ما انتظر الصلاۃ. اخرجه البخاری فی صحیحه عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ مرفوعاً رقم الحدیث: ۶۴۷، کتاب الأذان باب فضل صلاۃ الجماعة.

باب فضائل القرآن
اشرف الکلام فی احادیث خیر الانام ﷺ
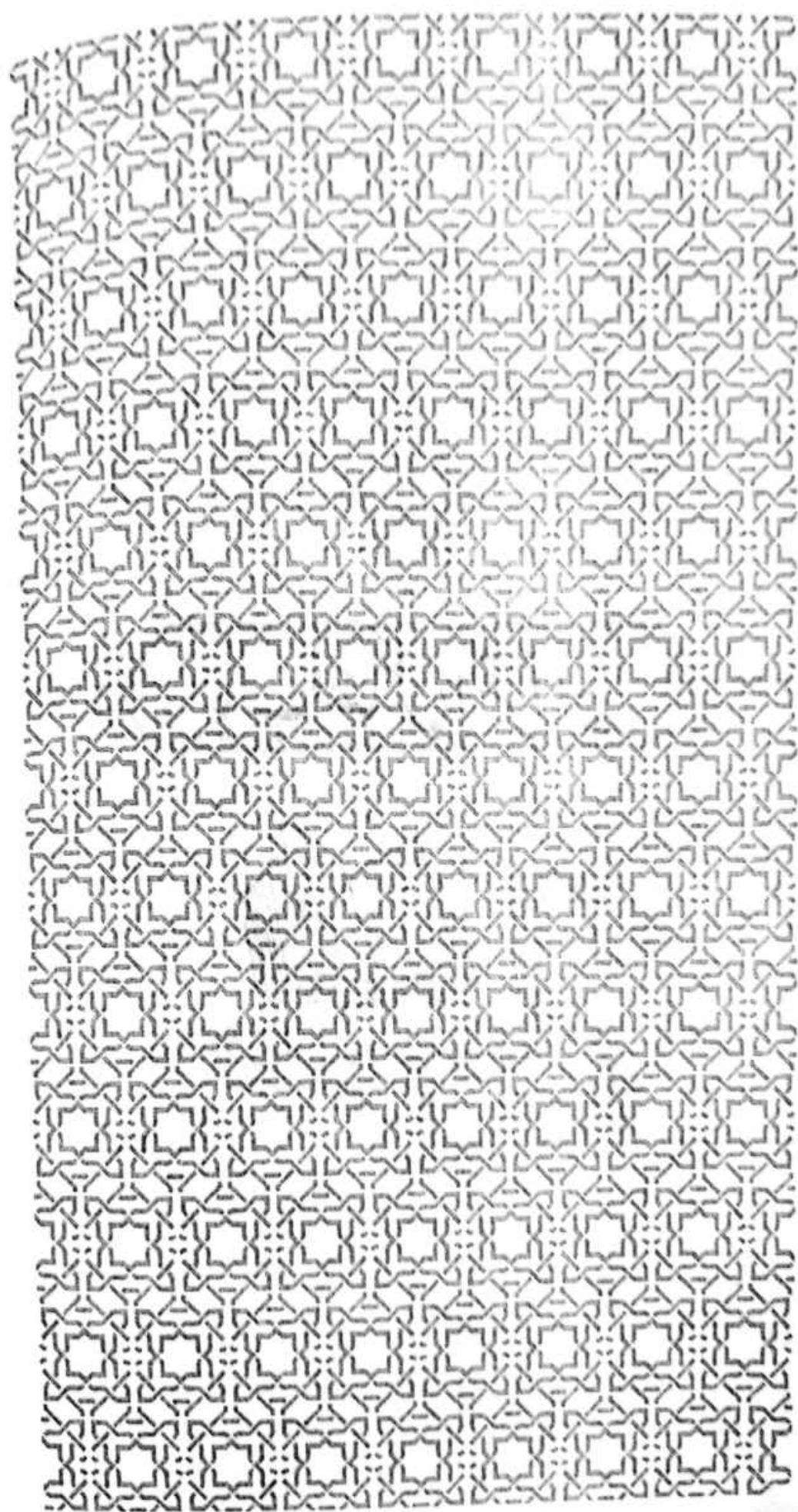
بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

باب فضائل القرآن

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا مقصد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سنانے سے حق تعالیٰ کو راضی کرنا تھا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ رات ہم نے تمہارا قرآن سنا تو اللہ تعالیٰ نے تم کو صوتِ داودی سے حصہ دیا ہے، اس پر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

لو علمت بك يا رسول الله ﷺ لحبرته لك تحبيرا[1]

یا رسول اللہ! اگر مجھے یہ خبر ہوتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن رہے ہیں تو میں اور زیادہ بنا بنا کر پڑھتا۔

اس جواب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار نہیں فرمایا جو کہ تقریر سکوتی ہے، تو اگر کسی

(۱) أخرجه مسلم فی الصحیح عن داود بن رشید، الا أنه لم یذکر قول أبی موسی، وأخرجه البخاری، مختصرا من حدیث برید بن عبد الله بن أبی بردة عن جده، وکذا أخرجه الامام البیهقی فی السنن الکبری، ولفظه: عن أبی بردة، عن أبی موسی قال: قال لی رسول الله ﷺ: "لو رأیتنی وأنا أسمع قراءتک البارحة، لقد أوتیت مزمارا من مزامیر آل داود" فقال: لو علمت لحبرته لک تحبیرا.

شخص کے لیے بنا سنوار کر قرآن پڑھنا مطلقاً ریاء میں داخل ہوتا تو حضرت ابوموسیٰ کی یہ تحبیر بھی ریاء میں داخل ہوتی اور ریاء حرام ہے، گو حضور ﷺ ہی دکھلانے کے واسطے ہو، کیونکہ ریاء حضور ﷺ کے سامنے بھی حرام ہے، کسی قاعدہ سے یہ تخصیص نہیں معلوم ہوتی کہ حضور ﷺ کے دکھلانے کے واسطے کام کرنا جائز ہے اور وہ ریاء میں داخل نہیں، بہر حال یہ تحبیر بھی ناجائز ہوتی، حالانکہ حضور ﷺ کو دکھلانا بالذات مقصود نہیں، بلکہ حضور ﷺ کے سنانے سے مقصود آپ ﷺ کی تطییب قلب کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کو راضی کرنا تھا۔

اور اس کی ایسی مثال ہے، جیسے کوئی شخص آئینہ میں سے محبوب کا جمال دیکھے تو مقصود آئینہ نہیں ہے، بلکہ اس واسطہ سے رویت جمال محبوب مقصود ہے، پس اسی طرح اگر قراء اس نیت سے بنا سنوار کر قرآن سنائیں کہ اس سے لوگوں کا دل خوش ہوگا اور مسلمانوں کا جی خوش کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے تو یہ ریاء میں داخل نہیں، بلکہ طاعت ہے تو جب ہر مسلمان کا راضی کرنا عین ارضاء حق ہے تو شیخ کا تو بہت زیادہ حق ہے۔

(وعظ: ارضاء الحق (۱)، صفحہ نمبر: ۴۸ تا ۴۹، تسلیم و رضا جلد نمبر: ۱۵)

الٓمٓ تین حرف ہیں، جن میں سے ہر ایک پر الگ اجر ملے گا

حضور ﷺ فرماتے ہیں:

لا اقول الم حرف، بل الف حرف، ولام حرف، ومیم حرف (۱)

تو دیکھیے! الف اور لام اور میم کو حرف فرمایا گیا، حالانکہ اصطلاحِ نحاۃ کے

(۱) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن عبدالله بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحديث: ۲۹۱۰ باب ماجاء فیمن قرأ حرفا من القران.

نزدیک حرف ہے اور الم میں جو الف ہے، وہ اسم ہے، مگر محاورہ یا اصطلاح شرع کے اعتبار سے یہ الف بھی حرف ہے، یہ ایسی اصطلاح ہے، جیسے عام محاورہ ہے، یہ محاورہ حضور ﷺ کے ارشاد کے موافق ہے، غرض شارع علیہ السلام کے کلام میں الف حرف ہی ہے، گو نحاۃ کے نزدیک اسم ہو، بعض اہلِ علم حدیث میں اس الف سے بھی مسمیٰ سمجھ گئے اور مسمیٰ بالالف مراد لیا، یعنی الف جو تام ہے حرف کا، اس میں جو تین جزو ہیں: الف، لام اور فاء، حدیث میں یہ الف مراد ہے اور اس پر محمول کر کے کہنے لگے کہ اس حساب سے الم میں نوے نیکیاں ہوئیں اور یہ محض تکلف ہے، اگر حساب بڑھانے کے لیے یہ توجیہ کی ہے تو میاں! وہاں کا تو تھوڑا بھی کافی ہے، اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہنچے وہاں
گرچہ کرتے ہیں بہت نالہ و فریاد ہم

اور ذوق سے اگر کام لیا جاتا تو صاف معلوم ہوتا ہے، اگر الف سے مسمیٰ مراد ہوتا تو حضور ﷺ اس طرح فرماتے، بل الف حرف، لام حرف، فاء حرف، یہ اسی طرح لام، حرف والف ومیم حرف ایسا ہی میم حرف ویا حرف ومیم حرف، جب آپ ﷺ نے اس طرح نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ مراد شارع علیہ السلام کی وہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو اور اگر اختصار کی وجہ سے تین ہی حرف کا بتلانا تھا اور پورے نو کو بیان فرمانا تطویل کی وجہ سے مدنظر نہیں تھا تو اسم اول ہی کے تین حرف بیان فرما دیتے، یہ کیا کہ ہر ایک سے ایک ایک حرف لیا گیا کہ الف سے الف لیا اور لام سے لام اور میم سے میم۔

(وعظ: رطوبۃ اللسان، صفحہ نمبر: ۱۶۷ تا ۱۶۸، جلد نمبر: ۲۲ ذکر و فکر)

کتاب الدعوات

اشرف الکلام فی اَحادیث خیر الأنام ﷺ
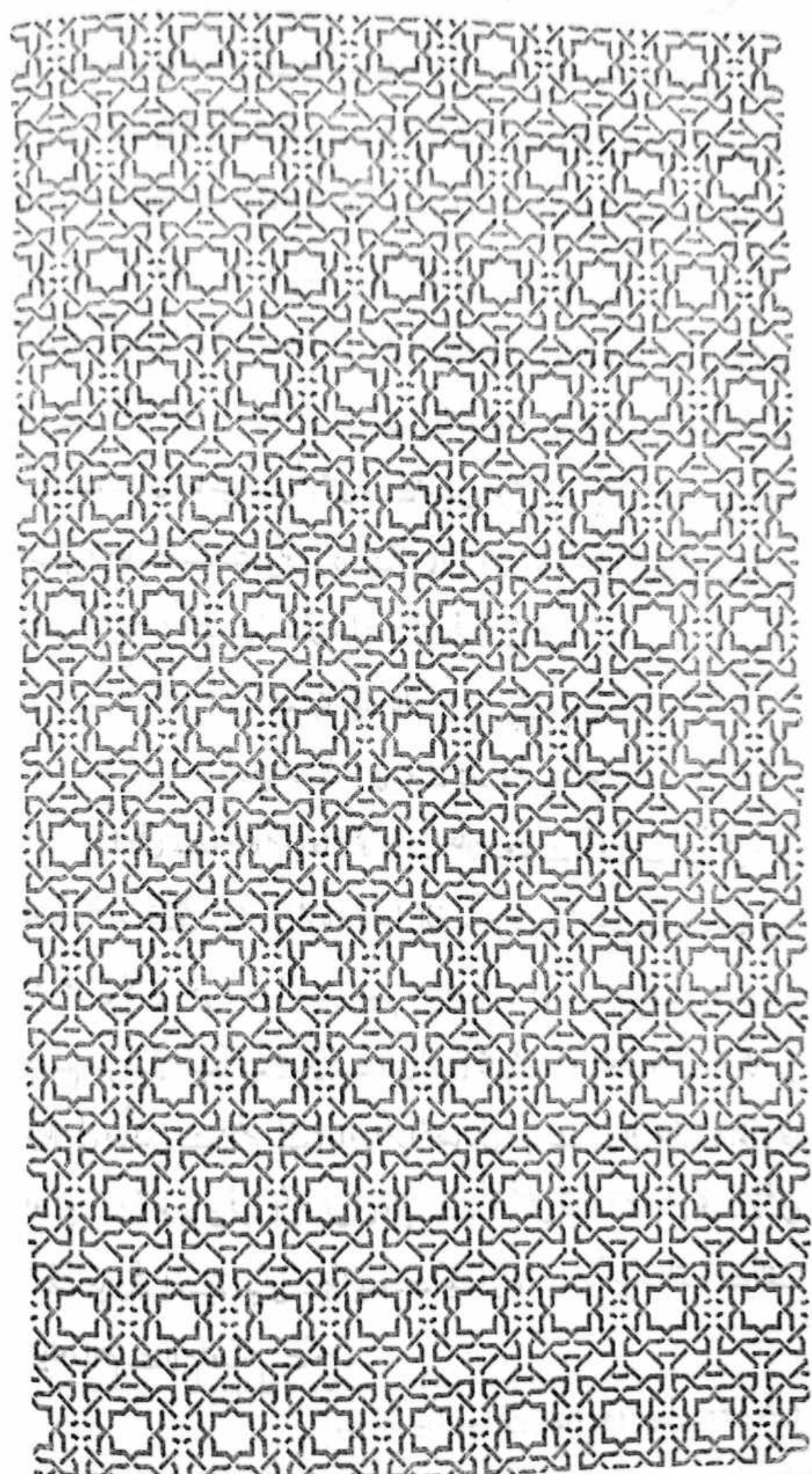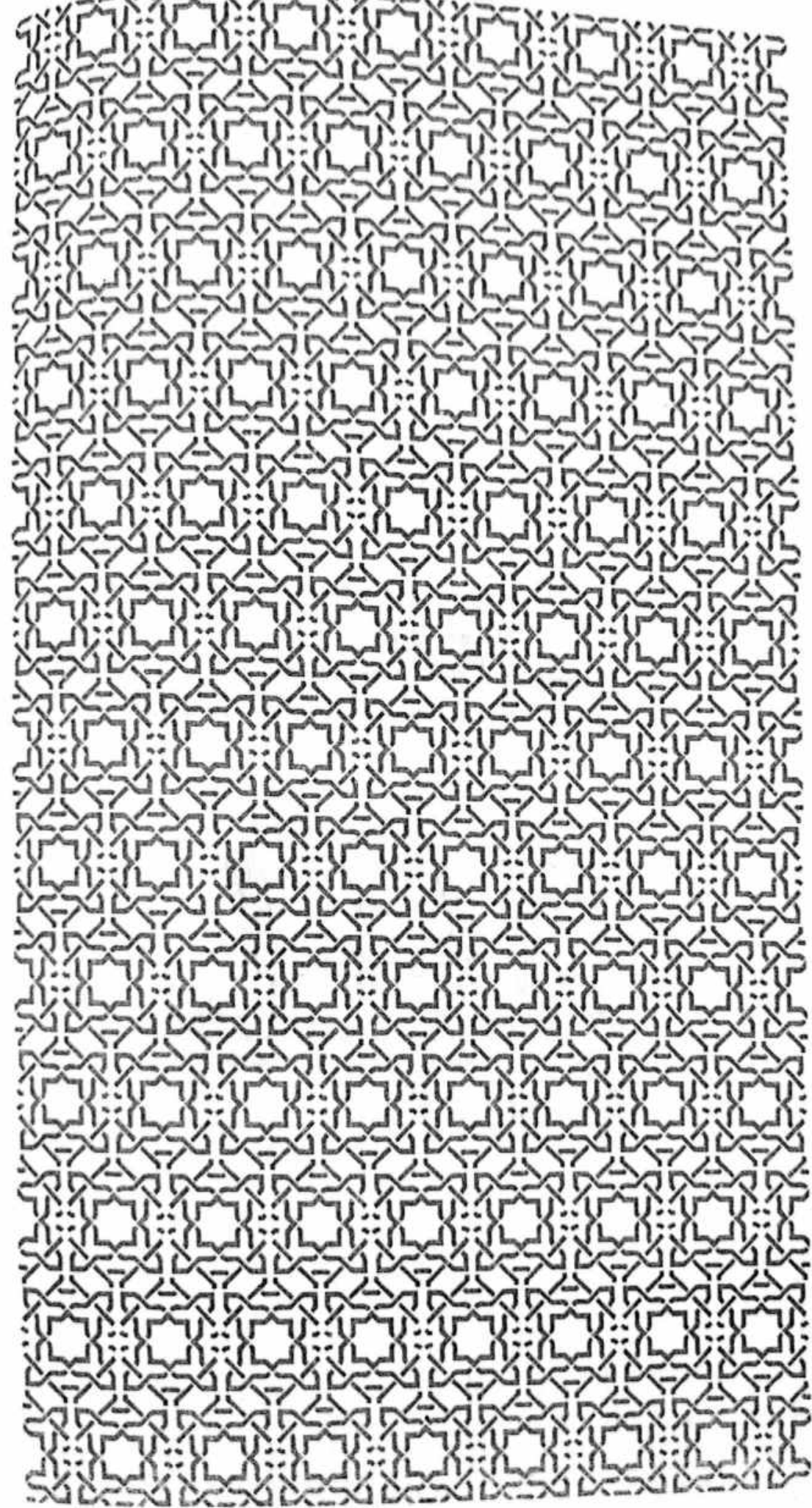
بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کتاب الدعوات

کھانا کھانے کے بعد دعاء میں وجعلنی مسلمین پڑھنے کی وجہ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ اَطۡعَمَنِیۡ وَسَقَانِیۡ وَجَعَلَنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ (۱)

خدا کا شکر ہے جس نے مجھ کو کھلایا اور پلایا اور مجھے مسلمانوں میں داخل کیا۔

کھانے کے میل میں اسلام پر شکر کی تعلیم فرمانے میں ایک نکتہ ہے، وہ یہ کہ اس میں اشارتاً بتلایا گیا ہے کہ تم ایسے نہیں ہو جو مستقلاً اسلام کا شکر ادا کرو، اس لیے بچوں کی طرح روٹیوں کے بعد شکر اسلام کی تعلیم فرمائی کہ میاں! اور کسی وقت شکر نہ کرو، تو روٹیاں کھانے بعد تو اسلام کا شکر ادا کر لیا کرو، کیونکہ اس وقت ایک ظاہری نعمت تمہارے سامنے ہوتی ہے، اس کا شکر تو تم طبعاً ادا کرو گے ہی، اس کے ساتھ ساتھ نعمت اسلام کا شکر بھی ادا کر لو، جس سے یہ سب کھانا پینا بھی نعمت ہو گیا اور اسلام کی بدولت آخرت میں بھی تم کو یہ نعمتیں نصیب ہوں گی، اگر نعمت اسلام نہ ہوتی تو کھانا پینا سب وبال جان ہوتا اور اس کی لذت چند روزہ ہوتی، پس روٹیوں کے ساتھ شکر اسلام تعلیم فرمانا ایسا ہے، جیسے بچوں کو تباشہ میں دوا دیتے ہیں۔ افسوس

---

(۱) أخرجه الإمام أبو داود فی سننه عن أبی سعید الخدری ﷺ مرفوعا، رقم الحدیث: ٣٨٥٠ باب ما یقول الرجل اذا طعم، وکذا أخرجه الامام الترمذی فی سننه، رقم الحدیث: ٣٤٥٧ ولفظه: الحمد لله الذی أطعمنا وسقانا وجعلنا مسلمین.

ہم ایسے غافل ہیں کہ حضور ﷺ ہم کو بچوں کی طرح بھلا پھسلا کر شکر اسلام کی تعلیم فرما رہے ہیں۔

(وعظ: محاسن اسلام، صفحہ نمبر: ۲۴۰، محاسنِ اسلام جلد نمبر: ۱۲)

نفس پر مشقت ڈالنا مطلقا محمود نہیں

حدیث میں حضور ﷺ کا دستور العمل تو یہ آیا ہے:

ماخیر رسول اللہ ﷺ بین أمرین الا اختار ایسر ھما(۱)

کہ حضور ﷺ کو اگر ایک امر میں دو راستوں کا اختیار دیا جاتا تھا تو آپ ﷺ سہل کو اختیار فرماتے تھے، یعنی طرق مقاصد میں مشقت کو اختیار نہ فرماتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفس پر مشقت ڈالنا مطلقا محمود نہیں، مگر لوگ نفس پر مصیبت ڈالنے ہی کو مقصود و محمود سمجھتے ہیں، یعنی وہ صورت اشد کو ہی مطلقا افضل سمجھتے ہیں۔

چنانچہ ایک صاحب اسی خیال کے تھے، وہ کہتے تھے کہ جس عمل میں مشقت ہو وہی افضل ہے، میں نے کہا یہ مطلقاً نہیں، بلکہ مقاصد کے ساتھ مخصوص ہے اور پھر اس کے بھی حدود ہیں اور وسائل میں تو سہل صورت مطلقًا افضل ہے، وہ نہ مانتے تھے، میں نے کہا بہت اچھا، پھر وضو کے لیے پانی لانے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ تھانہ بھون کے کنویں سے لایا جاوے، دوسرے یہ کہ جلال آباد و لوہاری سے لایا جاوے، تو آپ یہاں سے پانی لے کر وضو نہ کریں، بلکہ جلال آباد یا لوہاری سے لائیں، کیونکہ اس میں مشقت ہے اور مشقت کا کام افضل ہے، اس مثال کے بعد انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم

---

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن عائشة رضی عنها مرفوعاً.

کرلیا۔ پس یاد رکھو کہ مشقت میں مطلقا اجر نہیں۔

(وعظ: الاستقامت، صفحہ نمبر: ۳۶۹، دعوت وتبلیغ جلد نمبر: ۱۳)

حدیث کے ایک جملہ میں خوف کی حد اور ایک جملہ میں شوق کی حد بیان کی گئی ہے

حدیث کے ایک جملہ سے میں نے خوف کی حد سمجھی ہے اور ایک سے شوق کی۔ حدیث میں آتا ہے:

اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ (۱)

(دعا میں فرماتے ہیں کہ) اے اللہ! میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں کہ جو میرے اور میرے گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے۔

اس میں حضور ﷺ نے خوف کے لیے ایک حد بیان فرمائی ہے اور اسی حد کے موافق حصولِ خوف کی دعا ہے، حالانکہ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جب خوف مقصود ہے تو جتنا زیادہ ہو اتنا ہی اچھا ہے، مگر غور کرنے اس قید کا نفع یہ معلوم ہوا کہ اگر خوف حد سے زیادہ ہوتا ہے تو تعطل کا سبب ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس رحمتِ الٰہی سے مایوسی ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی ناشکری تو ابتداء ہی میں ہونے لگتی ہے، جس شخص پر خوف کا غلبہ ہوتا ہے، وہ اپنے اعمال کو حقیر اور لاشے سمجھتا ہے اور کہتا ہے اجی! میں کیا نمازی ہوتا، میری تو نماز اور عدم نماز برابر ہے۔

اسی طرح شوق میں حضور ﷺ نے حدود بیان فرمائی ہیں:

---

(۱) أخرجه الامام الترمذی رحمه الله فی سننه عن ابن عمر رضی الله عنهما، رقم الحديث: ۳۵۰۲، کذا أخرجه الامام النسائی رحمه الله فی عمل اليوم والليل، رقم الحديث: ۴۰۱

اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ الشوقَ إلی لقائِكَ فی غیرِ ضراءَ مُضِرَّۃٍ، ولا فتنۃٍ مُضِلَّۃٍ (۱)

اس میں دو قیدیں ہیں: کہ اے اللہ! مجھے ایسا شوق عطا ہو جس میں ضرار مضرہ نہ ہو، (یعنی ضرر ظاہری) اور فتنہ مضلہ نہ ہو (یعنی ضرر باطنی) کیونکہ غلبہ شوق میں کبھی جسم کو بھی ضرر پہنچ جاتا ہے کہ شوق میں بے چین ہو کر گھلنے لگتا ہے اور باطنی ضرر بھی ہو جاتا ہے کہ بعض لوگ حدِ ادب سے نکل جاتے ہیں، جیسے غلبہ شوق میں بعض عشاق محبوب کے پیروں میں گر پڑتے ہیں اور اس کی ٹانگ کھینچ لیتے ہیں، بعضے زبردستی اس کا ہاتھ کھینچ کر چومتے ہیں، بعض دفعہ باوجود کسی قابل نہ ہونے کے چند حالات وکیفیات عطا ہونے سے اپنے کو کامل سمجھنے لگتے ہیں۔

اہل اللہ ان واقعات کو جانتے ہیں، پھر حدود سے آگے نکلنے پر ان سے مؤاخذہ ہوتا ہے، اس وقت سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ہماری فلاں حرکت کی سزا ہے، چنانچہ ایک بزرگ نے دعا کی کہ اے اللہ! میں تو دو روٹیاں اس وقت اور دو روٹیاں اس وقت مانگتا ہوں، اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگتا، بس ان پر یہ بلا نازل ہوئی کہ چوروں کے ساتھ شبہ میں پکڑے گئے اور جیل خانہ میں دونوں وقت دو، دو روٹیاں ملنے لگیں، بہت پریشان تھے کہ کس گناہ میں پکڑا گیا؟ الہام ہوا کہ تم نے دو روٹیاں مانگی تھیں عافیت کی قید نہیں لگائی تھی، یہ اس کی سزا ہے، اب توبہ کی اور عافیت کی دعا کی، فوراً حاکم اعلیٰ کا حکم جیلر کے نام پہنچا کہ فلاں شخص غلطی سے پکڑے گئے، فی الفور رہا کر دیئے جاویں، تب چھوٹے۔ بعض دفعہ تو قیود نہ لگانے پر

(۱) أخرجه الامام الطبرانی فی المعجم الکبیر عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث: ۹۹۴۲، وکذا أخرجه أبو یعلی مسنده، رقم الحدیث: ۱۶۶۴

مؤاخذہ ہوتا ہے، جب وہ ضروری ہوں اور بعض دفعہ قیود لگانے پر مؤاخذہ ہوتا ہے، جب وہ فضول ہوں۔

چنانچہ ایک صحابی زادے نے اس طرح دعا کی تھی:

اَللّٰھُمَّ إِنِّی أسأَلُكَ الْقَصْرَ الأَبْیَضَ عن یَمینِ الْجَنَّۃِ (۱)

(اے اللہ! میں سفید محل مانگتا ہوں جو جنت کی دائیں طرف ہو)

ان کے والد صاحب جو صحابی تھے فرمایا:

یابنی! سل اللہ الجنۃ، ولا تعتد فی الدعاء، انی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان اللہ لا یحب المعتدین فی الدعاء (۲)

صاحبزادے! اللہ تعالیٰ سے جنت مانگو اور دعا میں حد سے تجاوز نہ کرو، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعاء میں حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتے۔

تو دعاء کے لیے بھی ایک حد ہے، شوق کے لیے ایک حد ہے۔

(وعظ: الاستقامت، صفحہ نمبر: ۱۷۳ تا ۱۷۴، دعوت وتبلیغ، جلد نمبر: ۱۳)

فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعَاصِیْكَ (۳)

(۱ و ۲) أخرجه الامام أبو داود رحمه الله فی سننه عن عبد الله بن مغفل انه سمع من ابنه یقول "اللهم انی أسلک القصر الأبیض، عن یمین الجنة اذا دخلتها"، رقم الحدیث: ۹۶ باب الاسراف فی الماء، سنن ابن ماجه، رقم الحدیث: ۸۶۴

(۳) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن ابن عمر رضی اللہ عنہما، رقم الحدیث: ۳۵۰۲، کذا أخرجه الامام النسائی رحمه الله فی عمل الیوم واللیلة، رقم الحدیث: ۴۰۱.

یعنی اے اللہ! میں آپ کے خوف میں سے بس اس قدر مانگتا ہوں جس سے آپ اور ہمارے گناہوں کے درمیان حائل ہو جاوے، یعنی گناہوں کو روک دے، سو حد اس لیے لگائی کہ خوف سے بعض لوگ جسماً یا دیناً ہلاک ہو گئے ہیں۔ ایک شخص کو کان پور میں، میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ شدت خوف کی وجہ سے مایوس ہو کر قریب تھا کہ نماز روزہ ہی چھوڑ دے اور لیجیے دیکھئے! شوق ذوق بہت محبوب و مطلوب چیز ہے، مگر اس کی نسبت بھی ارشاد ہے:

وَاَسْئَلُكَ الشَّوْقَ إلى لقائِكَ في غيرِ ضراءَ مُضِرَّةٍ، ولا فتنةٍ مُضِلَّةٍ

یعنی اے اللہ! مجھے ایسا شوق عطا ہو جس میں مصیبت آزار دینے والی اور بلا گمراہ کرنے والی نہ ہو، یعنی شدت شوق کے بعض اوقات میں دو اثر ہوتے ہیں یا تو اہل شوق ہی پگھل جاتے ہیں، نہ کھانے کے رہتے ہیں، نہ سونے کے، ہر وقت اسی طرف مشغول رہتے ہیں اور بیمار ہو کر بعض اوقات جان تک نوبت آ جاتی ہے، من غیر ضراء مضرۃ (بلا آزار دینے والی سے) میں اس سے احتراز ہے اور یا یہ اثر ہے کہ گستاخ و بے ادب ہو کر گمراہی اور کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے، اس کے متعلق ارشاد فرمایا و لا فتنۃ مضلۃ (بلا آزار دینے والی سے) دنیا میں بھی اس دوسرے اثر کا نمونہ موجود ہے، اگر کسی نوکر چاکر کو زیادہ منہ لگاؤ تو اگر وہ بھلا مانس ہے تو اس پر زیادہ عنایت کرنا اس کو مسخر کر لینا ہے، اگر وہ پہلے ایک گھنٹہ خدمت کرتا تھا تو اب چار گھنٹے کرے گا اور اس اندر خباثت ہے تو اور زیادہ منہ چڑھے گا، حتیٰ کہ نوبت اس کی پہنچے گی کہ آقا اس کو نکال کر باہر کرے گا۔

(وعظ: الجناح، صفحہ نمبر: ۹۵ تا ۹۶، مفاسد گناہ جلد نمبر: ۱۸)

اَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ

اے اللہ! میں آپ سے آپ کا اتنا خوف مانگتا ہوں جس سے مجھ میں معاصی کے درمیان میں آڑ ہو جاوے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خوف علی الاطلاق مقصود نہیں، کیونکہ مقاصد کا ہر درجہ مطلوب ہوتا ہے، کوئی درجہ غیر مقصود نہیں ہوتا اور حدیث کی اس قید سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف ایک خاص حد تک مطلوب ہے، اس سے آگے مطلوب نہیں، وہ خاص حد یہ ہے کہ جس سے معاصی میں رکاوٹ ہو جاوے۔ حضور ﷺ نے اس حدیث میں ماتحول بہ بیننا وبین معاصیك کی قید بڑھا کر ایک ایسی بات بتلائی ہے جو سالکین کو سالہا سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوتی ہے، مگر آپ ﷺ نے دو لفظوں میں اس کو حل فرما دیا، وہ بات یہ ہے کہ بظاہر یہ بات سمجھ میں آیا کرتی ہے کہ خدا کا خوف تو اچھی چیز ہے، پس وہ جتنا بھی زیادہ ہو، اچھا ہے، لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس کا حد سے بڑھ جانا مضر ہو جاتا ہے۔

اول تو زیادتِ خوف سے صحت خراب ہو جاتی ہے، ہر وقت انسان رنج و غم ہی میں رہتا ہے اور صحت کے اختلال سے اعمال میں کوتاہی ہونے لگتی ہے۔

دوسرے صاحبِ خوف کو دیکھ کر دوسرے مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں کہ بس صاحبِ خدا کو راضی کرنا بڑا مشکل ہے، ہر وقت رنج و غم میں گھلنا پڑتا ہے۔

تیسرے جب خوف کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے تو یہ شخص رحمتِ الٰہی سے مایوس ہو جاتا ہے، یاس تک نوبت پہنچ جاتی ہے جو کہ کفر ہے اور مایوس ہونے سے وہ بالکل معطل و بیکار ہو جاتا ہے، سمجھتا ہے کہ جب میرے لیے کچھ نہیں ہو سکتا اور میں رحمتِ حق کے قابل ہی نہیں ہوں تو پھر اس ساری محنت سے کیا فائدہ؟ بس سب کام چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

(وعظ: الکمال فی الدین، صفحہ نمبر: ۱۷۸ تا ۱۷۹، جلد نمبر: ۳ دین و دنیا)

تقویٰ کا محل قلب ہے

حدیث میں ہے:

ألا إن التقوىٰ ههنا، و أشار إلىٰ صدره [1]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ سن لو کہ تقویٰ یہاں ہے، یعنی تقویٰ کا محل قلب ہے، ایک مقدمہ تو یہ ہوا، اس کے ساتھ دوسری حدیث کو ملایئے:

الا ان فی الجسد مضغة، اذا صلحت صلح الجسد كله، و اذا فسدت فسد الجسد كله، الا و هی القلب [2]

یعنی جسم میں ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوجاتا ہے تو تمام بدن درست ہوجاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے، سن لو! وہ قلب ہے۔ اس حدیث سے اصلاح قلب کا صلاحیت کاملہ ہونا ثابت ہے اور پہلی حدیث سے یہ معلوم ہو چکا کہ تقویٰ کا اصل محل اور موصوف قلب ہے اور اس سے لازم آتا ہے کہ تقویٰ سے اول اصلاح قلب کی ہوتی ہے، محل تقویٰ اس حدیث میں اس لیے فرمایا کہ تقویٰ بمعنی الاجتناب عن المعصية کا سبب خوف خداوندی ہے اور ظاہر ہے کہ خوف کا اصل محل قلب ہے۔

(وعظ: الکمال فی الدین، صفحہ نمبر: ۱۷۹ تا ۱۸۰، جلد نمبر: ۳ دین و دنیا)

---

(۱) أخرجه الامام مسلم فی صحيحه عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحديث: ۲۵۶۴ باب تحريم ظلم مسلم، وخذله، واحتقاره، ودمه، وعرضه، وماله، سنن الترمذی رقم الحديث: ۱۹۲۷، مسند احمد رقم الحديث: ۷۷۲۷

(۲) أخرجه الشيخان فی صحيحيهما عن النعمان بن بشير رضی اللہ عنہ مرفوعا.

حق تعالیٰ کا احکم الحاکمین ہونے کا مقتضا ہیبت ہے

و من علم لا ینفع، و قلب لا یخشع، و من نفس لا تشبع [(۱)]

یعنی اے اللہ! میں پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے اور ایسے دل سے جس میں خشیت نہ ہو اور ایسے نفس سے جو شکر سیر نہ ہو۔ یہاں تک دعا مقفٰی چلی آتی ہے، اگلا جملہ ہے "و من دعوۃ لا یستجاب لہا" (اور ایسی دعا سے جو قبول نہ ہووے) یہاں قافیہ چھوڑ دیا، میں جب حدیث پڑھاتا تھا تو یہ وسوسہ ضرور ذہن میں آتا تھا کہ یہ جملہ بھی مقفٰی ہونا کیوں نہ ہوا؟ اس کا مقتضی کچھ مشکل نہ تھا، ہم جیسے بدلیاقت آدمی بھی چاہیں تو قافیہ ملالیں، مثلا یہ کہہ دیتے ہیں "و من دعوۃ لا تسمع" (ایسی دعا سے جو سنی نہ جائے)، لیکن وجہ یہ ہے کہ نبی کا کوئی فعل تعلیم سے خالی نہیں، اس میں تعلیم ہے کہ تصنع سے بچنا چاہیے، خصوصا دعا میں، کیونکہ دعا حق تعالیٰ سے عرض حال اور سوال کا نام ہے، حق تعالیٰ احکم الحاکمین ہیں، حاکم ہونے کا مقتضا ہیبت ہے، ہیبت کے مقام پر کسی کو آپ نے قصدا تکلفا مقفٰی عبارت بولتے ہوئے سنا ہوگا، اس میں تعلیم ہوگی کہ ضرورت کو خواہ مخواہ تصنیف نہ کرو، اختراعی ضرورت کو آگ لگاؤ، وہ کام کرو جس کا حکم ہے، خرچ اتنا مت بڑھاؤ جس کے لیے گناہ کرنا پڑے۔

(وعظ: جلاء القلوب، صفحہ نمبر: ۲۹۷، جلد نمبر: ۲۲ ذکر و فکر)

---

(۱) أخرجه الامام مسلم فی صحیحه عن زید بن أرقم رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۷۲۲ باب التعوذ من شر ما عمل ومن شر مالم یعمل)، السنن للامام الترمذی، رقم الحدیث: ۳۴۸۲، السنن للامام أبی داود، رقم الحدیث: ۱۵۴۸

جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہے

حضور ﷺ فرماتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسأَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ (۱)

(اے اللہ! میں آپ سے جنت مانگتا ہوں اور پھر وہ چیز مانگتا ہوں جو جنت سے نزدیک کرنے والی ہو، قول و عمل)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہے، کیونکہ حضور ﷺ کی یہی حالت تھی تو سمجھ لیجئے کہ ارفع تو وہی حالت ہے کہ محض رضائے محبوب کے لیے عمل کیا جائے، رہا حضور ﷺ کا جنت مانگنا، سو اس کے متعلق وہ بات یاد کر لیجئے جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ عاشق کو محبوب کی چیزوں سے بھی محبت ہوا کرتی ہے، پس آپ ﷺ کا جنت مانگنا ویسا نہیں ہے، جیسا ہمارا مانگنا، تو ہم جنت اس لیے مانگتے ہیں کہ وہاں ہم کو آرام ملے گا، حوریں ملیں گی، خوب مزے اڑائیں گے، غرض ہم کو حظِ نفس مطلوب ہے اور حضور ﷺ کا جنت مانگنا اس بناء پر تھا کہ وہ خدا کی چیز ہے اور خدا تعالیٰ نے اس کے مانگنے کا امر فرمایا ہے، جب محبوب خود یہ چاہے کہ مجھ سے میری چیز بھی مانگو تو اس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہے، اس وقت استغناء مناسب نہیں۔

---

(۱) أخرجه الامام ابن ماجه فى سننه عن عائشة رضى الله عنها مرفوعًا، رقم الحديث: ۳۸۴۶ باب الجوامع فى الدعا، وقال البوصيري فى "مصباح الزجاجة" ١٤١/٤: فى اسناده مقال. وأم كلثوم هذه لم أر من تكلم فيها. وعدها جماعة فى الصحابة. وفيه نظر لأنها ولدت بعد موت أبى بكر. وباقى رجال الاسناد ثقات. وكذا أخرجه الامام احمد فى مسنده، رقم الحديث: ۱۴۸۳

چوں طمع خواہد زمن سلطاں دیں
خاک برفرق قناعت بعد ازیں

اگر سلطان دین مجھ سے طمع کی فرمائش کرے تو اس کے بعد قناعت کے سر پر خاک ڈال دوں گا۔

اس لیے آپ ﷺ نے جنت مانگی، اور اس اسے استغناء برتا، عارف کامل خدا تعالیٰ کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغناء ظاہر نہیں کرسکتا، چہ جائیکہ جنت سے جو کہ اجل النعم ہے، ہاں کوئی ابن الفارض جیسا صاحبِ حال ہو تو وہ بلا سے استغناء ظاہر کرے اور ایسے لوگ غلبہ حال سے معذور ہوں گے، ورنہ معرفت کا مقتضاء یہی ہے کہ جیسے محبوب سے رضائے محبوب طلب کی جاتی ہے، اسی طرح اور جس چیز کا مانگنا اسے پسند ہو، وہ بھی مانگے اور یہ بھی درحقیقت طلب رضا ہی ہے، کسی دوسری چیز کی طلب نہیں۔ دوسرے حضور ﷺ جنت کا سوال اس بناء پر بھی کرتے تھے کہ وہ محل دیدار ہے تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا، بلکہ دیدارِ محبوب کا سوال تھا، اسی کو کہتے ہیں:

عاشقانِ جنت برائے دوست می دارند دوست
(عاشقین جنت کو محبوب کی وجہ سے دوست رکھتے ہیں)

طلبِ جنت کی متعدد نیتیں

اور ایک بات اس سے بھی باریک ہے، وہ یہ کہ بعض دفعہ جنت کی طلب اس نیت سے بھی نہیں ہوتی کہ وہاں محبوب کا دیدار ہوگا، بلکہ محض اس خیال سے تمنا کی جاتی ہے کہ ہماری یہ شان تو کہاں جو دیدار کی تمنا کریں؟ تو اگر جائے دیدار ہی کو دیکھ لیں تو

بڑی قسمت ہے۔

(وعظ: ذم النسیان، صفحہ نمبر: ۴۰۱ تا ۴۰۲، جلد نمبر ۲۲: ذکر وفکر)

روزی طلب کرنے کے لیے دعا اور تدبیر دونوں ضروری ہیں

واجملوا فی الطلب وتوکلوا علیه [(۱)]

(میانہ روی اختیار کرو اور اس پر بھروسہ رکھو)

کے کہ تدبیر اور مباشرت اسباب میں اختصار ہو، اجملوا اس کی طرف اشارہ ہے اور نظر تقدیر پر ہو تو کلوا علیہ میں اس کی طرف اشارہ ہے اور درحقیقت اگر روزی صرف سعی وتدبیر پر ہی موقوف ہوتی تو اکثر آدمی حکمت وتدبیر سے استغناء حاصل کر سکتے تھے، مگر غناء اور تمول دیکھا جاتا ہے کہ حکمت اور تدبیر اور سعی پر موقوف نہیں، بلکہ بکثرت دیکھا گیا ہے کہ ایک معمولی آدمی جو دو آنے، تین آنے کی مختصر مزدوری کیا کرتا تھا، چند سال بعد وہ لکھ پتی ہو گیا۔

اگر غنا تدابیر اور سعی بلا تقدیر حاصل ہو سکتا ہے تو ہم ایک دوسرا آدمی منتخب کرتے ہیں جو قوت اور ہمت رائے وتدبیر میں اس سے زیادہ ہو اور مدت بھی اس کے لیے دوگناہ وہ تجویز کرتے ہیں اور اس پہلے کو دو آنے روزانہ ملتے تھے، ہم اس کو چار آنے یومیہ دیتے ہیں اور اس پہلے شخص کا تمام کارنامہ اس کو دیئے دیتے ہیں، پھر ہمیں دیکھیں گے کہ اس پہلے کے برابر یا اس کے قریب مضاعف مدت میں کما سکتا ہے،

---

(۱) أخرجه الامام ابن ماجه فی سننه عن أبی حمید الساعدی رضی الله عنه مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۱۴۲ باب الاقتصاد فی طلب المعیشة) ولفظه: قال رسول الله ﷺ: أجملوا فی طلب الدنیا، فان کلا میسر لما خلق له)، المستدرك علی الصحیحین للحاکم، رقم الحدیث: ۲۱۳۳ وصححه ووافقه الذهبی فی "التلخیص" وأخرجه ابن ماجه أیضاً عن جابر بن عبدالله بلفظ: یاایها النا[illegible] الله، أجملوا فی الطلب.. اهـ رقم الحدیث (۲۱۴٤).

ہرگز نہیں! ترقی کے اسباب اور تدابیر بہت قومیں جانتی ہیں، مگر ترقی وہی قومیں کرتی ہیں کہ جن کی تدبیر اور سعی کے ساتھ تقدیر بھی مساعدت کرتی ہے، ورنہ ان سے دگنی محنت کرتے ہیں اور افلاس نہیں جاتا۔

اصل یہ کہ نہ تو نرے اسباب پر مدار ہے، بلکہ تقدیر اور مشیت کی موافقت شرط ہے اور نہ یہ کارخانہ اسباب بالکل معطل ہے کہ اس کو چھوڑ کر صرف دعا سے ہی کام لیا جائے، افراط اور تفریط دونوں کو چھوڑیں، اس طرح سے کہ اسباب کو بھی اختیار کریں، کیونکہ اس میں بھی اظہار ہے عبدیت اور افتقار الی اللہ کا اور اسباب کے بھروسے سے دعا سے بھی غفلت نہ کی جائے۔

(وعظ: مہمات الدعاء (حصہ دوم) صفحہ نمبر:۲۹۹، جلد نمبر ۷: حقیقت عبادت)

دنیاوی ہستی قربِ خداوندی کے لیے حجابِ اعظم ہے

دنیوی وجود کہ وہ تو بالکل ہی ناقص ہے جس کو کالعدم سمجھ کر فرمایا گیا ہے:

لاعیش الا عیش الآخرۃ (۱)

یعنی زندگی ہے تو آخرت کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی ہی نہیں ہے تو یہاں کی ہستی نہایت ضعیف ہے اور بوجہ ضعف کے متحمل اس قرب کے بھی نہیں جو آخرت میں ہوگا، یعنی رویت اور یہی نکتہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا ارنی، یعنی اے اللہ! مجھے اپنا دیدار دکھا دیجئے تو حق تعالیٰ نے جواب دیا لن ترانی جس کے معنی یہ ہیں کہ تم نہیں دیکھ سکتے، یوں نہیں فرمایا لن اری کہ میں نہیں دیکھا جا سکتا، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ نہیں ہے کہ ادھر سے قابلیت دیکھے جانے کی نہیں ہے، بلکہ ادھر سے استعداد دیکھنے کی نہیں ہے، اسی کو میں نے یہی کہا تھا کہ حجاب ادھر سے نہیں،

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن أنس بن مالك رضي الله عنه مرفوعا.

بلکہ ادھر سے ہے تو ہستی دنیوی اس قدر ضعیف ہے کہ اس میں استعداد نہیں ہے، رویت کی اور آخرت میں قوت بڑھادی جاوے گی، لہٰذا دیکھ سکیں گے، حاصل یہ کہ حق تعالیٰ کی طرف سے قرب ہر وقت ہے، لیکن ہستی دنیاوی حجاب اعظم ہے، آخرت میں یہ حجاب کم ہو جاوے گا، اس لیے قوت زیادہ ہوگا۔

(وعظ: السلام التحقیقی، صفحہ نمبر: ۲۳۴ تا ۲۳۵، جلد نمبر ۳۱ رحمت دو عالم ﷺ)

مسئلہ توحید بلا مسئلہ رسالت کے پورا نہیں ہوسکتا

خدائے تعالیٰ کی شان یہ ہے انت کما اثنیت علی نفسك [1] یہ سید العارفین جناب رسول اللہ ﷺ کا مقولہ ہے، فرماتے ہیں کہ اے اللہ! آپ خود ہی اپنی ذات وصفات کو جانتے ہیں، ہم نہیں جان سکتے اور یہ بطور مبالغہ نہیں ہے، بالکل سچی بات ہے، ذات وصفات واجب تعالیٰ کا علم ممکن کو ہو ہی نہیں سکتا، اپنا علم انہیں کو ہے، اگر کوئی عقل سے کچھ دریافت کرنا چاہے گا تو قیاس الغائب علی الشاھد ہوگا، لیکن ان کی کوئی نظیر نہیں تو بہت سے بہت یہ ہوگا کہ سامان دنیا پر قیاس کریں گے کہ ان کی بھی قدرت اور علم اور دیگر صفات ایسی ہی ہوں گی اور یہ بات کہ ان کی قدرت عام اور علم محیط سے کوئی چیز خارج نہیں، یہ بلا وحی کے ثابت نہیں ہوسکتی تو خدا کی معرفت عقل سے جو کچھ ہوتی بھی، وہ بالکل ناقص ہوتی، چنانچہ جن لوگوں نے وحی سے استفادہ نہیں کیا اور اپنی عقل کے زعم میں رہے، انہوں نے الٰہیات میں ایسی غلطیاں کی ہیں جن پر آج اہل حق کے بچے بھی ہنستے ہیں، جب تک وحی نہیں تھی، وہ

---

(۱) أخرجه الامام مسلم فی صحیحه عن أبی هریرة عن عائشة رضی الله عنها مرفوعا، رقم الحدیث: ۴۸۶ باب ما یقال فی الرکوع والسجود، والسنن للامام الترمذی، رقم الحدیث: ۳۴۹۳، والسنن للامام أبی داود، رقم الحدیث: ۸۷۹

لوگ بڑے عقلمند اور حکیم مانے جاتے تھے، لیکن وحی کے آنے پر ان کی قلعی کھل گئی کہ کیسی فاش غلطیوں میں مبتلا تھے، غرض خدائے تعالیٰ کی معرفت بلا اسی طرف کی خبر کے اور بلا توسط واسطہ کے جس کو رسول کہتے ہیں، نہیں ہوسکتی، اگرچہ خبر کے بعد کنہ اس کی مدرک نہیں، مگر خبر سے اتنا تو ہوا کہ وجہ تو اس کی مدرک ہوئی (یعنی علم بالوجہ تو ہوگیا) اجمالا اتنا تو معلوم ہوگیا کہ خدائے تعالیٰ وہ ہے جس کی قدرت اور علم سے کوئی چیز خارج نہیں، بلا وحی اور بلا رسول کے اتنا بھی معلوم نہیں ہوسکتا، یہ راز مسئلہ رسالت کی ضرورت کا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ توحید بلا مسئلہ رسالت کے پورا نہیں ہوسکتا۔

(وعظ: السوق الی الشوق، صفحہ نمبر: ۹۳، جلد نمبر: ۲۴ موت وحیات)

حضور ﷺ کی تواضع کا مقام

آپ ﷺ دعا میں فرماتے تھے:

اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَّأَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ (۱)

اے اللہ! مجھے زندگی میں بھی مسکین رکھئے اور موت بھی مسکینی کی حالت میں دیجئے، قیامت میں بھی مساکین کی جماعت میں اٹھائیے۔

سبحان اللہ! کس قدر آپ ﷺ کو مساکین سے محبت تھی کہ اپنے لیے انہی کے ساتھ پسند فرماتے تھے، اس میں بعض لوگوں نے یہ نکتہ بھی نکالا ہے، حضور ﷺ نے اس دعا میں مساکین کو اپنے اوپر بھی ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ مساکین کا

(۱) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن أنس بن مالك رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحديث: ۲۳۵۲، وسنن ابن ماجه، رقم الحديث: ۴۱۲۶

حشر میرے ساتھ کیجئے، بلکہ یہ فرمایا کہ میرا حشر مساکین کے ساتھ کیجئے، جس میں اپنے کو تابع اور مساکین کو متبوع قرار دیا گیا ہے، مگر میرے جی کو یہ نکتہ نہیں لگا، کیونکہ گو آپ ﷺ نے دعا اس لفظ سے فرمائی ہے، مگر حقیقت میں مساکین ہی کا حشر آپ کے ساتھ ہوگا، وہی تابع ہوں گے اور آپ متبوع ہوں گے، مساکین کی متبوعیت کا کسی درجہ میں بھی وہم نہیں، باقی حضور ﷺ کا ان الفاظ سے دعا فرمانا تواضع کی بناء پر ہے۔

(وعظ: الاسعاد والابعاد، صفحہ نمبر: ۱۸۸، جلد نمبر: ۲۶ اصلاح اعمال)

کفارۂ مجلس کی دعا

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ (۱)

(اے اللہ! آپ پاک ہیں مع اپنی حمد کے، گواہی دیتا ہوں سوائے آپ کے کوئی معبود نہیں، مغفرت چاہتا ہوں آپ سے اور آپ کی طرف رجوع ہوتا ہوں)

اور ایک فائدہ یہ ہے کہ جب آدمی اس کا التزام کرلے کہ ہر مجلس میں کفارہ مجلس ضرور پڑھ لیا کرے گا یا کوئی ذکر ضرور کیا کرے گا تو نفس کے اوپر اس پابندی کا بار ہوگا، پھر گناہ کی بات تو کرے گا ہی نہیں، بلکہ بولنا ہی کم کردے گا، کیونکہ جس کام پر کچھ تدارک کرنا پڑتا ہے، اس کے انسداد میں اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہی ہے، لیکن یہ اثر جب ہوگا کہ جب پورے پابند بن جایئے اور ہر وقت زبان کی نگرانی رکھئے

---

(۱) أخرجه الامام أبوداود فی سننه عن أبی برزة الأسلمی رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث: ۴۸۵۹ باب فی كفارة المجلس، والسنن للامام الترمذی، رقم الحدیث: ۳۴۳۳

اور ہر مجلس میں کچھ ذکر یا کفارہ مجلس ضرور کرلیا کیجئے اور میں صرف گناہ ہی کی باتوں کو نہیں کہتا ہوں، جائز باتیں بھی کرلو تو اس میں بھی اسے ملالو۔

(وعظ: ذم المکروہات، صفحہ نمبر: ۳۹۷، جلد نمبر: ۱۲۶ اصلاح اعمال)

مصیبت کی حقیقت تجارت ہے

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مصیبت کے وقت کے لیے ہم کو دعا تعلیم فرمائی:

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ، اَللّٰهُمَّ عِنْدَكَ أَحْتَسِبُ مُصِيبَتِي، فَأْجُرْنِي بِهَا وَأَبْدِلْنِي بِهَا خَيْرًا مِّنْهَا [1]

اے اللہ! میں آپ سے اس مصیبت کا ثواب مانگتی ہوں، پس مجھے اس کا اجر عطا فرمایئے اور اس کا نعم البدل دیجئے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب میرے شوہر ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو میں نے دعا پڑھی، مگر وابدلنی بھا خیر امنھا کہتے ہوئے دل رکتا تھا، کیونکہ میں اپنے دل میں یہ کہتی تھی کہ ابوسلمہ سے بہتر کون ہوگا؟ اور حضور ﷺ کے ملنے کا وہم بھی نہ ہوتا تھا، کیونکہ

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے دل پر جبر کرکے یہ بھی کہا تو خدا تعالیٰ نے مجھے ابوسلمہ کے عوض حضور ﷺ عطا فرمائے۔

---

(۱) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن أم سلمة رضی الله عنها مرفوعا، رقم الحدیث: ۳۵۱۱ باب فی الاسترجاع، وکذا فی السنن للامام أبی داود، رقم الحدیث: ۳۱۱۹

تجارتِ آخرت

اس سے معلوم ہوا کہ یہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے کہ ایک چیز لی گئی اور دوسری چیز دی گئی ،نصوص میں تجارت پر صاف اشارات موجود ہیں، اس لیے اعمال کا وزن ہوگا، جیسا تجارت میں وزن ہوا کرتا ہے اور جب وہاں اعمال بھی جو کہ اعراض ہیں، اعیان بن جائیں گے جیسا کہ وزن کا مقتضی ہے تو اعیان تو اعیان ہی ہیں۔ اور مصائب کے بارے میں اخذ واعطا وابدال وارد ہے، یہ بھی معنی تجارت پر دال ہے اور تصدقِ اموال میں لفظ اقراض اور بذلِ نفسِ مال میں لفظ اشتری وارد ہے، غرض جو چیز بھی ہمارے ہاتھ سے جاتی ہے، اس کا عوض اور نعم البدل ہم کو ملتا ہے، اعمال کے متعلق مجھے ایک اور نص یاد آئی جس میں لفظ ایتاء بمعنی اعطاء ہے۔

(وعظ: الجبر بالصبر ،صفحہ نمبر: ۲۳۰ تا ۲۳۱، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر وشکر)

الملحین فی الدعاء کا ثمرہ پر اصرار نہیں ہوتا، بلکہ اظہارِ

عبدیت کے لیے حق تعالیٰ کے سامنے مچلتے ہیں

ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء (۱)

(کہ اللہ میاں دعا میں ہٹ کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں)

اس وجہ سے وہ الحاح کے ساتھ دعا کرتے ہیں، مگر نہ اس طرح کہ اگر دعا قبول نہ ہو تو وہ ناراض ہوں، بلکہ وہ اس وقت بھی راضی ہی رہتے ہیں، اس سے معلوم ہوا

---

(۱) أخرجه الامام الطبرانی رحمه الله فی "الدعا" عن عائشة رضي الله عنها مرفوعا، رقم الحدیث: (باب ماجاء فی فضل الدعاء والالحاح) قال الحافظ ابن حجر فی الفتح: وأخرج الطبرانی فی الدعاء بسند رجاله ثقات الا أن فیه عنعنة بقی عن عائشة مرفوعا.

کہ ان کو ثمرہ پر اصرار نہیں ہوتا، ہاں بایں معنی ہوتا ہے کہ ان کی حاجت ہے، اس کو پیش کرتے ہیں، اظہار عبدیت کے لیے حق تعالیٰ کے سامنے مچلتے ہیں کہ ہم ضرور لیں گے، جس کی دو وجہ ہیں: ایک تو یہ خدا تعالیٰ کی رضا اس میں سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس میں عبدیت کا اظہار ہے، اس سے وہ اپنی عبدیت کو ظاہر کرتے ہیں، سو ان کا اصرار اس معنی کی ہے۔

(وعظ: وعظ الحیٰوۃ، صفحہ نمبر: ۳۴۵، جلد نمبر: ۸ حقیقت مال وجاہ)

اسباب ابتلاء معصیت ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهٖ، وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا [(۱)]

(سب تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جس نے مجھے عافیت عطا فرمائی جس میں تجھے مبتلا کیا اور اپنی مخلوقات میں سے مجھ کو بہت سوں پر فوقیت عطا فرمائی)

اس میں بھی تذکیر ہے احتمالِ ابتلاء کی اور اسی میں تنبیہ اجمالی ہے، اسباب ابتلاء کی کہ معصیت ہے، اسی پر یہ شکر سکھلایا کہ احتمال تھا کہ اسی معصیت کے سبب شاید ہم بھی مبتلا نہ ہو جائیں، لیکن یہ دعا آہستہ پڑھے کہ مصیبت زدہ کی دل شکنی نہ ہو، جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں لاتظهر الشماتة لاخيك، [(۲)] بعض دوسرے کے مصائب کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے ہیں، حالانکہ ان کو ڈرنا چاہیے، کیونکہ مقتضی تو ہم

---

(۱) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن عائشة رضی اللہ عنہا مرفوعا، رقم الحديث: ۳۴۳۱ باب ما يقول اذا رأى مبتلى)، سنن ابن ماجه، رقم الحديث: ۳۸۹۲

(۲) أخرجه الترمذی فی سننه عن واثلة بن الأسقع رضی اللہ عنہ مرفوعاً، رقم الحديث: ۲۵۰۶

میں بھی موجود ہیں۔

(وعظ: التعاظ بالغیر، صفحہ نمبر: ۱۷۴، جلد نمبر: ۱۹ آداب انسانیت)

حضور ﷺ کی بددعا دوطرح کی ہیں

اللَّهمَّ إنَّما أنا بشرٌ أغضَبُ كما يغضبُ البشرُ فأيُّما مسلِمٍ سببتُه أو لعنتُه وليسَ لذلِكَ بأَهلٍ فاجعل ذلِكَ لَهُ صلاةً وزَكاةً وقربةً تقرِّبُه إليك (۱)

اے اللہ! میں بشر ہوں، مجھے غصہ آجاتا ہے، جیسا اوروں کو غصہ آتا ہے، تو جس شخص کو (جوش غضب میں) میں کچھ ایذا دوں یا برا بھلا کہوں یا بددعا کروں تو ان سب کو اس کے حق میں رحمتِ خاص اور سبب تزکیہ اور موجبِ قربت بنا دیجیے جس سے آپ اس کو اپنا مقرب بنالیں۔

سبحان اللہ! کیا رحمت ہے! فرماتے ہیں کہ اے اللہ! میری بددعا بھی دعا ہی ہو کر لگے تو آپ ﷺ کی عجیب شان ہے کہ غضب میں بھی آپ ﷺ رحمت ہی فرماتے ہیں، اس پر شاید کوئی خوش ہو کہ جب حضور ﷺ کی بددعا بھی دعا ہو کر لگتی ہے، تو اب جتنی وعیدیں حضور ﷺ نے بیان فرمائی ہیں، سب سے بے فکری ہے، کیونکہ آپ ﷺ کی وعید میں بھی عید ہوتی ہے، ذرا کوئی اردو خوان جو قرآن و حدیث و مسائل فقہ کا ترجمہ دیکھ کر علماء سے اپنے کو مستغنی سمجھتے ہیں، اس اشکال کا جواب تو دیدیں ان شاء اللہ منہ ہی تکتے رہیں گے اور کچھ جواب نہ آئے گا۔ بات یہ ہے کہ محض ترجمہ دیکھنے سے مضمون کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی اور جب تک حقیقت منکشف نہ ہو، اس وقت تک اشکالات کا جواب بھی سمجھ میں نہیں آتا، چنانچہ آپ نے

(۱) تقدم تخریجہ.

اردو کتابیں تو دینیات کی بہت پڑھی ہوں گی، مگر ذرا اس کا جواب دیجیے۔ صاحبو! حقیقت کا انکشاف محققین کے پاس رہ کر ہوتا ہے، لیجیے میں اس شبہ کا جواب دیتا ہوں، جواب یہ ہے کہ یہ حدیث انہی بددعاؤں سے متعلق ہے جو غلبۂ بشریت سے بحالتِ غضب نکل جائیں، چنانچہ خود شروع میں إنما أنا بشر کا لفظ خود اس پر دال ہے کہ یہ ان بددعاؤں کے متعلق ہے جن کا منشاء بشریت ہے۔

بددعا بغلبۂ عقل

اور بددعا بغلبۂ عقل تبلیغ کی حالت میں صادر ہو، ان کے بارے میں تو ایک حدیث میں یہ وارد ہے:

ستة لعنتهم و لعنهم الله و كل نبى يجاب الحديث رواه البيهقى فى المدخل ورزين فى كتابه۔ (1)

(مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر) کہ چھ شخصوں پر میں نے لعنت کی ہے اور خدا تعالیٰ بھی لعنت کرتا ہے اور ہر نبی کی درخواست قبول ہوتی ہے۔ الیٰ آخرہ۔

اس میں تصریح ہے کہ میری بددعائے لعنت قبول ہوگی اور ان پر خدا تعالیٰ کی بھی لعنت ہوگی۔ غرض مخالفت احکام کے سبب سے جو بددعا ہوگی، اس کی یہ شان ہوگی۔

(وعظ: الانسداد للفساد، صفحہ نمبر: ۳۵۹ تا ۳۶۰، جلد نمبر: ۱۹ آداب انسانیت)

---

(۱) أخرجه الامام الترمذى فى سننه عن عائشة رضى الله عنها مرفوعا، رقم الحديث: ۲۱۵٤، صحيح ابن حبان، رقم الحديث: ۵۷٤۹.
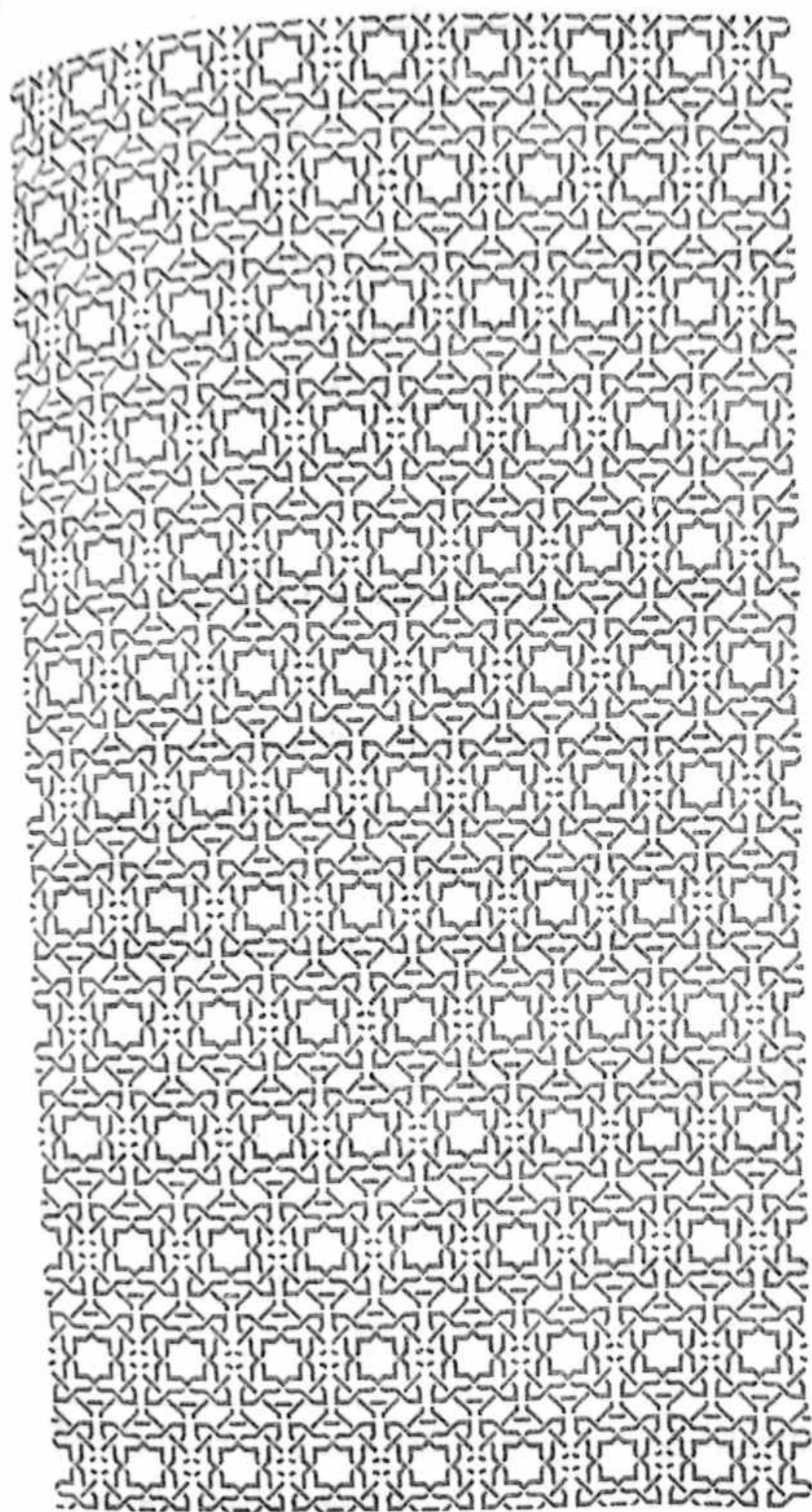
باب ذکر اللہ عزوجل

اشرف الکلام فی أحادیث خیر الأنام ﷺ
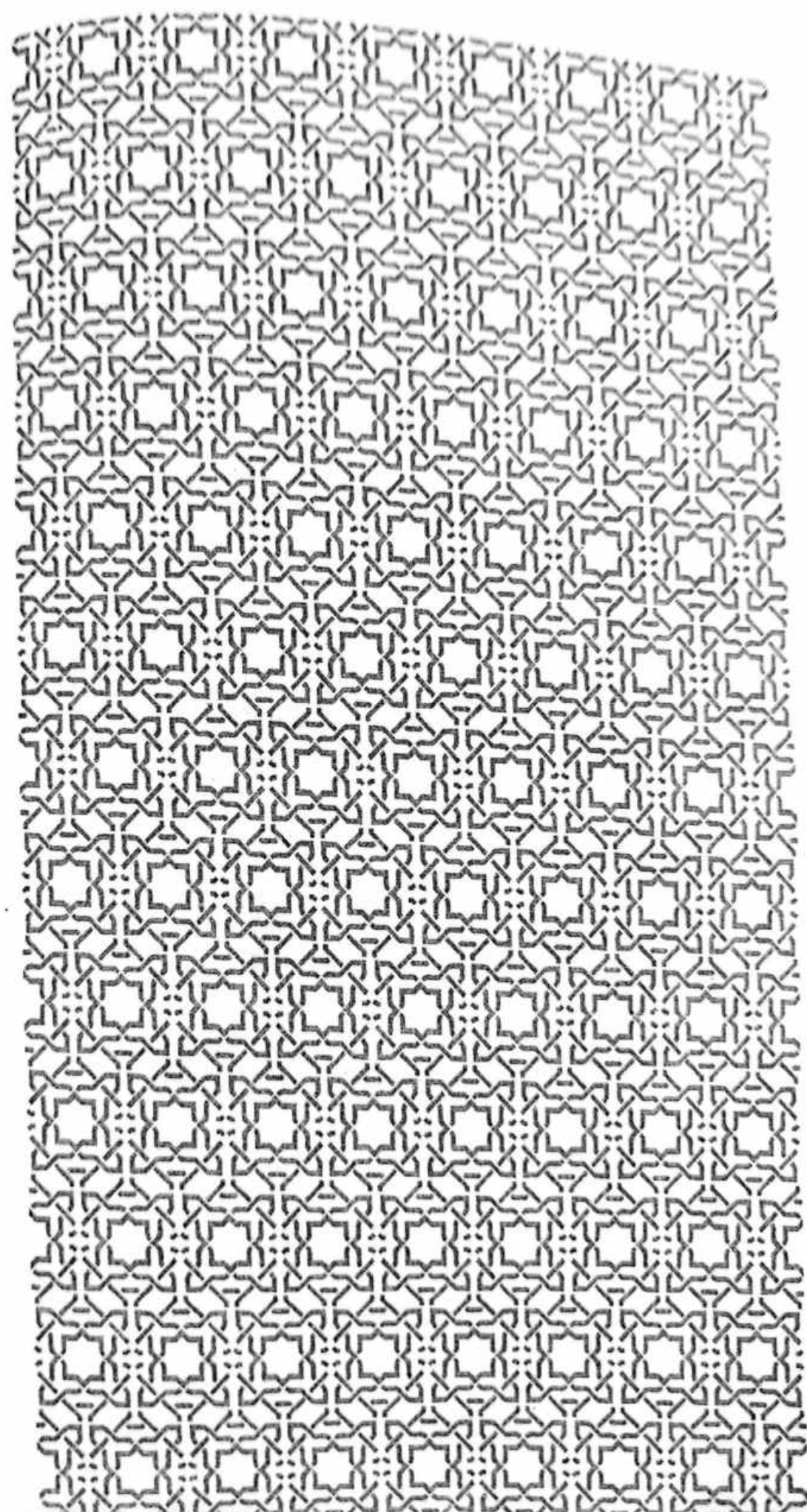
بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب ذکر اللہ عز وجل

بیت الخلاء میں ذکر حقیقی، یعنی ذکر قلبی ممنوع نہیں

چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

كان رسول الله ﷺ يذكر الله في كل احيانه (۱)

کہ رسول اللہ ﷺ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا یاد کرتے تھے اور اس کا غیر محدود ہونا یہاں تک ہے کہ بیت الخلاء میں زبان سے ذکر کرنا گو ممنوع ہے، کیونکہ زبان پاخانہ میں ہے، مگر دل سے خدا تعالیٰ کو یاد کرنا کہ وہی ذکر حقیقی ہے، ممنوع نہیں، کیونکہ قلب پاخانہ میں نہیں ہے اور یہاں سے صوفیہ کے اس قول کی ایک لطیف تائید ہوتی ہے کہ تصفیہ قلب جسم سے باہر ہے، وہ دوسرے عالم میں ہے، اسی واسطے پاخانہ میں ذکرِ قلبی ممنوع نہیں، کیونکہ قلب یہاں نہیں ہے اور اگر کوئی اس تحقیق کو نہ سمجھے یا نہ مانے تو وہ یوں سمجھ لے کہ قلب ذاکر مثل تعویذِ ملفوف کے ہے اور تعویذِ ملفوف کو پاخانہ میں لے جانا جائز ہے، اور گو زبان بھی ملفوف ہے، مگر زبان سے ذکر جب ہی ہو سکتا ہے، جب کہ لبوں اور دانتوں کی حرکت ہو اور جب لب و دندان کو حرکت ہوگی تو زبان مستور نہ رہے گی، مکشوف ہو جائے گی اور اگر کوئی شخص بدوں مکشوف نہ ہو تو یہ صورت جائز ہے، مگر وہ ذکر ہی نہیں، کیونکہ ذکر و تلاوت کے لیے

---

(۱) متفق عليه، أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن عائشة رضي الله عنها موقوفا.

تصحیح حروف ضروری ہے اور بعض کے نزدیک سماع صوت بھی لازم ہے اور اس کے لیے کشفِ لسان لازم ہے اور بغیر اس کے جو ذکر ہوگا، وہ حکماً ذکر ہے نہ حقیقتاً۔

(وعظ: اکبر الاعمال، صفحہ نمبر: ۴۰۷ تا ۴۰۸، علم وعمل جلد نمبر: ۲۰)

نیند کا غلبہ ہونے لگے تو ذکرِ لسانی بند کرنے کی وجہ

اذا نعس احدکم وھو یصلی فلیرقد [۱]

یعنی حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس وقت تک نیند نہ آوے، اس وقت تک تو نفلیں، تسبیح اور ذکر وغیرہ سب کچھ کرو اور جب نیند کا غلبہ ہونے لگے تو سور ہو، فلیرقد امر کا صیغہ ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس حالت میں ذکر لسانی بند کر دینا ضروری ہے، آگے اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں:

لعلہ یستغفر، فیسب نفسہ

یعنی ممکن ہے کہ قصدا تو استغفار کرے اور بجائے استغفار کے اپنے آپ کو کوسنے لگے، کیونکہ اس وقت مارے نیند کے ہوش درست نہیں رہتا، لامحالہ کہے گا کچھ، نکلے گا کچھ تو شاید دعا کے بدلے بددعا نکلے۔

چنانچہ علماء نے اس کی تفسیر میں مثال کے طور پر کہا بھی ہے کہ مثلاً وہ کہنا چاہتا ہے، اللھم اغفرلی کہ اے اللہ! مجھے بخش دیجئے تو ممکن ہے کہ بجائے اس کے اللھم اعفرلی عین مہملہ سے زبان سے نکلے، یعنی اے اللہ! مجھے تباہ کر دیجئے، مٹی میں ملا دیجئے، صرف ایک نقطہ کے گھٹنے بڑھنے سے معنی کس قدر بدل گئے تو حدیث و

---

(۱) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن عائشة رضی اللہ عنہا مرفوعا، رقم الحدیث: ۳۵۵ باب ماجاء فی الصلاة عند النعاس، وکذا أخرجه الامام أبوداود فی سننه، رقم الحدیث: ۱۳۱۰

نص ہے کہ جب نیند کا غلبہ ہو تو زبان سے ذکر نہ کرے، پس اس وقت زبان سے ذکر ممنوع ہے۔

اور اس سے پہلے یہ نص گزر چکی ہے:

كان رسول الله ﷺ يذكر الله في كل احيانه [1]

کہ آپ ﷺ ہر وقت ذکر کرتے تھے اور ہر وقت میں نیند کا غلبہ بھی داخل ہے اور ظاہر ہے کہ نیند کی حالت میں اس سنت پر ذکرِ لسانی کے طریق پر عمل نہیں ہوسکتا ہے، اس لیے دونوں روایتوں کو یوں جمع کریں گے کہ غلبہ نیند کے وقت ذکرِ لسانی کی تو ممانعت ہے، خواہ محض ہو یا قلبی کے ساتھ اور ذکرِ قلبی کی اجازت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بعض وقت ذکرِ قلبی محض افضل ہے، جمع بین ذکر اللسان والقلب سے۔

(وعظ: ضرورت تبلیغ، صفحہ نمبر: ۲۴۳ تا ۲۴۴، جلد نمبر: ۱۳ دعوت وتبلیغ)

ذکر میں شیطان کو ہٹانے کی خاصیت ہے

حضور ﷺ فرماتے ہیں:

إن الشيطان جاثم على قلب ابن آدم [2]

جثوم کہتے ہیں سینہ جما کر بیٹھنے کو تو ترجمہ یہ ہوا کہ شیطان سینہ جمائے بیٹھا ہے ابن آدم کے قلب پر، جب جانور سینہ جمالیتا ہے کسی چیز پر تو اس کا پورا قبضہ ہوجاتا

---

(۱) متفق عليه، أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن عائشة رضي الله عنها موقوفا.

(۲) أخرجه الامام ابن أبي شيبة في مصنفه عن ابن عباس رضي الله عنهما موقوفا، رقم الحديث: ۳۴۷۷۴، وكذا أخرجه الامام البخاري في صحيحه معلقا. ورواه ابو يعلى عن أنس نحوه مرفوعا، رقم (۴۳۰۱) فليراجع تفسير ابن كثير ۱۴/۵۲۹-۵۳۰ تفسير سورة الناس.

ہے، مطلب یہ ہوا کہ شیطان انسان کے دل پر پورا قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ "فاذا ذکر اللہ خنس" جب آدمی ذکر کرتا ہے تو وہ ہٹ جاتا ہے واذا غفل وسوس اور جب غافل ہوجاتا ہے ذکر سے تو وہ وسوسہ ڈالتا ہے، نافع اور مضر دونوں جزو کا ترجمہ ہوگیا۔ ذکر اور غفلت سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ذکر میں خاصیت ہے شیطان کے ہٹانے کی اور غفلت میں خاصیت ہے شیطانی وسوسہ پیدا کرنے کی، یہ دو عمل ہیں، یعنی ذکر وغفلت اور ان کے یہ دو اثر ہیں، یعنی خنس اور وسوسہ، باقی اس میں دونوں جگہ اثر کی حد مذکور نہیں، خواہ کہیں تک یہ اثر پہنچ جائیں، اس بناء پر ان کا مہتم بالشان ہونا زیادہ ثابت ہوگیا کہ ذکر کا نفع جب غیر محدود ہے تو بہت زیادہ قابلِ اعتناء ہے اور اسی طرح غفلت کا ضرر جب غیر محدود ہے تو بہت زیادہ قابل حذر ہے۔

(وعظ: القاف، صفحہ نمبر: ۹۶، جلد نمبر: ۲۲ ذکر وفکر)

حضورِ اقدس ﷺ کا طبعی تقاضا توجہ بلا واسطہ کا تھا

انه لیغان علی قلبی (۱) کہ میرے دل پر بھی کسی وقت ابر سا چھا جاتا ہے، اس کی شرح میں علماءِ ظاہر تو تھک گئے، مگر صوفیہ جو اہلِ اسرار ہیں، انہوں نے آگے بڑھ کر تفسیر یہ کی ہے کہ اس غین سے مراد وہ گرانی ہے جو توجہ الی الخلق میں آپ پر ہوتی تھی، کیونکہ حضور ﷺ کا طبعی تقاضا توجہ بلا واسطہ کا تھا توجہ بواسطہ طبعا گراں تھی۔

(وعظ: الرغبۃ والمرغوبۃ والطلبۃ المطلوبۃ، صفحہ نمبر: ۲۴۴ تا ۲۴۵، جلد نمبر: ۲۵ حدود وقیود)

---

(۱) أخرجه الإمام مسلم فی صحیحه عن الأغر المزنی ﷺ مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۷۰۲ باب استحباب الاستغفار والاستکثار، سنن أبی داود، رقم الحدیث: ۱۵۱۵

باب سعة رحمة الله
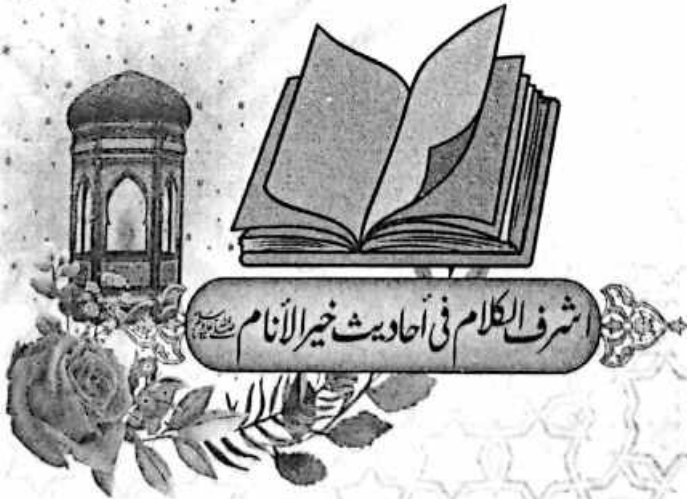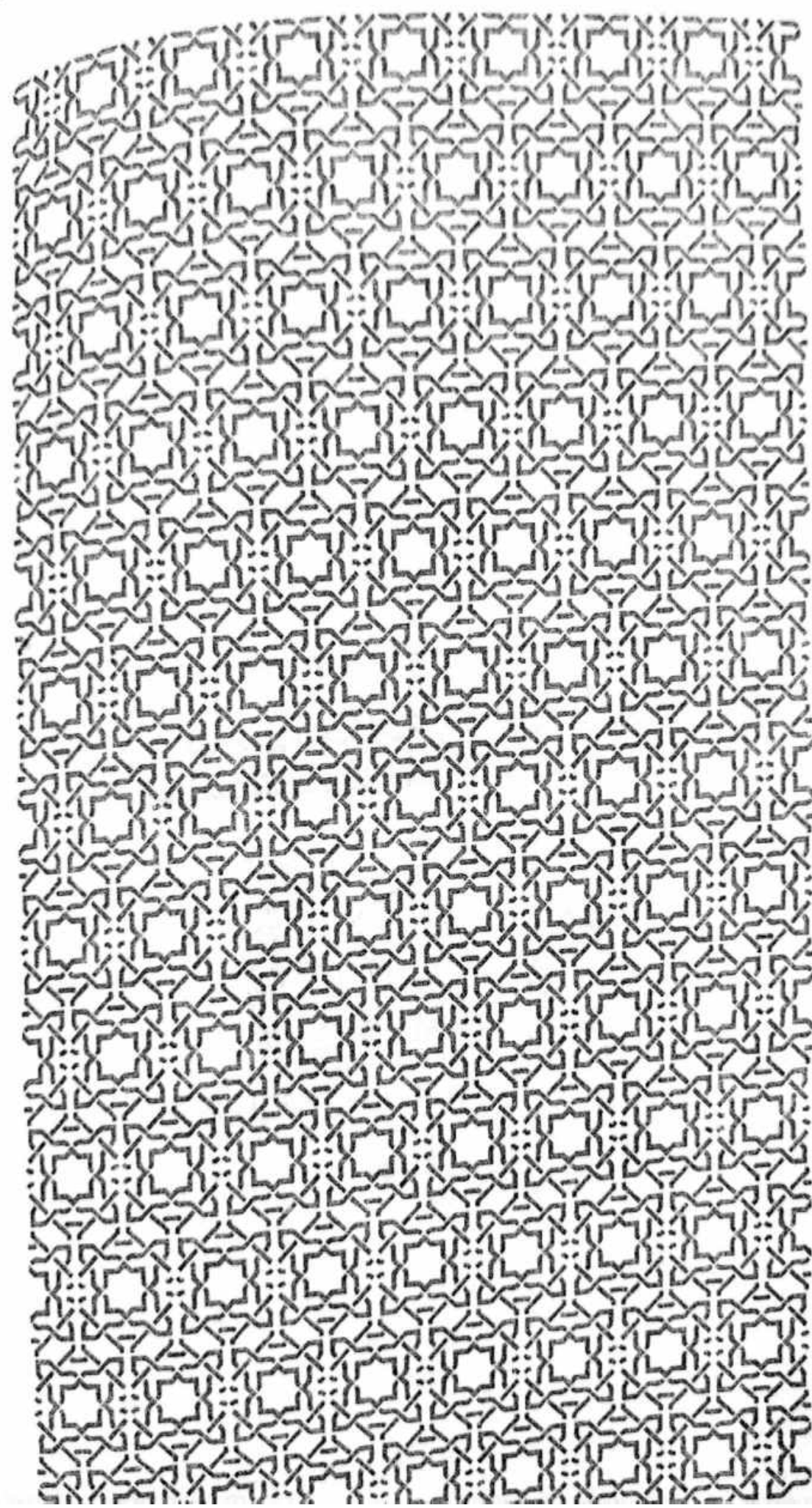
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب سعة رحمة الله

بنی اسرائیل میں ایک کفن چور کے مرنے کا واقعہ

حدیث میں آیا ہے کہ [۱] بنی اسرائیل میں ایک کفن چور تھا، اس نے مرنے کے وقت اپنے سب بیٹوں کو جمع کر کے کہا کہ میں تمہارا کیسا باپ تھا، یعنی تمہارے ساتھ کیسا برتاؤ کیا ہے؟ انہوں نے کہا بہت اچھا برتاؤ کیا، اس نے کہا اس کے عوض میرا ایک چھوٹا سا کام کردو گے؟ انہوں نے کہا جان ودل سے کردیں گے، کہا کہ جب میں مرجاؤں تو میری لاش کو جلا دینا اور اس کی راکھ کو محفوظ رکھنا اور جب خوب زور شور کی آندھی چلے تو اس راکھ کو منتشر کردینا، شاید میں اس طرح سے خدا کے ہاتھ نہ لگوں اور عذاب سے بچ جاؤں اور خدا تعالیٰ مجھ پر قادر ہوگئے تو مجھ پر ایسا سخت

---

(۱) أخرجه الإمام مسلم فی صحیحه عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۷۵۷ باب فی سعة رحمة الله تعالی وأنها سبقت علی غضبه، ولفظه: عن النبی ﷺ، "أن رجلا فیمن کان قبلکم، راشه الله مالا وولدا، فقال لولده: لتفعلن ما آمرکم به أو لأولین میراثی غیرکم، اذا أنا مت، فأحرقونی - وأکثر علمی أنه قال- ثم اسحقونی، واذرونی فی الریح، فانی لم أبتهر عند الله خیرا، وان الله یقدر علی أن یعذبنی، قال: فأخذ منهم میثاقا، ففعلوا ذلک به، وربی، فقال الله: ما حملک علی ما فعلت؟ فقال: مخافتک، قال فما تلافاه غیرها" وکذا أخرجه البخاری.

عذاب کریں گے کہ کبھی کسی پر نہ کیا ہوگا، چنانچہ جب وہ مر گیا تو اس کے بیٹوں نے اس کی وصیت پر عمل کیا، حق تعالیٰ نے اس کے تمام اجزاء جمع کر کے نفخ روح کیا، جب زندہ ہوگیا تو پوچھا، کیوں صاحب! یہ کیا حرکت تھی، ایسا کیوں کیا؟ اس نے عرض کیا اے پروردگار! تیرے خوف سے ایسا کیا، حدیث میں آتا ہے، فغفر الله له، یعنی اتنی بات پر اس کی مغفرت کردی گئی۔ اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب اسے خدا کی قدرت میں شک تھا تو مومن کیسے ہوا؟ جب مومن نہ ہو تو مغفرت کیسے ہوگئی؟ اور اس کا جواب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ شاید پہلی امم میں غیر مومن کی بھی مغفرت ہوا کرتی ہو، سو اس کا احتمال اس لیے نہیں کہ یہ امر نصوص سے معلوم ہے کہ اس امت پر رحمت زیادہ ہے، حتیٰ کہ کفار پر بھی بہ نسبت پہلے کفار کے رحمت زیادہ ہے کہ گناہ کرتے ہیں اور بنی اسرائیل کی طرح مسخ نہیں ہوتے، عاد کی طرح تیز ہواؤں سے ہلاک نہیں کئے جاتے، کسی کو الٹ دیا گیا، کسی کو فرشتے کی چیخ سے ہلاک کردیا، کہیں اس امت میں بھی ہے؟ اور اس امت کے کفار کے واسطے نصِ قطعی ہے کہ مغفرت نہیں ہوگی، سو پہلی امم کے کفار کی مغفرت ہوگی تو اس امت کے کفار کی بھی ہوگی، کیونکہ حضور ﷺ کی برکت سے ان پر رحمت زیادہ ہے اور لازم باطل ہے، لہٰذا ملزوم بھی باطل۔ پس یہ جواب نہیں چل سکتا، پس اعتراض باقی رہا کہ وہ قدرت میں تردد کی وجہ سے کافر تھا تو مغفرت کیسے ہوگئی؟ غرض یہ اشکال ہے، بعضوں نے اس سے بچنے کے لیے ان قدر الله (اگر قادر ہوگئے اللہ تعالیٰ) کے معنی میں تاویل کی کہ قدر کے معنی ضیق (تنگی کی) کے بھی آتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان تکلفات کے بغیر اس کا جواب نہایت سہل ہے، وہ یہ کہ اس کی سمجھ اتنی ہی تھی اور وہ اپنی سمجھ کے موافق مکلف تھا، وہ یوں سمجھتا تھا کہ بس قدرت اتنی ہی ہوتی ہے، اتنی عقل نہ تھی کہ یہ سمجھتا کہ وہ قدرت اس سے بہت آگے ہے۔ اسی طرح اس باب میں اعرابیوں کی عجیب

وغریب حکایتیں مشہور ہیں۔ ایک اعرابی کی حکایت ہے کہ ایک واعظ نے اپنے وعظ میں بیان کیا کہ حق تعالیٰ کے نہ ہاتھ ہے، نہ پاؤں، نہ آنکھ ہے، نہ ناک، نہ اور اعضاء، غرض وہ جوراح سے بالکل پاک ہے، ایک اعرابی سن کر کہنے لگا کہ بطیخ شامی کی طرح گول مول اور اپاہج تیرا ہی خدا ہوگا، ہمارے خدا کے سب کچھ ہے۔ غرض ہر شخص اپنی فہم کے موافق سمجھتا ہے اور اللہ اکبر! کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ باوجود ان بدیہی غلطیوں کے پھر بھی ان سب کا نام دفترِ عارفین میں لکھا ہوا ہے اور دوسرے تو کنہ ذات کی کیا سمجھتے، جبکہ حضور ﷺ ہی لا احصی ثناء علیك[1] (میں تیری تعریف ہی نہیں کرسکتا ہوں) فرماتے ہیں، پھر کسی اور کی کیا مجال جو کنہ اور حقیقت دریافت کرسکے۔

(وعظ: روح القیام، صفحہ نمبر: ۵۴ تا ۵۶، برکات رمضان جلد نمبر: ۱۶)

حضور ﷺ نے ایک صحابی کو لونڈی آزاد کرنے کے لیے کیوں فرمایا؟

حضور سرور دو عالم ﷺ سے ایک صحابی نے آکر عرض کیا کہ میں نے ایک لونڈی کے تھپڑ مار دیا ہے، اس کو ایک کفارہ میں آزاد کرنا چاہتا ہوں، اس کے آزاد کرنے کے لیے ایمان شرط ہوگی؟ حضور ﷺ نے اس لونڈی کو طلب فرمایا، اس سے دریافت فرمایا: این اللہ، یعنی اللہ تعالیٰ کہاں ہیں؟ اس نے کہا: فی السماء، آسمان میں، پھر دریافت فرمایا کہ میں کون ہوں؟ عرض کیا: انت رسول اللہ، آپ اللہ کے رسول (ﷺ) ہیں، حضور ﷺ نے صحابی سے فرمایا کہ یہ مومنہ ہے، اس کو

---

(۱) أخرجه الامام مسلم فی صحیحه عن أبی هريرة عن عائشة رضی الله عنهما مرفوعا، رقم الحديث: ۴۸۶ باب ما يقال فی الركوع والسجود، السنن للإمام الترمذی، رقم الحديث: ۳۴۹۳ السنن للامام أبی داود، رقم الحديث ۸۷۹.

آزاد کردو،(۱) باوجود اس کے کہ وہ لونڈی یہ سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہیں، لیکن پھر بھی حضور ﷺ نے اسے مومنہ فرمایا، حالانکہ بھلا اللہ تعالیٰ آسمان میں کیا سماتا؟ عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے مظروف سے ظرف بڑا ہونا چاہیے، سو خدا تعالیٰ کی عظمت کے سامنے عرش تک تو کوئی چیز ہی نہیں تو آسمان تو کیا ہوتا؟ ادھر دلائلِ قطعیہ قائم ہیں کہ حق تعالیٰ پاک ہیں، کسی مکان کے اندر آنے سے، لیکن اس جاریہ (لونڈی) کی عقل اتنی ہی تھی، چنانچہ اگر بچوں سے پوچھو کہ خدا کہاں ہے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ اوپر ہے، حالانکہ حدیث میں ہے:

لو أنکم دلیتم الحبل الی الارض السفلیٰ لهبط علی الله (۲)

یعنی اگر رسی ساتوں زمین پار ہو کر اترے گی، وہاں بھی اللہ میاں ہیں، وہ زمین کے ساتھ مقید ہیں، نہ آسمان کے ساتھ، مگر فطری امر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوپر ہی ہونے کا گمان ہوتا ہے، کیونکہ اس کی ذات عالی ہے، عوام کی سلامتی اسی میں ہے کہ اوپر سمجھیں، عرش پر سمجھیں یا آسمان پر سمجھیں، کچھ حرج نہیں، خواص کے لیے ہے اس کو مکان سے پاک سمجھنا۔

(وعظ: روح الارواح، صفحہ نمبر: ۳۹۵ تا ۳۹۶، سنت ابراہیم جلد نمبر: ۱۷)

---

(۱) أخرجه الامام مسلم فی صحیحیه عن معاوية بن الحكم السلمی مرفوعا، رقم الحديث: ۵۳۷ باب تحريم الكلام فی الصلاة ونسخ ما كان من اباحته) ولفظه: قال: وكانت لی جارية ترعى غنمًا لی قبل أحد والجوانية، فاطلعت ذات يوم فاذا الذئب قد ذهب بشاة من غنمها، وأنا رجل من بنی آدم، آسف ما يأسفون، لكنی صككتها صكة، فأتيت رسول الله ﷺ فعظم ذلك علی، قلت: يا رسول الله أفلا أعتقها؟ قال: ائتنی بها فأتيته بها، فقال لها: أين الله؟ قالت: فی السماء، قال: من أنا؟ قالت: أنت رسول الله، قال: أعتقها، فانها مؤمنة.

(۲) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن أبی هريرة رضی الله عنه مرفوعا، رقم الحديث: ۳۲۹۸ باب ومن سورة الحديد.

اللہ تعالیٰ کی رحمت کی تمنا ہر وقت ہر شخص کو ہے

حضور ﷺ فرماتے ہیں:

الراحمون یرحمھم الرحمن (۱)

کہ رحم کی بڑی خاصیت یہ ہے کہ رحم کرنے والے پر حق تعالیٰ رحم فرماتے ہیں، دیکھو یہ تھوڑی فضیلت نہیں، بہت بڑی فضیلت ہے، خدا کی رحمت سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہے، خدا تعالیٰ کی صفات دو طرح کی ہیں: بعض صفات کے آثار کی تمنا تو بعض حالات میں ہوتی ہے، ہر وقت نہیں ہوتی، مثلاً عدل یہ بھی خدا کی ایک صفت ہے جس کے معنی ہیں کہ ہر کام کے مقتضٰی پر پورا حکم کرنا ظاہر ہے کہ گناہگار آدمی کو تو عدل سے ڈر لگے گا، اس کو عدل کی تمنا کب ہوگی؟ لیکن یہ صفتِ رحمت ایسی ہے کہ اس کی تمنا ہر وقت اور ہر شخص کو ہے، طاعت میں بھی اور گناہ میں بھی، بلکہ گناہ میں تو اس کی بہت ہی ضرورت ہے، کیونکہ یہ رحمت ہی ہے کہ باوجود اس قدر نافرمانی کے پھر بھی مؤاخذہ نہیں ہوتا، دنیاوی حکام ذرا سی بات پر مؤاخذہ کرتے ہیں، مگر خدا کی رحمت ہے، بڑے بڑے گناہوں پر بھی انعام بند نہیں فرماتے۔

(وعظ: مواساۃ المصابین، صفحہ نمبر: ۴۴۹، جلد نمبر: ۱۹ آداب انسانیت)

اگر کوئی ذکر کا جلسہ ہوتا ہے مثل وعظ وغیرہ کے تو جب فرشتے یہاں سے لوٹ کر جاتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ میرے بندے کیا کر رہے ہیں؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی تسبیح اور تحمید کر رہے ہیں، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ فرشتے عرض کرتے ہیں جنت کو طلب کرتے ہیں اور دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے کہ گواہ رہو! میں نے ان کو بخش دیا، فرشتے عرض کرتے ہیں کہ ان میں

---

(۱) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن عبد الله بن عمرو رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث: ۳۲۹۸ باب ماجاء فی رحمة المسلمین، سنن أبی داود، رقم الحدیث: ۴۹۴۱

ایک شخص آپ کے ذکر کے لیے نہیں آیا تھا، بلکہ کسی کام کے لیے آیا تھا، اس کا مقصود اس جلسہ میں شرکت نہ تھی، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کو بھی بخش دیا، اس لیے کہ هم قوم لا یشقی جلیسهم (ایسے لوگ ہیں جن کے ساتھ بیٹھنے والے محروم نہیں)(۱)

اب رہی یہ بات کہ بندوں کی حالت فرشتوں سے کیوں پوچھتے ہیں؟ انہیں تو ویسے ہی بدوں فرشتوں کے تمام باتوں کا علم ہے، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک دفعہ ہمارے متعلق ایک بات کہہ دی تھی جس سے اب تک ان کا پیچھا نہیں چھوٹا، سو ان سے پوچھ کر یہ جتلاتے ہیں کہ دیکھو! یہ وہی تو ہیں جن کے بارے میں تم نے ایسا کہا تھا، فرشتوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ فرشتوں نے کہا تھا:

أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا

کہ آپ زمین میں ایسے کو خلیفہ بناتے ہیں جو اس میں فساد کرے۔

من سے مراد عام تھا کہ وہ سب ایسے ہی ہوں گے، سو وہ موجبہ کلیہ کے مدعی تھے، پس سالبہ جزئیہ ان کے مقابلہ میں کافی ہو گیا۔ (یعنی ایک ایسے شخص کا پیش کر دینا جو مطیع کامل ہو، ان کے موجبہ کلیہ توڑنے کے لیے کافی ہے، یہ نہیں کہ سارے مطیع ہوں، تب ہی ان کا جواب ہو سکے، سو فرشتے ایک دفعہ ہم پر اعتراض کرنے سے پکڑے گئے، آج تک ان کا پیچھا نہیں چھوٹتا، جب کوئی موقعہ ہوتا ہے تو حق تعالیٰ جتلا دیتے ہیں۔

(وعظ: الصلوٰۃ، صفحہ نمبر: ٦٦، ٦٧، جلد نمبر: ١٠ فضائل صوم وصلوٰۃ)

---

(۱) أخرجه البخاری فی صحیحه عن أبی هریرة رضی الله عنه مرفوعاً، رقم الحدیث ٦٤٠٨، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر الله عز وجل.
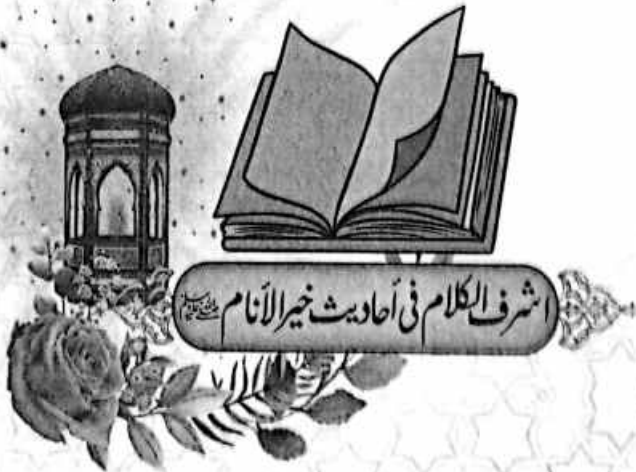
کتاب المناسک
اشرف الکلام فی احادیث خیرالانام
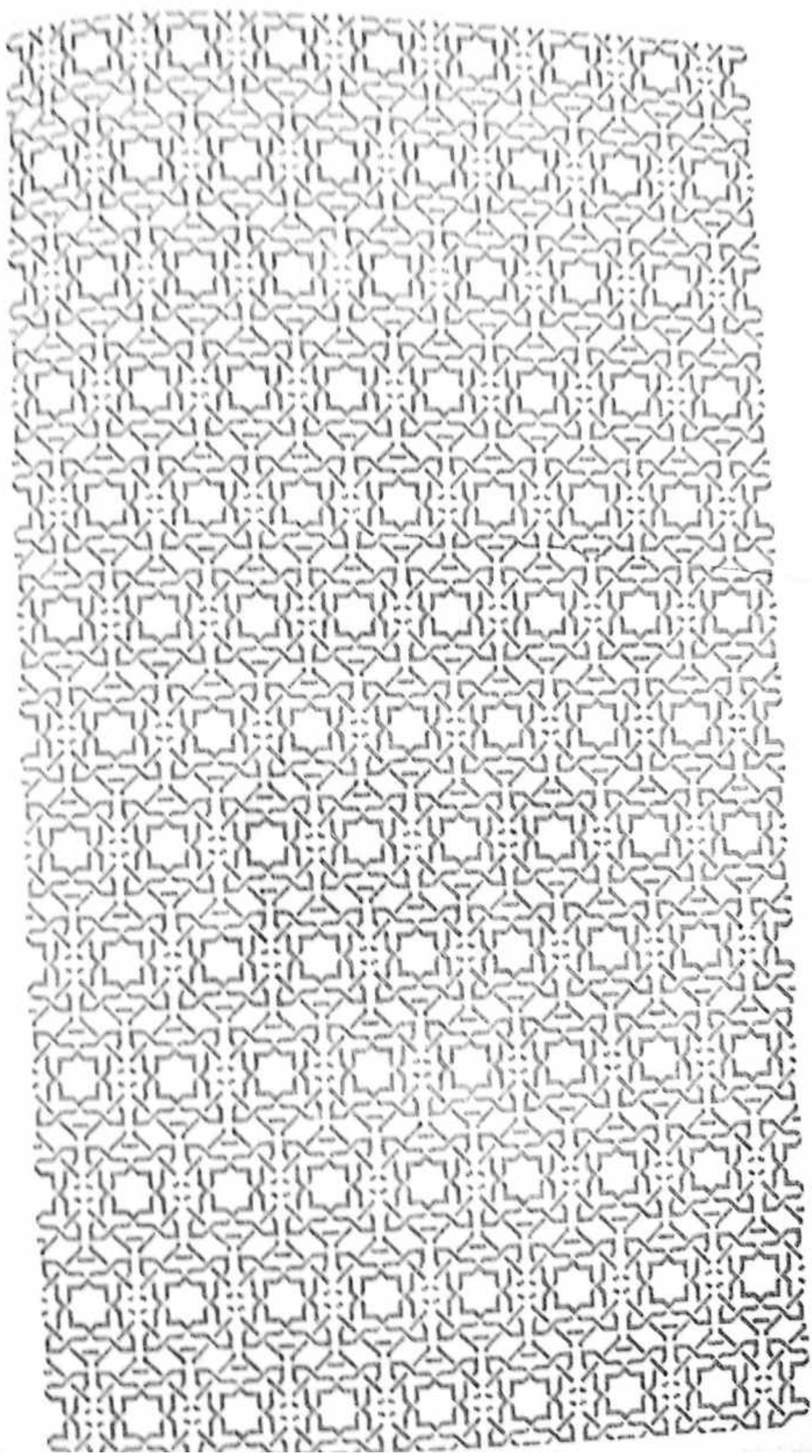
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب المناسک

حجرِ اسود کو بوسہ دینے کا منشاء محض محبت ہے

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حقیقت کو مجمعِ عام میں ظاہر فرمایا، ایک بار آپ طواف کر رہے تھے، اس وقت کچھ لوگ دیہات کے موجود تھے، جب آپ رضی اللہ عنہ نے تقبیل حجر کا ارادہ کیا تو حجر کے پاس ذرا ٹھہرے اور فرمایا:

إنی لأعلم أنك لحجر، لاتضر ولاتنفع، ولولا أنی رأیت رسول اللّٰہ ﷺ قبلك ما قبلتك (۱)

یعنی میں جانتا ہوں کہ ایک پتھر ہے جو نہ کچھ نفع دے سکتا ہے، نہ ضرر دے سکتا ہے اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں کبھی تجھے بوسہ نہ دیتا۔ کیا خشک معاملہ کیا ہے حجرِ اسود کے ساتھ، بھلا اگر یہ مسلمانوں کا معبود ہوتا تو کیا اس سے یہی خطاب کیا جاتا کہ نہ تو نفع دے سکتا ہے، نہ ضرر پہنچا سکتا ہے؟

اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ اس تقبیل کا منشاء محبت ہے اور محبت کی وجہ یہ ہے

---

(۱) أخرجه الامام مسلم فی صحیحه عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث: ۱۲۷۰ باب استحباب تقبیل الحجر الأسود فی الطواف، السنن للامام الترمذی، رقم الحدیث: ۸۶۰

کہ حضور ﷺ نے اس کو بوسہ دیا ہے، حضور ﷺ کا فضلہ بھی کسی جگہ گرا ہو تو ہم کو اس جگہ سے محبت ہوگی، چہ جائیکہ وہ جگہ جہاں حضور ﷺ کے ہاتھ لگے ہوں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ کا دہانِ مبارک لگا ہو۔

در منزل لیلی جاناں روزے رسید باشد
باخاک آستانش داریم مرحبائے

رہا یہ کہ حضور ﷺ نے اس کو کیوں بوسہ دیا؟ اس سوال کا کسی کو حق نہیں اور نہ ہم کو اس کی وجہ بتلانا ضروری ہے۔ ہاں اتنی بات یقینی ہے کہ حضور ﷺ نے بطورِ عبادت وعظمت کے بوسہ نہیں دیا، ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بے با کی کے ساتھ لا تضر، ولا تنفع نہ فرماتے، وہ حضور ﷺ کے مزاج شناس تھے، جب انہوں نے حجر کے ساتھ یہ معاملہ کیا تو یقیناً اس تقبیل کا منشاء عبادت ہرگز نہیں اور تبرعاً اس کا جواب بھی دیئے دیتا ہوں کہ ممکن ہے حضور ﷺ کو حجر کے اندر تجلیات الٰہیہ کا بنسبت دوسرے حصص بیت کے زیادہ ہونا منکشف ہوا ہو، پس منشاء اس تقبیل کا تلبیس زائد ہے تجلیاتِ الٰہیہ سے اور جس چیز کو محبوب کے انوار سے زیادہ تلبیس ہو، اس کا بوسہ دینا اقتضائے محبت ہے، (قال الشاعر)

امر علی الدیار، دیار لیلیٰ
اقبل ذا الجدار، وذا الجدار
و ما حب الدیار شغفن قلبی
ولکن حب من سکن الدیار[1]

---

(۱) زهر الأكم فی الأمثال والحكم (۳/۷٦).

اس جگہ شاید کسی کو یہ اشکال پیش آئے کہ جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کے متعلق یہ فرمایا تھا انی لا علم انك لحجر، لاتضر، ولا تنفع اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھے، انہوں نے فرمایا:

بلی أنه ینفع، إنی سمعت رسول اللہ ﷺ انه یشهد لمن قبل یوم القیامة (او کما قال)

کیوں نہیں، وہ نفع دے گا، میں نے حضور ﷺ سنا ہے کہ جو لوگ اس کو چومتے ہیں، قیامت کے دن یہ ان کے واسطے گواہی دے گا تو اس سے حجر کا نافع ہونا معلوم ہوا اور یہ معارض ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے۔

خوب سمجھ لیجئے! کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ قول بسند صحیح ثابت ہو تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول میں تعارض کچھ نہیں، بلکہ حضرت علی کا قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا مکمل ہے اور اس کی حقیقت کو ظاہر کرنے والا ہے، کیونکہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تو نہ ضرر دے سکتا ہے، نہ نفع تو اس پر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ پھر یہ تقبیل محض لغو ہے، جس کام میں کچھ نفع بھی نہیں، اس کا کرنا فضول ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس شبہ کو رفع فرما دیا اور بتلا دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک خاص نفع وضرر کی نفی فرماتے ہیں، یعنی جو نفع وضرر معبود کا خاصہ ہے، حجرِ اسود میں وہ نہیں ہے، باقی مطلقِ نفع کی نفی مقصود نہیں۔

چنانچہ حجر میں ایک نفع ہے کہ وہ شاہد بنے گا قیامت میں اپنے بوسہ دینے والوں کے لیے اور ظاہر ہے کہ شاہد کا درجہ حاکم سے کم ہوتا ہے۔ شاہد کے قبضہ میں نفع وضرر نہیں ہوتا، وہ تو صرف واقعہ بیان کر دیتا ہے، اب آگے حاکم کی رائے پر فیصلہ کا مدار ہے، نفع وضرر وہی دے سکتا ہے، حاکم اصل اور شاہد تابع ہوتا ہے، پس

حجر کا شاہد ہونا خود اس کی عبادت کی نفی کرتا ہے۔

شاہد تو انسان بھی ہوسکتا ہے، چنانچہ قیامت میں بہت سے انسان بھی شاہد ہوں گے، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ نفع وضرر تیرے قبضہ میں نہیں ہے، اس سے تو شبہ عبادت کی نفی ہوگئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ نفع تیرے اندر موجود ہے جو مخلوق سے مخلوق کو پہنچا کرتا ہے، یعنی شاہدیت، اس سے لغویت تقبیل کی نفی ہوگئی، خوب سمجھ لو۔

(وعظ: محاسن اسلام، صفحہ نمبر: ۲۹۱ تا ۲۹۳، محاسن اسلام جلد نمبر: ۱۲)

حقوق العباد کی دو اقسام

حضور ﷺ نے حجۃ الوداع میں جو خطبہ پڑھا ہے، اس میں آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے دریافت فرمایا، ای یوم هذا؟ یہ کون سا دن ہے؟ قالوا الله و رسوله اعلم، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا خدا اور اس کا رسول ہم سے زیادہ جانتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: الیس یوم النحر؟ کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے؟ قالوا بلی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا بے شک، اس سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا غایت ادب معلوم ہوا کہ جس بات کو وہ جانتے بھی ہیں، اس کو بھی اللہ و رسول ﷺ کے حوالے کر دیتے تھے، اپنی شان علم ظاہر نہ کرتے تھے، اس کے بعد حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ یہ مقام کونسا ہے؟ پھر اسی طرح خود ہی فرمایا کہ کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا بے شک، پھر آپ ﷺ نے مہینہ کی بابت سوال کیا اور اسی طرح خود ہی فرمایا کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا بے شک، پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

فإن أموالكم و دمائكم و اعراضكم حرام عليكم كحرمة

یومکم ھذا فی شھر کم ھذا فی بلد کم ھذا[۱]
کہ تمہارے اموال اور جانیں اور آبروئیں آپس میں تم پر ہمیشہ کے لیے ایسی ہی حرام ہیں، جیسے اس مہینہ میں اس مقام میں اس دن میں حرام ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ ایک قسم حقوق العباد کی جان کو تکلیف پہنچانا ہے، مثلاً ناحق مارنا جس میں اہلِ حکومت اور معلمین بکثرت مبتلا ہیں اور ایک قسم حقوق العباد کی کسی کی آبرو کو صدمہ پہنچانا بھی ہے، یعنی کسی پر لعن طعن کرنا، کسی کی تحقیر کرنا، کسی پر بے وجہ بدگمانی کرنا، یہ سب حرام ہے، اسی طرح کسی کی غیبت کرنا بھی ناجائز ہے، بلکہ بعض نصوص سے حقوق آبرو کا درجہ زنا وغیرہ سے بھی بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

(وعظ: الکمال فی الدین، صفحہ نمبر:۱۹۱ تا ۱۹۲ جلد نمبر:۳ دین ودنیا)

مقصود کے حصول میں اسہل طریقہ اختیار کرنا چاہیے

حدیث میں موجود ہے اجرک علی قدر نصبک،[۲] یعنی اجر بقدر محنت کے ہے اور میں کہتا تھا کہ اس حدیث سے طریق طویل کو اختیار کرنے کی فضیلت بتلانا مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ بڑے مقصود کو حاصل کرو اور اس کی تحصیل میں جو مشقتیں پیش آئیں، ان کی وجہ سے ہمت نہ ہارو، کیونکہ اجر علی قدر نصبك ان

---

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن عبدالرحمن بن أبی بکرة عن أبیه مرفوعا.

(۲) أخرجه الحاکم فی المستدرك علی الصحیحین، رقم الحدیث:۱۷۳۳ أول کتاب المناسك، ولفظه عن عائشه رضی الله عنها: "أن رسول الله ﷺ قال لها فی عمرتها: ان لك من الأجر علی قدر نصبك ونفقتك هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاه، وله شاهد صحیح".

مشقتوں پر اجر بھی زیادہ ملے گا، یہ مقصود نہیں کہ مقصود کے دو طریقوں میں اعسر اور اطول کو اختیار کرو اس امید پر کہ اس سے ثواب بڑھ جاوے گا، یہ تو در حقیقت مقصود سے محرومی ہے اور ذریعہ کو مقصود بنانا ہے۔

(وعظ: السوق الی الشوق، صفحہ نمبر: ۱۱۳، جلد نمبر: ۲۴ موت وحیات)
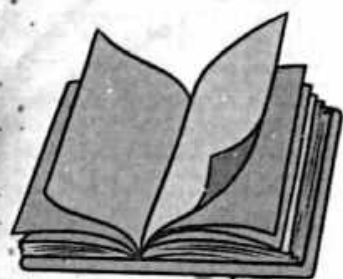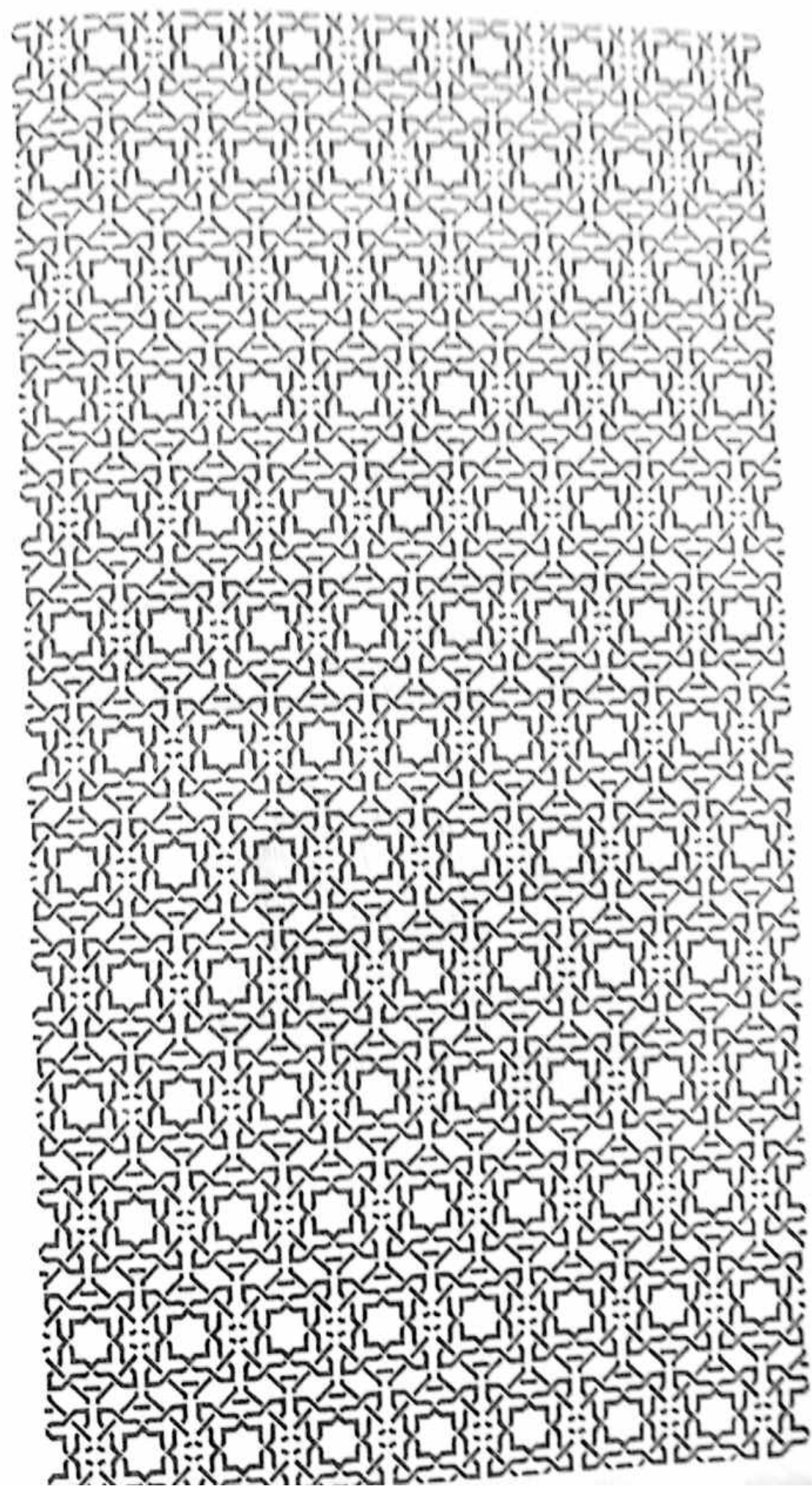
کتاب البیوع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب البیوع

اونٹ کے بارے میں پوچھنے پر حضور اقدس ﷺ کے

غصہ ہونے کی اصل وجہ

ایک مرتبہ ایک صحابی لقطہ کے بارے میں حضور ﷺ سے سوال کررہے تھے کہ اگر بکری جنگل میں ملے تو اس کو حفاظت کے لیے اپنے قبضہ میں کرلیا جاوے یا نہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں، اس کو لے آنا چاہیے، ورنہ درندے اس کو ہلاک کردیں گے، پھر کسی نے پوچھا کہ اگر اونٹ ملے تو اس کو بھی ایسا ہی کیا جائے؟ اس پر آپ ﷺ کو غصہ آ گیا اور چہرہ مبارک سرخ ہوگیا، فرمایا کہ اس کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے؟ وہ خود موذی جانوروں کو دفع کرنے پر قادر ہے، درختوں کے پتے کھاتا ہوا اپنے مالک سے آ ملے گا۔ (۱)

---

(۱) أخرجه البخاری فی صحیحه عن زید بن خالد رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۴۳۸ باب من عرف اللقطة ولم یدفعها الی السلطان، ولفظه: أن أعرابیا سأل النبی ﷺ عن اللقطة، قال: عرفها سنة، فان جاء أحد یخبرک بعفاصها، ووکائها، والا فاستنفق بها، وسأله عن ضالة الابل؟ فتمعر وجهه، وقال: مالک ولها، معها سقائها وحذاؤها ترد الماء، وتأکل الشجر، دعها حتی یجدها ربها وسأله عن ضالة الغنم؟ فقال: هی لک أو لأخیک أو للذئب.

اس بات پر حضور ﷺ کو غصہ اس لیے آیا کہ سوال سے حرص اور طمع مترشح ہو رہی تھی، کیا اب بھی کہا جائے کہ بد خلقی مطلق سختی اور غصہ کا نام ہے؟ آج علماء پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ذرا سی بات میں خفا ہو جاتے ہیں، ان کے اخلاق عمدہ نہیں، سو بحمد اللہ ان واقعات کے معلوم کرنے کے بعد یہ الزام رفع ہو گیا ہوگا۔

(وعظ: الدین الخالص، صفحہ نمبر: ۲۰، جلد نمبر: ۳ دین و دنیا)

عورت کا اپنا مال کے خرچ کرنے میں شوہر سے مشورہ لینا بہتر ہے

نسائی میں ایک حدیث ہے:

ان رسول الله ﷺ قال: لا يجوز لامرأة هبة في مالها اذا ملك زوجها عصمتها الا باذن زوجها[1]

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نکاح کے بعد عورت کو اپنے مال میں سے ہبہ کرنا بدون اجازتِ زوج کے جائز نہیں، اس میں بعض علماء نے اضافت بادنی ملابست مانی ہے اور مالہا سے مراد زوج لیا ہے، لیکن اگر حضور ﷺ کے ارشاد کو اس پر محمول کیا جاوے کہ عورتیں ناقصات العقل ہوتی ہیں، اگر یہ اپنے مال میں خود مختار ہوں گی تو نہ معلوم کہاں کہاں روپیہ برباد کریں گی، اس لیے آپ ناقص العقل طبقہ کو حکم فرماتے ہیں کہ تم اپنے مال میں بھی جو تصرف کرو اس میں اپنے مرد سے مشورہ کر لیا کرو تو یہ بات جی کو لگتی ہے اور اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ اس طرح برتاؤ کرنے میں میاں بی بی میں اتحاد بڑھتا ہے اور مرد کو عورت سے محبت زیادہ ہوتی ہے کہ اس کو مجھ سے اتنا تعلق ہے کہ اپنے مال میں بھی کوئی کام بغیر میرے مشورے کے نہیں کرتی اور

---

(۱) أخرجه الامام النسائی فی سننه عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده مرفوعا، رقم الحديث: ۳۷۵۶ عطية المرأة بغير اذن زوجها.

اگر عورت اپنی جمع کو الگ رکھ کر اس میں اپنی رائے سے تصرف کرے تو اس صورت میں ایک قسم کی اجنبیت معلوم ہوتی ہے، اس وجہ سے میرے نزدیک حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے اور مالها سے مال زوج مراد لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(قلت، قال السندي في تعليقه على النسائي وهو عند اكثر العلماء على معنى حسن العشرة و استطابة نفس الزوج واخذ مالك يظاهره في ما زاد على الثلث)(۱)

تو جب اس کی تفسیر بناء بر عورت کو اپنے مال میں بھی مرد سے مشورہ لینے کی ضرورت ہے تو شوہر کے مال میں تو کیسے ضرورت نہ ہوگی۔

(وعظ: اسباب الغفلة، صفحہ نمبر: ۳۵۵، جلد نمبر: ۳ دین ودنیا)

مشتبہات میں پڑنا بھی خطرناک ہے

الحلال بين والحرام بين وبينهما مشتبهات، فمن اتقى الشبهات فقد استبرألدينه، ومن يرعى حول الحمىٰ يوشك ان يقع فيه(۲)

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حلال بین ہے اور حرام بین ہے اور دونوں کے درمیان مشتبہات ہیں، یعنی وہ اعمال ہیں جن کا حلال وحرام ہونا پوری طرح واضح نہیں ہے، ان کی نسبت فرماتے ہیں کہ جو شبہات سے بھی بچا رہے، اس نے دین کو محفوظ کرلیا اور جو کوئی سرکاری چراگاہ کے قریب اپنے مویشی کو لے جائے گا (یعنی شبہات کا ارتکاب کرے گا جو حرام کی سرحد سے ملی ہوئی ہے) تو

---

(۱) حاشية السندي على سنن النسائي (۲۷۹/۶) مكتب المطبوعات الإسلامية، حلب

(۲) أخرجه البخاري ۲۰/۱ (۵۲) و مسلم ۱۲۲۱/۳ (۱۵۵۹) كلاهما عن النعمان بن بشير رضي الله عنه.

عجب نہیں کہ مویشی چراگاہ میں بھی گھس جائیں اور سرکاری مجرم ہو جائے۔

مطلب یہ ہے کہ مشتبہات میں پڑنا بھی خطرناک ہے، اگر چہ ان کو حرام نہیں کہہ سکتے۔ دیکھیے! اس حدیث میں اس قاعدہ کی تصریح موجود ہے کہ جس کو گناہ سے بچنا ہو، وہ مشابہ گناہ سے بھی بچے۔

(وعظ: القاف، صفحہ نمبر: ۱۰۳، جلد نمبر: ۲۲ ذکر وفکر)

دل میں اگر اللہ تعالیٰ کا خوف ہو تو گناہ نہ ہوں گے

ان فی الجسد مضغة، اذا صلحت صلح الجسد کله، واذا فسدت فسد الجسد کله (۱)

یعنی آدمی کے جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام جسم درست ہو جاتا ہے اور جب بگڑتا ہے تو تمام جسم بگڑ جاتا ہے اور مسئلہ طبی قاعدہ سے بھی درست ہے، اس لیے کہ امراضِ قلب تمام امراض میں بہت سخت ہیں، اگر قلب میں ضعف اور مرض ہے تو اور جسد کتنا ہی قوی ہو سب بے کار ہے، جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ قلب کی درستی سے تمام اعمال کی درستی ہوتی ہے تو قلب کی درستی کس سے ہو؟ تو ہم دیکھتے ہیں کہ قلب کے بھی بہت سے افعال ہیں تو اگر حق تعالیٰ تمام افعال کا حکم فرمادیتے یا اجمالا یہ فرمادیتے کہ اپنے قلب کو درست کرو تو اس صورت میں بھی نفس کو ایک مشقت ہوتی کہ قلب کو کس طرح درست کریں؟ کیا رحمت ہے کہ قلب کے تمام افعال میں سے صرف ایک مختصر سی بات فرمائی کہ صرف ہمارا خوف اختیار کرلو، باقی سب ہم درست کردیں گے اور وجہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حاکم کا اگر ڈر دل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کی مخالفت

---

(۱) للمصدر السابق.

پر جرأت نہیں ہوتی، اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کا خوف کسی کے دل میں بیٹھ جائے تو اس سے گناہ نہ ہوں گے اور اعمال کی اصلاح ہو جاوے گی اور گذشتہ سے توبہ اور آئندہ کے عزم ترک بھی کرے گا، یہ محوِ ذنوب ہوا، پس معلوم ہو گیا کہ تقویٰ کو اصلاح اعمال و محو ذنوب میں پورا دخل ہے اور تقویٰ اصلاحِ اعمال کے لیے بمنزلہ علتِ تامہ کے ہے۔

(وعظ: تسہیل الاصلاح، صفحہ نمبر: ۱۴۱، جلد نمبر: ۲۶ اصلاحِ اعمال)

اگر کوئی اپنی جائیداد کسی مصلحت سے بیچ دے تو فوراً دوسری خرید لے

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس جائیداد ہو اور اس کو کسی مصلحت سے بیچ دے تو فوراً دوسری خرید لے، کیونکہ روپے میں برکت نہیں ہوتی۔ (یعنی وہ رہنے والی چیز نہیں) [1]

اور واقعی ہے بھی یہی کہ روپیہ رہتا نہیں، سو اس حدیث میں تو جائیداد کی حفاظت کی رغبت دلائی جارہی ہے اور ایک اور حدیث ہے، اس میں جائیداد خریدنے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ممانعت فرمائی ہے، وہ پیغمبر ایک جگہ رغبت دلا رہے ہیں جائیداد رکھنے کی اور وہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرما رہے ہیں کہ اے عائشہ! جائیداد مت خریدنا تو مطلب یہ ہے کہ نہ ہو تو لو مت اور ہو تو دو مت۔ بجز نبی ﷺ کے کوئی پیشوا ایسا ہے جس کی ایسی تعلیم ہو۔ بس دوسرے پیشوا دو قسم کے ہیں یا تو دنیا کو چھڑائیں گے یا اس میں مبتلا کر دیں گے اور یہاں یہ کیفیت ہے۔

بر کفی جام شریعت بر کفی سندان عشق
روسنا کی نداند جام و سندان باختن

---

(۱) أخرجه ابن ماجه فی السنن وأحمد فی المسند عن حذيفة بن اليمان رضی اللہ عنہ مرفوعاً، ولفظه: من باع داراً ولم يجعل ثمنها فی مثلها، لم يبارك له فيها۔"

اور خاص اس تعلیم میں ایک راز ہے یہ کہ جناب رسول اللہ ﷺ اپنی امت کو ذلت سے بچاتے ہیں اور یہ امر شاہد ہے کہ جس کے پاس جائیداد ہو، اس کی عزت تو جائیداد سے ہوتی ہے اور اگر وہ جائیداد بیچ دے گا تو اس کی وہ عزت ہرگز نہ رہے گی، اس لیے اس کو رکھنے کے واسطے فرمایا یہاں تک کہ اگر کسی مصلحت سے فروخت کرے تو پھر دوسری فوراً لے لے اور جس کے پاس جائیداد نہ ہو تو اس کی جو عزت ہوگی، وہ ویسے ہی ہوگی، پھر جائیداد خرید کر کے کیوں جھگڑے میں پڑے۔ یہ خوبی ہے اس قانون میں کوئی قانون ہے شریعت کے سوائے جو عقلِ سلیم اور فطرتِ صحیح کے موافق ہو۔

(وعظ: احکام المال، صفحہ نمبر: ۹۸، ۹۹، جلد نمبر: ۸ حقیقت مال وجاہ)
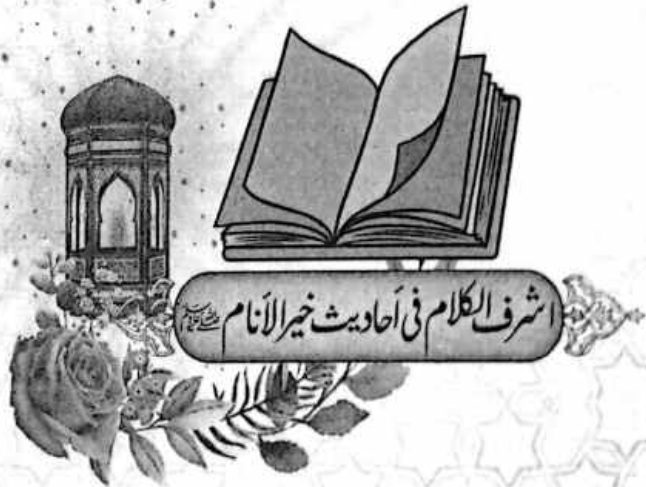
کتاب النکاح
اشرف الکلام فی احادیث خیر الانام ﷺ
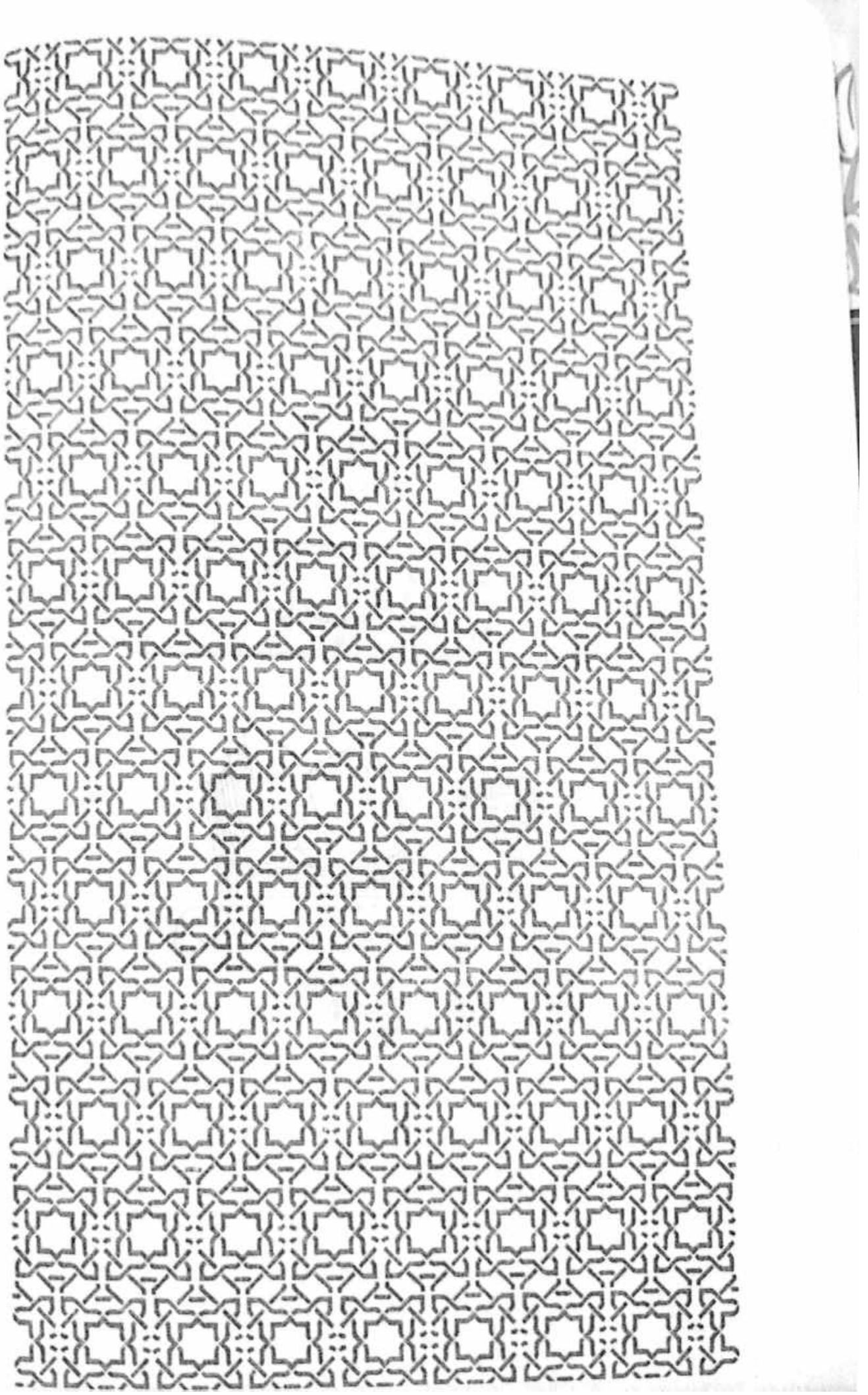
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب النکاح

حضورِ اقدس ﷺ کا قربِ نساء میں لذت پر دفع حاجت غالب رکھنے کی تعلیم

حضور ﷺ فرماتے ہیں:

فان معها مثل الذی معها(۱)

(کہ جو چیز اس کے پاس ہے ویسی ہی اس کے پاس ہے)

ظاہر میں یہ جملہ معمولی بات ہے، مگر حقیقت میں یہ ایک قاعدۂ عظیمہ پر تنبیہ ہے جس کی تقریر حضرت استاذ علیہ الرحمۃ نے فرمائی ہے جو کسی کے کلام میں میری نظر سے نہیں گزری، اس کو بیان کرتا ہوں، اس سے آپ کو ہمارے اکابر کے کمال علوم کا اندازہ ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ متناولات میں چار قسم کی چیزیں ہیں: بعض میں محض لذت مقصود ہے، جیسے فواکہ، بعض میں دفع حاجت مقصود ہے، بعض میں دونوں مقصود ہیں، مگر غالب حاجت ہے، جیسے اغذیہ یومیہ، بعض میں دونوں غالب ہیں، مگر غالب لذت ہے اور عادۃً قرب نساء ایسی ہی چیز ہے، پس حضور ﷺ نے اس جملہ میں ہم

---

(۱) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن جابر بن عبدالله رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث ۱۱۵۸ باب ماجاء فی الرجل یری المرأة یعجبه، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۵۵۷۲

کو اس امر کی تعلیم فرمائی ہے کہ تم اس میں بھی حاجت ہی کو غالب رکھو اور دفعِ حاجت میں اجنبیہ اور منکوحہ دونوں برابر ہیں، یہ مطلب ہے:

"ان معها مثل الذی معها (ای انهما مساویان فی قضاء الحاجة"

سبحان اللہ! بے نظیر علم ہے۔

غضِ بصر کا علاج

شارع نے اس حدیث "معشر الشباب! تزوجوا... الخ"(۱) میں نکاح کی ترغیب اس لیے دی ہے، تا کہ غضِ بصر سہل ہو جاوے اور یہ شارع کے ذمہ نہ تھا، بلکہ محض عنایتِ تسہیل کی وجہ سے ارشاد فرمایا کہ جس کو غضِ بصر دشوار ہو، وہ نکاح کر لے، گو شارع کو یہ بھی حق تھا کہ بدون اس کے بھی غضِ بصر کا امر فرما دیں، کیونکہ نظر اختیاری ہے، جیسا کہ اوپر مفصل مذکور ہوا اور اس سے معلوم ہوا کہ کبھی شارع بھی تسہیل کا لحاظ فرماتے ہیں، پس صوفیاء اہل بدعت نہیں جو اعمال شرعیہ میں سہولت کا طریق بتلاتے ہیں اور اسی میں مشائخ علماء ظاہر سے ممتاز ہیں، کیونکہ علماء اس کو نہیں جانتے، پس صوفیاء پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے یہ بدعت کہاں سے نکالی کہ اعمالِ شرعیہ کی تسہیل کے طرق بتلاتے ہیں؟ میں نے بھی بتلا دیا کہ شارع نے بھی کبھی اس کا لحاظ فرمایا ہے، چنانچہ اول شارع نے تسہیلِ غضِ بصر کے نکاح کو تجویز کیا اور جو نکاح پر قادر نہ ہو، اس کے لیے اسی تسہیل کے لیے ارشاد ہے:

ومن لم یستطع فعلیه بالصوم، فانه له وجاء

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن عبدالله بن عمر رضی الله عنه مرفوعًا.

کہ جو نکاح نہ کر سکے، وہ روزہ رکھا کرے، کیونکہ روزہ بمنزلہ اختصاء کے ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر ہے، کیونکہ اختصاء کے بعد بھی بعض دفعہ شہوت کم نہیں ہوتی، چنانچہ تجربہ ہے کہ ایسے لوگ باندیاں خریدتے ہیں اور ان سے مجامعت کرتے ہیں، ہاں ان کو انزال نہیں ہوتا اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قطع عضو کے بعد بھی شہوت باقی رہتی ہے، ایسا مرد مساحقہ کا طالب ہوتا ہے۔

ایک بزرگ سے میں نے ایک حکایت سنی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو شہوت باقی رہتی ہے، وہ حکایت یہ ہے کہ ایک شخص کو خضر علیہ السلام سے ملاقات کی تمنا بے حد تھی، چنانچہ ایک بار ملاقات ہوئی اور حضرت خضر علیہ السلام نے دریافت فرمایا کہ بتلاؤ! مجھ سے کیا کام ہے؟ کہا میرے لیے دعا کر دیجئے کہ بے فکری کی زندگی نصیب ہو، فرمایا دنیا میں بے فکری دشوار ہے، کیونکہ یہ دارِ ابتلاء ہے، یہاں چین نہیں ہو سکتا، ہاں! یہ ممکن ہے کہ تم دنیا میں مختلف لوگوں کی حالت دیکھ کر کسی ایک کو تجویز کر لو، میں دعا کروں گا کہ تم بھی ویسے ہی ہو جاؤ، اس نے کہا بہت اچھا، یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں کوئی تو بے فکر ملے گا، چنانچہ اس نے سیاحت شروع کی اور امراء وسلاطین کا امتحان شروع کیا، معلوم ہوا کہ ہر شخص کوئی نہ کوئی فکر ضرور کرتا ہے، بے فکر کوئی نہیں، پھر ایک جوہری کو دیکھا جو بڑا بے فکر ہے، صبح سے دکان کھولتا ہے، دس بارہ لڑکے جوان اس کے پاس دکان میں رہتے ہیں جو اس کے بیٹے معلوم ہوتے تھے اور نوکر چاکر ان کے علاوہ تھے، وہ صبح سے شام تک دکان پر بیٹھتا اور خوب خیرات کرتا اور تجارت بھی کرتا، ظاہر میں اس کو کوئی فکر معلوم نہ ہوتا تھا، یہ اس کے پاس تین دن ٹھہرا اور اس کو دیکھ بڑا خوش ہوا کہ بس میں بھی اسی کے مثل ہونے کی دعا کراؤں گا، پھر خیال ہوا کہ اس سے بھی دریافت تو کرنا چاہیے، مبادا اس کو کوئی ایسا فکر ہو جس کی مجھے اطلاع نہ ہو، چنانچہ

اس سے دریافت کیا اور وجہ بھی بتلادی کہ میں نے حضرت خضر علیہ السلام سے یہ درخواست کی تھی، انہوں نے یہ جواب دیا اور اب تجھ کو دیکھ کر مجھے خیال ہوتا ہے کہ تیرے جیسی زندگی کی دعا کراؤں، یہ سن کو وہ جوہری سانس بھر آبدیدہ ہوا اور کہا خدا میری جیسی مصیبت تو کسی دشمن کو بھی نہ دے، پھر قصہ بیان کیا کہ میری بیوی بہت حسین ہے، ایک دفعہ وہ بیمار ہوئی اور مرنے کے قریب ہوگئی، میں رونے لگا تو اس نے کہا کیوں روتے ہو؟ تم چار دن کے بعد دوسرا نکاح کرلو گے، پھر مجھے بھول جاؤ گے، میں نے کہا یہ ہرگز مجھ سے نہ ہوگا، کہا سب یونہی کہا کرتے ہیں تو میں نے استرہ نکال کر اپنا عضو کاٹ ڈالا کہ اب تو اطمینان ہوگیا، اس نے کہا واقعی اطمینان ہوگیا، اس کے بعد وہ کم بخت اچھی ہوگئی اور میں بے کار ہو چکا تھا تو اس نے نوکروں سے اپنا تعلق پیدا کرلیا اور یہ جتنے لڑکے آپ کے سامنے ہیں، سب انہی نوکروں کی عنایت، مگر میں خاموش ہوں کیا کہوں، کیونکہ یہ بلا میں نے اپنے ہاتھوں خریدی ہے، اب یہ شخص اپنے گھر واپس آیا اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، پوچھا، کہو! تم نے کسی کو تجویز کیا؟ کہا واقعی دنیا میں کوئی بھی فکر سے خالی نہیں، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا بس تم یہ خیال چھوڑ دو اور اس کی درخواست کرو کہ حق تعالیٰ تم کو اپنی محبت عطا فرمائیں اور آخرت کی بے فکری نصیب ہو، کہا ہاں، بس اسی کی دعا کر دیجئے، واقعی یہی بات ہے، پھر اگر کچھ بے فکری ہے تو وہ تعلق مع اللہ ہی میں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست
جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بغیر دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے، سوائے خلوت گاہ حق کے کہیں آرام نہیں ہے)

خلوت گاہ حق سے مراد تعلق مع اللہ ہی ہے تو اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اس شخص کو اپنی حالت پر حسرت تھی، اس حسرت میں خواہش کو بھی دخل تھا کہ تمتع کی خواہش موجود، مگر فقدانِ اسباب و آلات سے معذور اس لیے غم زدہ تھا اور روزہ ان سے سب سے بڑھ کر ہے کہ شہوت بھی کم ہو جاتی ہے اور انسان بھی بے کار نہیں ہوتا۔

(وعظ: التحصیل والتسہیل مع التکمیل والتعدیل، صفحہ نمبر: ۱۶۷ تا ۱۶۹، جلد نمبر: ۱۱ حقیقت تصوف وتقویٰ)

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے مختلف رنگ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا باوجود اس کم سنی کے بڑی بڑی عورتوں سے عقل و فہم و ادب میں کم نہ تھیں، بلکہ سب سے بڑھی ہوئی تھیں، بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے مشکل مسائل میں رجوع کرتے تھے اور ان کی فہم و سلامتِ رائے معلوم کرتے تھے، اسی عقل و فہم کا یہ اثر تھا کہ نو سال کی عمر میں بھی ان کے اندر بچیوں کی سی حرص و طمع نہ تھی، بلکہ دانا عورتوں کی طرح استغناء کی شان تھی۔

بڑی بات یہ تھی کہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے محبت تھی، وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عاشق تھیں، چنانچہ یہ جواب دے کر عرض کرتی ہیں کہ

یا رسول اللہ! میری ایک درخواست ہے، فرمایا وہ کیا؟ کہا وہ یہ کہ آپ میرے اس جواب کو دوسری ازواج سے بیان نہ فرمایئے گا۔ مطلب یہ تھا کہ کہیں میرا جواب سن کر میری تقلید میں سب یہی کہہ دیں اور وہ چاہتی یہ تھیں کہ سب اپنی اپنی رائے سے جواب دیں تو اچھا ہے، ممکن ہے کسی کی رائے دینا لینے ہی ہو تو وہ الگ ہو جائے اور رقیبوں کی تعداد کچھ کم ہو جائے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخواست کو منظور نہیں

فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کی کہ عائشہ نے کیا جواب دیا؟ تو میں بتلادوں گا، ہاں بدون پوچھے مجھے بتلانے کی ضرورت نہیں۔ (۱)

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس درخواست سے ان کی محبت کا رنگ معلوم ہوگیا کہ وہ یوں چاہتی تھیں کہ حضور ﷺ میں جو اتنے شریک ہیں، وہ کم ہوجائیں تو اچھا ہے اور اس میں دوسروں کے ساتھ برائی کا قصد نہ تھا، بلکہ اپنے لیے بھلائی کا قصد تھا کہ حضور ﷺ تنہا میرے ہی لیے ہوں اور اس تمنا میں عاشق معذور ہوتا ہے، ایک رنگ تو یہ تھا۔

ایک رنگ یہ تھا کہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ میری بہن سے شادی کر لیجے، حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم کو یہ گوارا ہے؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! میں آپ کے پاس اکیلی تو ہوں نہیں، بلکہ اب بھی میرے شریک بہت ہیں تو اگر اس خیر میں میری بہن شریک ہوجائے تو اس سے معتبر کیا ہے، غیروں کی شرکت سے بہن کی شرکت تو پھر اہون ہے، حضور ﷺ

---

(۱) أخرجه الشيخان فى صحيحيهما، أخرجه الامام البخارى عن ابن عباس رضى الله عنهما، رقم الحديث: ٢٤٦٨، (باب الغرفة والعلية المشرفة وغير المشرفة فى السطوح وغيرها)، والامام مسلم عن جابر بن عبدالله رضى الله عنه، رقم الحديث: ١٤٧٨، (باب بيان أن تخيير امرته لا يكون طلاقا الا بالنية)، ولفظه: فقال: يا عائشة، انى أريد أن أعرض عليك امرا أحب أن لا تعجلى فيه حتى تستشيرى أبويك، قالت: وما هو يا رسول الله؟ فتلا عليها الآية، قالت: أفيك يا رسول الله، أستشير أبوى؟ بل أختار الله ورسوله، والدار الآخرة، وأسلك أن لا تخبر امرأة من نسائك بالذى قلت، قال: لا تسلنى امرأة منهن الا أخبرتها، ان الله لم يبعثنى معنتا، ولا متعنتا، ولكن بعثنى معلما ميسرا.

نے فرمایا کہ یہ میرے واسطے حلال نہیں۔ (۱)

عشق کا ایک رنگ یہ بھی ہے کہ جو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا میں تھا، کیونکہ وہ بہن کا سوت ہونا محض اس لیے گوارا کرتی تھیں کہ میری بہن کو بھی حضور ﷺ سے خاص تعلق ہو جائے جو اس کے لیے سعادتِ آخرت کا سبب ہو، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے تعلق کی کتنی قدردان تھیں۔

(وعظ: النسواں فی رمضان، صفحہ نمبر: ۱۷۵-۱۷۶، جلد نمبر: ۱۰ افضائل صوم وصلوۃ)

حضور اقدس ﷺ کی موجودگی میں چھوٹی بچیوں کا دف بجانا

حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ عید کے دن وہ نابالغ لڑکیاں رسول اللہ ﷺ کے سامنے گا رہی تھیں، حدیث میں اس کے ساتھ ہی یہ بھی آتا ہے کہ ولیستا بمغنیتین کہ وہ گانے والیاں نہ تھیں، یعنی ان کو با قاعدہ گانا نہیں آتا تھا، یوں ہی بے قاعدہ محض خوشی کے طور پر گا رہی تھیں، (۲) پس اس سے مطلقا غنا کے جواب پر استدلال نہیں ہوسکتا۔

---

(۱) أخرجه الشيخان فی صحيحهما عن أم المؤمنين أم حبيبة رضی الله عنها مرفوعا، ولفظه: قالت: دخل علی رسول الله ﷺ، فقلت له: هل لك فی أختی بنت أبی سفيان؟ فقال: أ فعل ماذا؟ قلت: تنكحها، قال: أو تحبين ذلك؟ قلت: لست لك بمخلية، وأحب من شركنی فی الخير أختی، قال: فانها لا تحل لی الی اخر الحديث.

(۲) أخرجه الشيخان فی صحيحهما عن عائشة رضی الله عنها مرفوعا، ولفظه: عن عائشة رضی الله عنها، قالت: دخل أبو بكر وعندی جاريتان من جواری الأنصار تغنيان بما تقاولت الأنصار يوم بعاث، قالت: وليستا بمغنيتين، فقال أبو بكر: أمزامير الشيطان فی بيت رسول الله ﷺ وذلك فی يوم عيد، فقال رسول الله صل الله عليه وسلم: يا أبابكر، ان لكل قوم عيدا وهذا عيدنا.

غرض حدیث میں آتا ہے کہ وہ لڑکیاں گا رہی تھیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے، جب بھی وہ گاتی رہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تو ان کو دیکھ کر وہ خاموش ہوگئیں اور گانا بند کر دیا، رسول اللہ ﷺ نے اس پر تبسم فرمایا اور فرمایا کہ اے عمر! شیطان تم سے بھاگتا ہے، خدا کی قسم! اگر تم ایک راستہ کو چلو گے تو شیطان اس راستہ کا چلنا چھوڑ دے گا۔

اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ غنا حرام تھا تو خود رسول اللہ ﷺ نے کیوں نہ منع فرمایا اور اگر جائز تھا تو آپ ﷺ نے ان کے قطع غنا پر یہ کیوں فرمایا شیطان عمر رضی اللہ عنہ سے بھاگتا ہے۔

اس کا بھی جواب اسی قاعدہ سے نکلتا ہے کہ ہر شے کی حد ہے، مباح کی بھی ایک حد ہے اور یہ غنا حد مباح کے اندر تھا، مگر اس وقت مباح کی حد ختم ہو چکی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اتفاقاً تشریف لے آئے اور ان کے دیکھتے ہی گانے والیاں خاموش ہوگئیں، اگر وہ خاموش نہ ہوتیں تو رسول اللہ ﷺ خود فرما دیتے، مگر حضور ﷺ کو تعجب و تبسم اس پر ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صورت دیکھتے ہی بدوں ان کے کچھ کہے گانے والیاں خود ہی چپ ہوگئیں۔

اس پر حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بشارت دی کہ شیطان تم سے بھاگتا ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ غنا اس وقت بھی حدِ مباح پر تھا، مگر یہ ایسا مباح ہے جس کو شیطان اپنی کامیابی کا وسیلہ بنایا کرتا ہے، کما فی الحدیث والشعر من مزامیر اِبلیس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رعب ایسا تھا کہ ان کے سامنے ایسا مباح واقع نہ ہو سکتا تھا جس میں شیطان کا کچھ بھی حصہ ہو ویجوز مثل هذا المباح بحضرة الرسول ﷺ لکونه شارعا لحدود المباح والحرام ونحوهما۔

(وعظ: الاجر النبیل، صفحہ نمبر: ۴۶۸ تا ۴۶۹، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر و شکر)

کتاب الحدود
اشرف الکلام فی احادیث خیر الانام ﷺ
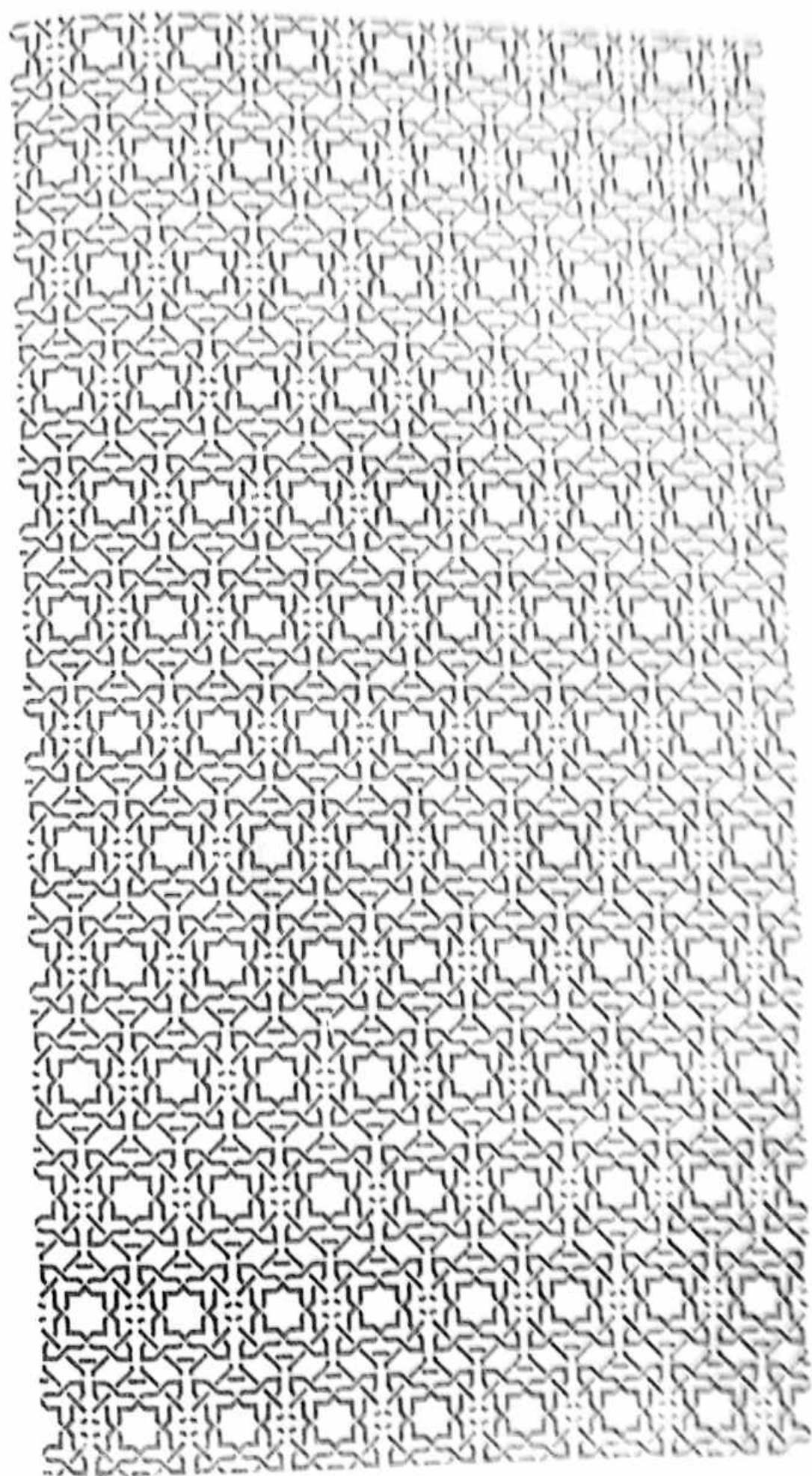
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کتاب الحدود

رسی اور انڈہ چوری کرنے سے ہاتھ کاٹنے تک نوبت آسکتی ہے

حدیث شریف میں آیا ہے:

لعن الله السارق یسرق البیضة فتقطع یده ویسرق الحبل فتقطع یده (۱)

یعنی اللہ چور پر لعنت کرے، بیضہ چراتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور رسی چراتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ اس حدیث کی شراحِ حدیث نے مختلف توجیہیں کی ہیں، اس لیے کہ حبل اور بیضہ کے سرقہ میں کسی کے نزدیک قطع نہیں ہے، اس لیے کہ ان چیزوں کی قیمت نصاب سرقہ کی برابر نہیں ہے، چنانچہ بعض نے کہا کہ بیضہ کے معنی متبادر نہیں، بلکہ دوسرے معنی، یعنی خود مراد ہے اور حبل سے کشتی کا لنگر مراد ہے کہ اسکی قیمت قدر نصابِ قطع کو پہنچ جاتی ہے، بعض نے اور توجیہات کی ہیں۔

ہمارے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اس حدیث کے معنی نہایت لطیف بیان فرمائے کہ اس میں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے، وہ یہ ہیں کہ قلیل کثیر کی طرف مفضی ہوجاتا ہے، اول بیضہ اور رسی چرایا تھا، پھر حوصلہ ہوا کہ بڑی چیز چرانے لگا حتیٰ

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ مرفوعا.

کہ ہاتھ بھی کٹ گیا تو مطلب یہ ہوا کہ چور کی بھی کیا بری وقعت ہے کہ اس نے اول بیضہ چرایا تھا، جس پر قطع کا شبہ بھی نہ تھا، مگر اس کی بدولت آج یہ نوبت آئی۔

حاصل یہ ہے کہ چھوٹا گناہ بڑھ کر بڑا ہو جاتا ہے، اسی واسطے بزرگوں نے فرمایا ہے:

انتم تخافون المعاصی و نحن نخاف الکفر (۱)

یعنی کہ تم لوگ تو معاصی سے ڈرتے ہو اور ہم کفر سے ڈرتے ہیں، اس لیے گناہ کی سرحد کفر کے ساتھ ملی ہوئی ہے، رفتہ رفتہ کفر کی نوبت آجاتی ہے، چنانچہ آدمی اول جب گناہ کرتا ہے تو دل پر ظلمت ہوتی ہے، پھر کرتا ہے تو اور زیادہ ظلمت ہوتی ہے، پھر بتدریج اس قدر ظلمت بڑھتی ہے کہ روکنے والے کے ساتھ معاداۃ اور مضادۃ ہو جاتی ہے، پھر اس گناہ کی برائی بالکل دل سے نکل جاتی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ شر اگرچہ قلیل ہو، اس سے بچے اور خیر بھی اگرچہ قلیل ہو، اس کو حقیر نہ سمجھے۔

(وعظ: عمل الذرہ، صفحہ نمبر: ۴۸۹، جلد نمبر: ۱۹ آداب انسانیت)

---

(۱) قال الإمام الغزالی فی "احیاء علوم الدین" (۴/ ۱۷۲) "باب بیان الدوء الذی به یستجلب حال الخوف": وروی عن للمسیح علیه الصلاة والسلام أنه قال یا معشر الحواریین أنتم تخافون المعاصی ونحن معاشر الأنبیاء نخاف الکفر

کتاب الامارۃ والقضاء
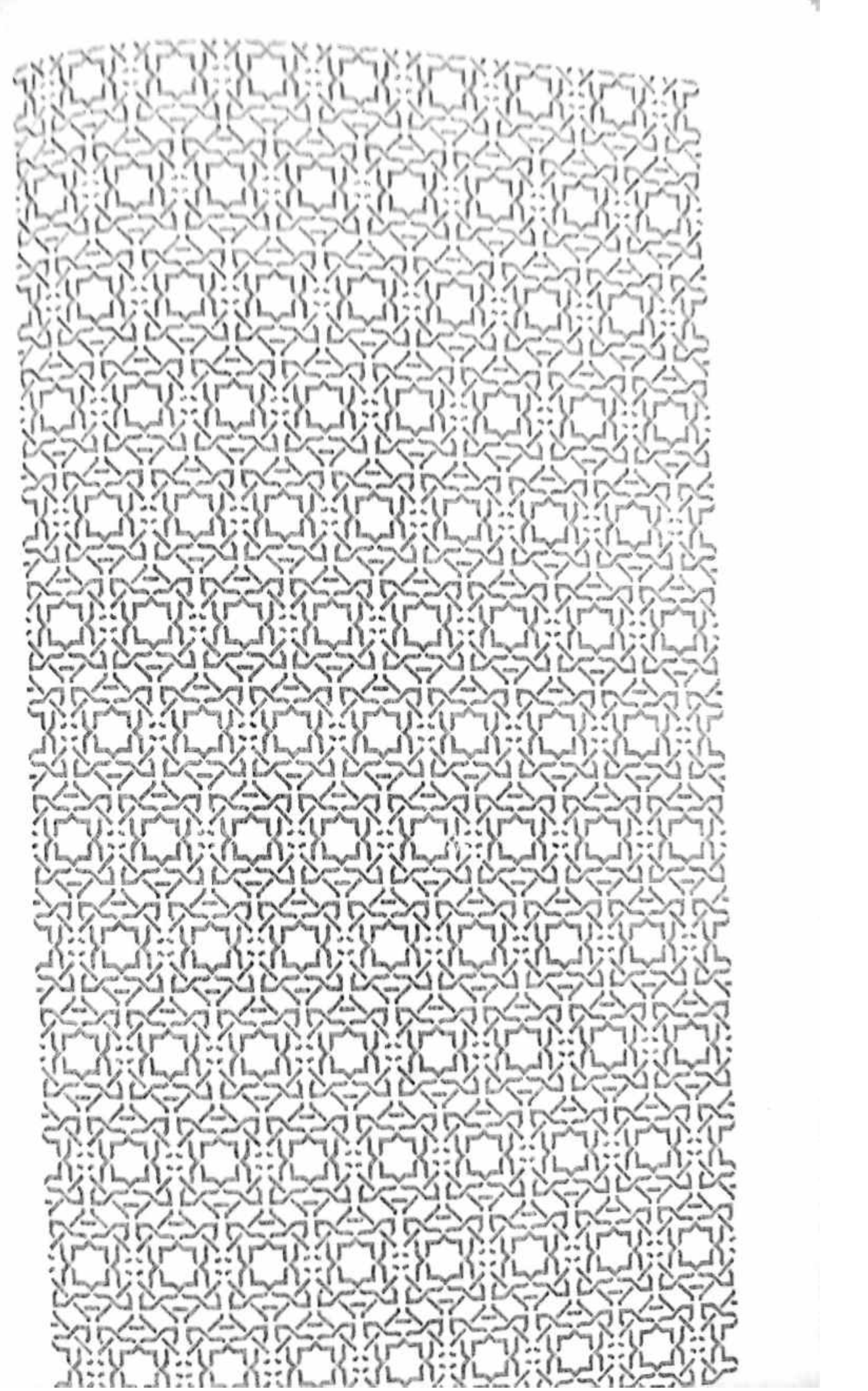
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الامارۃ والقضاء

مجبوری کی شہرت مضر نہیں

افسوس! آج کل کے علماء کے اندر یہ بات نہیں دیکھی جاتی بلکہ جگہ جگہ یہ سننے میں آیا ہے کہ وہاں امامت پر جھگڑا ہے وہاں وعظ پر فساد ہے۔ بات یہ ہے کہ مقصود جاہ ہے اس میں دوسرا شریک ہوجاتا ہے تو ناگواری ہوتی ہے۔ خدا مقصود نہیں۔ اگر خدا مقصود ہوتا تو یہ امامت ومنصب وبالِ جان معلوم ہوتا۔

ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ حضرت کو ایک شخص نے رقعہ دیا۔ اس میں یہ مضمون تھا کہ آپ کا فلاں مرید ایسے ایسے کام کرتا ہے۔ اس کو منع کر دیجیے، ورنہ اندیشہ ہے کہ لوگ حضرت سے بے اعتقاد ہوجائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ بھائی دوسروں پر کیوں رکھتے ہو۔ اگر تمہارا جی بے اعتقاد ہونے کو چاہتا ہے تو تم بے اعتقاد ہوجاؤ اور مجھے تم لوگوں کی بے اعتقادی سے کیا ڈراتے ہو۔ میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ مخلوق مجھے چھوڑ دے اور مردود سمجھ کر مجھ سے سب الگ ہوجائیں۔ بس میں ہوں اور میرا خدا!

ارے مجھے تو تمہارے اعتقاد نے پریشان کر دیا ہے کہ مجھے اپنے خدا کو یاد کرنے کا بھی یک سوئی کے ساتھ وقت نہیں ملتا۔ واقعی عاشق تو یہ چاہتا ہے کہ اس کا حال یہ ہو۔

چہ خوش وقتے وخرم روز گارے
کہ یارے برخوردار وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت ہے اور اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی محب اپنے محبوب کے وصال سے متمتع ہو)

اگر کسی کا یہ مذاق ہو جائے تو اس منصب اور امارت وشہرت سے خود ہی نفرت ہو جائے گی۔ اور اگر یہ مذاق نہ ہو اور شہرت کی ہوس ہی ہو تو اس کی تحصیل کا بھی وہ طریق نہیں جو رسمی علماء نے آج کل اختیار کیا ہے بلکہ اس کا طریق بھی فنا اور مٹانا ہی ہے۔ اپنے کو جتنا مٹاؤ گے اتنا ہی مشہور ہو گے۔ گو اس نیت سے فنا کا اختیار مذموم ہے مگر اس شہرت کا ترتب ضرور ہو جائے گا۔ جو تمہارا مدعا ہے، نیز اہل اسلام تمہاری پارٹی بندیوں کے شر سے محفوظ رہیں گے۔ اس کو ایک شاعر کہتا ہے ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقاء را

(اگر شہرت کی خواہش ہے تو گوشہ اختیار کرو اس لئے کہ گوشہ گیری سے عنقاء کے نام کی شہرت ہے)

مگر شہرت کی طلب نہ معلوم لوگوں کو کیوں ہے۔ اس میں کیا خوبی انہوں نے دیکھی ہے۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اس کی حقیقت تو صرف اتنی ہے کہ لوگ ہم کو بڑا سمجھیں جو کہ محض ایک خیالی شئے ہے تو نفع محض وہمی وخیالی اور ضرر اس کا واقعی۔ جس کو مولانا فرماتے ہیں

اشتہار خلق بند محکم است
بند ایں از بند آہن کے کم ست

چشمہا و خشمہا و رشک ہا

بر سرت ریزد چو آب از مشبا

(مخلوق میں شہرت مضبوط بند ہے، یہ بند لوہے کے بند سے کم نہیں ہے، غصہ اور آنکھیں اور رشک تیرے سر پر ایسا ٹپکتے ہیں جیسے نلکوں سے پانی ٹپکتا ہے)

مشہور آدمی سے لوگوں کو حسد و عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے در پے ہو جاتے ہیں۔ اور بستی میں جب کوئی نئی واردات ہوتی ہے، تو سب سے پہلے مشہور آدمیوں کی گردن ناپی جاتی ہے، گم ناموں، گھس گھدوں کو کون پوچھتا ہے، اس لیے سلامتی اسی میں ہے کہ

خویش را رنجور و سازو زار زار

تا ترا بیروں کنند از اشتہار

اپنے کو گم نام کرو، دنیا کی راحت بھی اسی میں ہے اور دین کی راحت بھی، کیونکہ گم نام آدمی کو یکسوئی اور خلوت کا موقع بہت ملتا ہے اور خلوت کو صفائی قلب میں بہت دخل ہے۔

قعر چہ بگزید ہر کہ عاقل ست

زانکہ در خلوت صفائی دل ست

جو شخص عاقل ہے وہ خلوت کو اختیار کرتا ہے، اس لیے کہ خلوت میں صفائی قلب ہے۔

ہاں جس شخص کو خود اللہ تعالیٰ مشہور فرما دیں اور وہ شہرت کا طالب نہ ہو تو وہ مجبور ہے اور اس مجبوری کی وجہ سے یہ شہرت مضر بھی نہیں ہوئی، کیونکہ غیب سے اس شخص کی

امداد ہوتی ہے، اور جو طالب شہرت کا ہوگا اس کو ضرور نقصان پہنچے گا، جس کی دلیل حدیث صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ صحابی کو فرمایا تھا

لاتسئل الإمارة، فإنك إن أعطيتها عن مسئلة وكلت إليها، وإن اعطيتها عن غير مسئلة أعنت عليها[1]

(تم حکومت کے عہدہ کے طالب نہ ہو، اگر تم نے اس کو طلب کیا تو تم کو اس کی طرف سونپا جائے گا اور اگر بلا طلب وہ عہدہ تم کو مل گیا تو تمہاری اس میں اللہ کی طرف سے امداد کی جائے گی)

یہ مضمون میں نے اس لیے بیان کر دیا کہ میں نے سنا تھا کہ اس شہر میں امامت وغیرہ پر بہت جھگڑے رہتے ہیں تو علماء کے لیے لازم یہ ہے کہ ان کی امامت سے اگر ایک شخص کو بھی کراہت ہو تو فوراً اس سے علیحدہ ہو جائیں، پھر ان شاء اللہ بہت جلد وہ الگ کرنے والے ہی آگے ہاتھ جوڑیں گے۔ اور یہ یاد رکھئے! جب تک علماء حبِ مال وحبِ جاہ کو زائل نہ کریں گے، اس وقت تک عوام کی اصلاح نہیں ہو سکتی، نہ عوام کی نظر میں دین کی وقعت ہو سکتی ہے۔

(وعظ: الفاظ قرآن، صفحہ نمبر: ۱۰۰، جلد نمبر: ۲ علم وعمل)

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن عبدالرحمن بن سمرة رضي الله عنه مرفوعا.
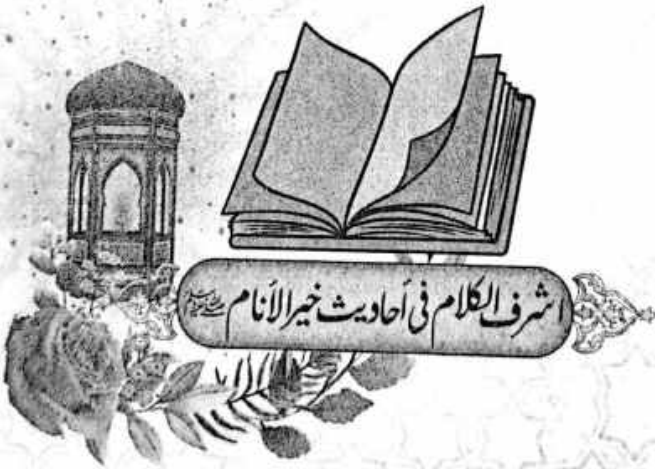
کتاب الجہاد
اشرف الکلام فی أحادیث خیر الأنام
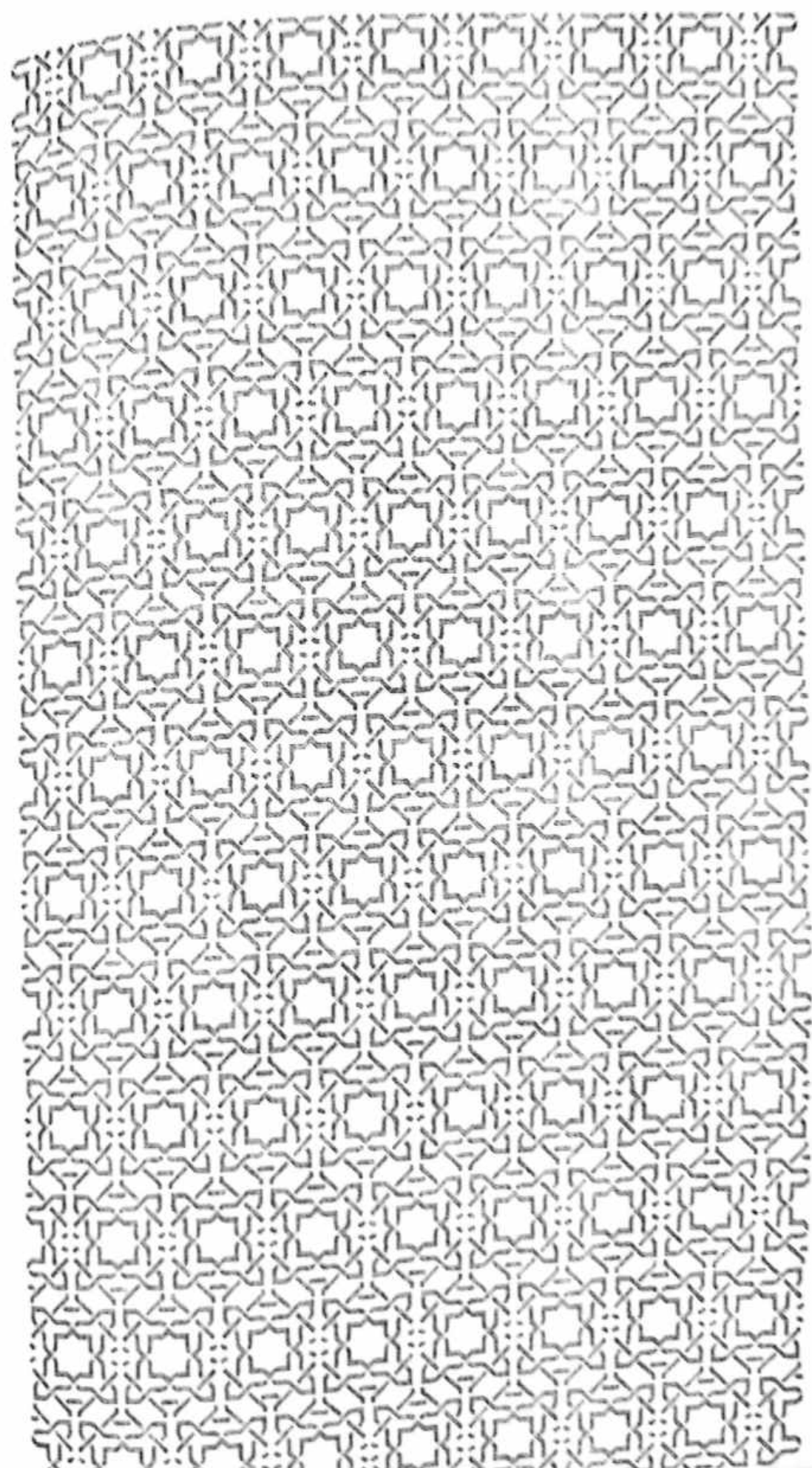
بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

کتاب الجہاد

شان وشوکت مطلقاً مذموم نہیں

رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک خواب میں فرمایا ہے:

رأیت طائفة من امتی راکبین هذا البحر ملوکا علی الاسرة یجاهدون فی سبیل اللہ او نحوه (۱)

کہ میں نے اپنی امت کی ایک جماعت کو دریا میں سفر کرتا ہوا جہاد کے لیے دیکھا، وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں، جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھے ہوں، یعنی شاہانہ ساز و سامان کے ساتھ جارہے ہیں تو حضور ﷺ نے ان لوگوں کی فضیلت بھی بیان فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ وہ شاہانہ سامان کے ساتھ ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ شان وشوکت کا سامان مطلق مذموم نہیں اور جن بزرگوں نے سلطنت ترک کر دی ہے، یہ ان کا غلبہء حال تھا، ورنہ حضرات کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے دنیا و دین کو جمع کر کے دکھلا دیا اور ان کی یہ شان تھی:

رهبان اللیل، لیوث النهار (۲)

---

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ مرفوعا.

(۲) العقوبات لابن أبی الدنیا (۱/۱۵۱).

کہ رات کو عابد و زاہد تھے، دن کو بہادر شیر تھے۔

(وعظ: اکبر الاعمال، صفحہ نمبر: ۳۹۲ تا ۳۹۳، جلد نمبر: ۲ علم و عمل)

آپ ﷺ کی تمنا

ودِدت أن أقتل فی سبیل اللہ، ثم أحییٰ، ثم أقتل [1]

(میں چاہتا ہوں کہ میں اللہ کے راستہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں)

پوری نہیں ہوئی کہ اس میں حضور ﷺ کی بے ادبی اور نیز عشاق کی دل شکنی کا اندیشہ تھا، اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اہانت کی صورت بھی حضور ﷺ کے نہیں ہوئی، اس لیے اللہ نے حضور ﷺ کو اس سے بچایا کہ آپ کے ہم قوم آپ کو نکال دیتے، حضور ﷺ کا رعب ان پر اتنا تھا کہ کسی کو ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ آپ کے ساتھ گستاخی کرے۔

(وعظ: روح الجوار، صفحہ نمبر: ۲۰۵، برکات رمضان جلد نمبر: ۱۶)

حضور ﷺ کا دو شقوں میں سے آسان شق کو اختیار کرنے کی وجہ

اتنی بڑی عالی ہمت ذات پاک کو کیا ضرورت تھی کہ دو شقوں (جانبوں) میں سے جب اختیار کیا تو آسان شق کو اختیار کیا [2] یعنی جہاں ایک مقصود کے دو طریق ہوں، ان میں سے آسان طریق کو لینا، اس میں دو راز ہیں: علم وسیع، حال۔

---

(۱) أخرجه الامام البیهقی فی السنن الکبریٰ عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث: ۱۸۵۵۴، مسند البزار رقم الحدیث: ۷۶۷۰

(۲) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن عائشة رضی الله عنها، ولفظه: ما خیر رسول الله ﷺ بین أمرین لا ... اثرا.

علم وسیع تو یہ ہے کہ مقصود کو غیر مقصود سے متمیز کرنا، کیونکہ اگر مشکل طریق کو اختیار کرتے تو طریق پر شبہ مقصود ہوتا اور خیال ہوتا کہ اگر یہ مقصود نہ ہوتا تو باوجود دشواری کے اس کو کیوں اختیار کیا جاتا۔

اور حال کیا ہے؟ معرفت ہے نور حق کی۔ آسان کو قبول نہ کرنا علامت ہے اعراض عن النعمة (نعمت سے روگردانی کرنے ۱۲) کی کہ خدا تعالیٰ نے تو سہولت برتی، مگر یہ قبول نہیں کرتے۔

اور نیز! اس میں ایک دلالت ہے حسن معاملہ پر بھی، کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ جو خود آسانی پسند ہوتا ہے، وہ دوسروں کو بھی دشواری میں نہیں ڈالتا، آپ ﷺ کو اس واسطے خدا تعالیٰ نے آسانی پسند بنایا تھا، تاکہ آپ ﷺ دوسروں کے لیے بھی آسانی ڈھونڈیں، آپ ﷺ سب کے ساتھ آسانی کا برتاؤ کرتے تھے، بیوی ہو، خواہ غلام ہو، غلام سے بھی جو فرمائش کی، آسان کی، اگر فی نفسہ وہ کام دشوار ہوا، سوچ کر آسان کر کے بتایا۔

غرض خود بھی کسی کو الجھن میں کبھی نہیں ڈالا اوروں کو بھی منع فرمایا۔

اتنی بات سے بھی منع فرمایا، ایک مرتبہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے، اجازت چاہی، آپ ﷺ نے پوچھا کون ہے؟ کہنے لگے: انا، یعنی میں ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا: میں، میں کیا کر رہے ہو[1]۔ اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ کون شخص ہے، کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو اس کی آواز صاحب خانہ پہچانے گا یا نہیں پہچانے گا، اگر آواز پہچانے گا تو یہ نہ پوچھے گا کہ کون ہے؟ اور اگر آواز نہ پہچانے گا تو میں ہوں کہنے سے کیا فائدہ؟ کیونکہ اس سے بھی آواز ہی معلوم ہوگی، اس واسطے

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن جابر بن عبد الله رضي الله عنهما مرفوعاً.

حضور ﷺ نے انا کہنا ناپسند فرمایا۔ اللہ اکبر! آپ ﷺ کی سہولت پسندی کس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اوروں کو بھی اس بات کی تعلیم دی کہ ایسا نہ کریں جس سے لوگ الجھن میں پڑیں۔

(وعظ: روح الجوار، صفحہ نمبر: ۲۰۶ تا ۲۱۷، جلد نمبر: ۱۶ برکات رمضان)

كتاب الأيمان والنذور
أشرف الكلام فی أحادیث خیر الأنام ﷺ
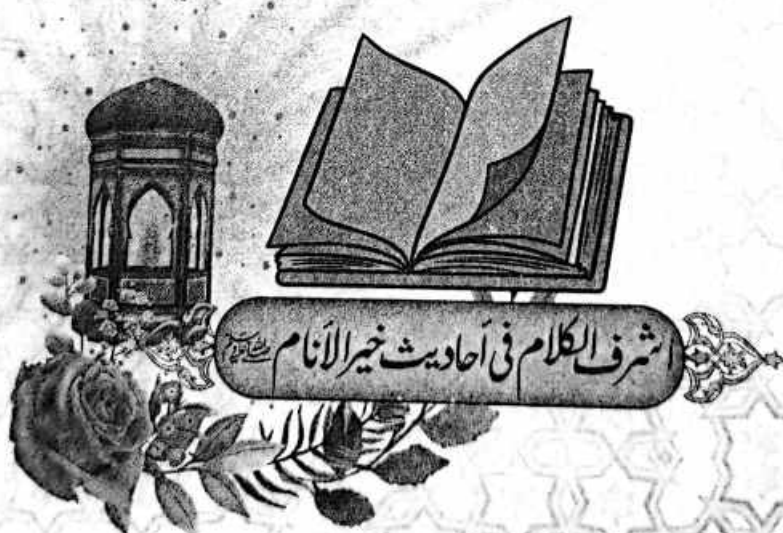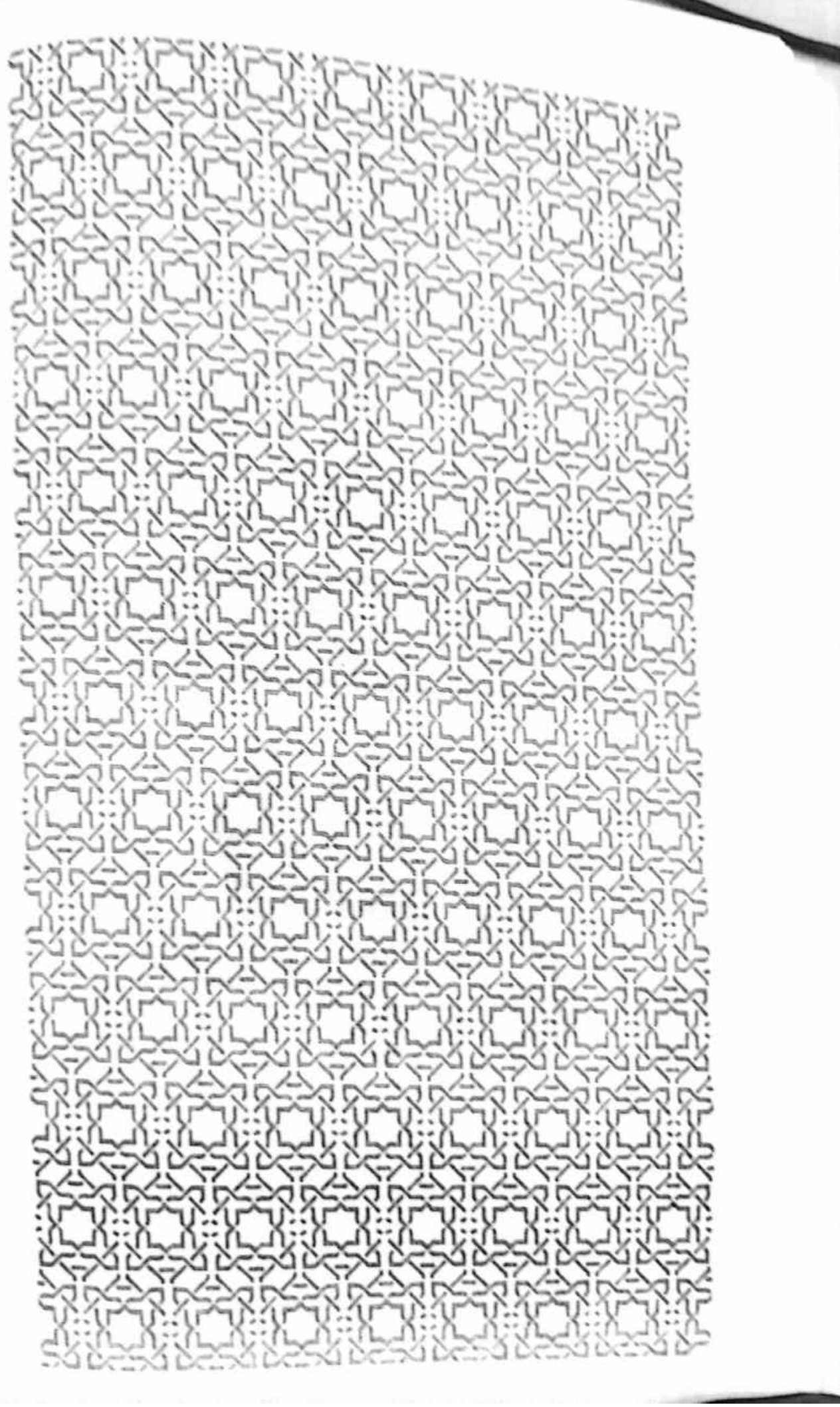
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کتاب الأیمان والنذور

نذر معلق مذموم ہے

نذر کے بارے میں حدیث میں آیا ہے:

لا یرد من القدر شیئا، وانما یستخرج بہ من البخیل [1]

کہ نذر سے تقدیر تو ٹلتی نہیں، ہوتا وہی ہے جو مقدر ہے، منت سے اس کے خلاف تو نہیں ہوسکتا، ہاں! اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے بخیل کا کچھ مال نکال دیتے ہیں، کیونکہ بخیل مصیبت کے ہی موقع پر کچھ نذر وغیرہ کی صورت میں مال خرچ کرتا ہے، ویسے اس کے ہاتھ سے مال نہیں نکلتا۔ اس پر ایک شبہ شاید سامعین میں سے کسی کو ہوا ہوگا کہ اس حدیث سے نذر کی مذمت مفہوم ہوتی ہے، حالانکہ نص میں "وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ" [2] (چاہیے کہ وہ اپنی نذروں کو پورا کریں، پارہ ۱۷، رکوع ۱۱) وراد ہے جس سے نذر کا عبادت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ نیز! علماء کا قول بھی ہے کہ نذر عبادت ہے جو حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، اسی لیے نذر لغیر اللہ حرام ہے اور عبادت کے لیے حسن لازم ہے، پھر نص میں وفاءِ نذر کا امر ہے اور مامور بہ قبیح نہیں ہوسکتا، اس کا

---

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنهما مرفوعا.

(۲) الحج الآیة:۲۹

جواب بعض محققین نے یہ دیا ہے عبادات لذاتہا نذرِ مطلق ہیں، جیسے یوں کہے:

نذرت للہ صوما و نذرت لہ صلوٰۃ و صدقۃ

کہ میں اللہ کے لیے روزہ کی نذر کرتا ہوں یا نماز وصدقہ کی نذر کرتا ہوں اور نذرِ مذموم نذرِ مقید ہے، گو عبادت لغیرہا ہو، جیسے یوں کہے کہ میرا بیمار اچھا ہو جائے تو اتنا صدقہ کروں گا، میرا مقدمہ فتح ہو جائے تو اتنے مساکین کو کھانا کھلاؤں گا، وغیرہ وغیرہ۔ سبحان اللہ! عجیب جواب ہے، واقعی شریعت کو انہی حضرات نے خوب سمجھا ہے اور خود حدیث اس فرق کو بتلارہی ہے، کیونکہ کراہت کی علت آپ ﷺ نے استخراج کو فرمایا ہے اور یہ نذرِ مطلق میں نہیں ہے، بلکہ نذرِ معلق میں ہے۔

(وعظ: افناء المحبوب، صفحہ نمبر: ۴۲۰ تا ۴۲۱، جلد نمبر: ۱۵ تسلیم ورضاء)

بچے اور مجذوب ایک ہی حکم میں ہیں

بچوں کی ضد جو کہ بظاہر گستاخی ہے، پسند کیے جانے پر مجھے ایک حلمی مجذوب کا قصہ یاد آ گیا، یعنی شبان موسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ نہ معلوم مولانا نے کہاں سے لکھا ہے، مگر قواعد کے خلاف نہیں، اس لیے اس کا ذکر بے جا نہیں، اس نے بھی اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسی ہی باتیں کی تھی، جیسے بچے کرتے ہیں، کیونکہ بچے اور مجذوب ایک ہی حکم میں ہیں، دونوں مرفوع القلم ہیں۔

اس پر یہ اشکال ہوگا کہ پھر وہ کیسے مقبول ہوا، کیونکہ جذب مانع اثم تو ہے، مگر سبب قبول نہیں۔

جواب یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاص کی وجہ سے مقبول ہوا جس کی تائید ابوداود کی ایک حدیث سے ہوتی ہے کہ ایک شخص نے ایک مقدمہ میں و اللہ الذی لا الہ الا ھو کہہ کر جھوٹی قسم کھائی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تیری قسم تو جھوٹی ہے، مگر خدا کا

نام تونے ایسے اخلاص سے لیا ہے کہ اس نے گناہ سے بھی تجھ کو بچادیا اور مقبول بنادیا أو کما قال۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اخلاص فی الطاعۃ گناہ کے ساتھ بھی جمع اور نافع ہوسکتا ہے تو جہل کی باتوں کے ساتھ بدرجہ اولیٰ جمع ہوسکتا ہے جو شبانِ موسیٰ سے صادر ہوئیں۔

اس پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ جب اس کی باتیں جہل سے ناشی تھیں تو موسیٰ علیہ السلام کو امر بالمعروف سے کیوں منع کیا گیا، جیسا مثنوی میں مذکور ہے؟

جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو امر بالمعروف سے منع نہیں کیا گیا، بلکہ زیادہ لتاڑنے سے منع کیا گیا تھا کہ انہوں نے اسے کافر ہی بنادیا تھا جس سے وہ سہم ہی گیا تھا۔

مطلب ممانعت الٰہیہ کا یہ تھا کہ جیسا کہ اس کا جہل اور تکلم بالجہل امر بالمعروف کو مقتضی تھا، اسی طرح اس کی دوسری حالت، یعنی محبت واخلاص دوسرے معاملہ، یعنی رعایت کی مقتضی تھی، پس امر بالمعروف میں نرمی کی کیا ضرورت تھی۔

(وعظ: آداب المصاب، صفحہ نمبر: ۳۷۱، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر وشکر)

(۱) أخرجه أبو داود فی سننه عن ابن عباس رضی الله عنهما مرفوعاً، ولفظه: فحلف بالله الذی لا اله الا هو، فقال رسول الله ﷺ: "بلی، قد فعلت ولکن قد غفر لك بإخلاص قول لا اله الا الله". کتاب الأیمان والنذور، باب فی من یحلف کاذباً متعمداً، رقمه: ۳۲۷۵
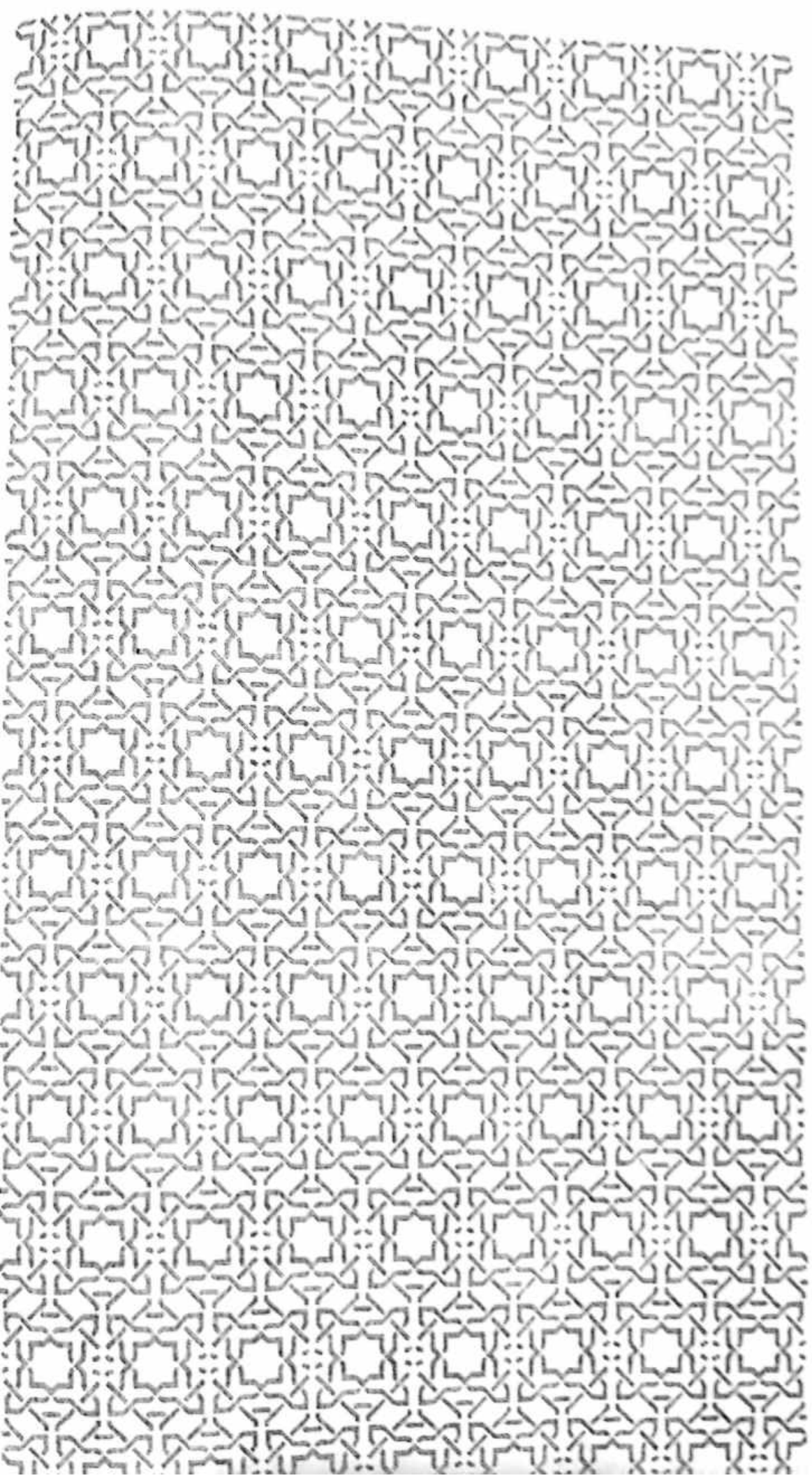
کتاب الذبائح
اشرف الکلام فی أحادیث خیر الأنام ﷺ
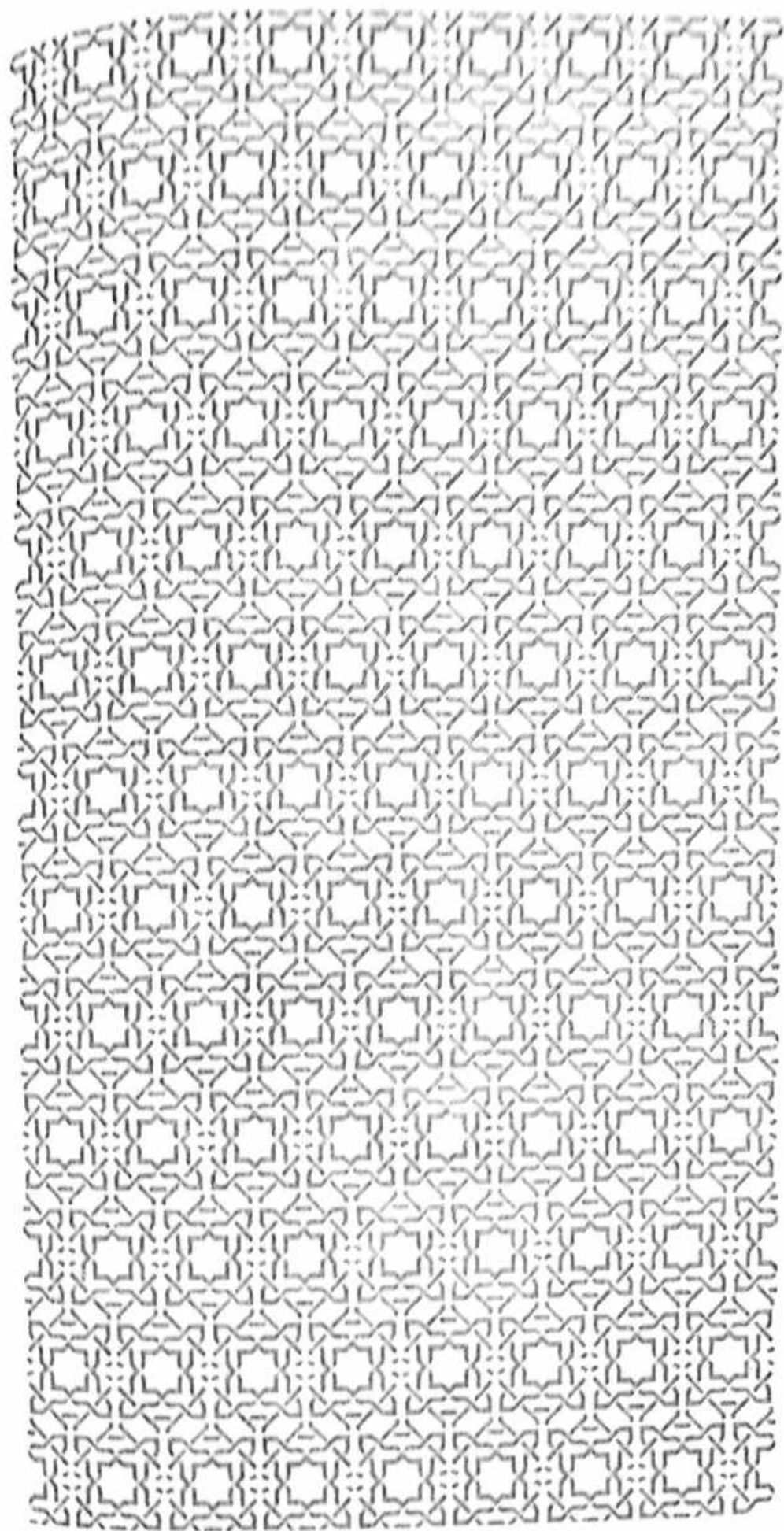
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الذبائح

اضحیہ سنتِ ابراہیمی ہے

جناب رسول اللہ ﷺ نے اضحیہ کو سنت ابراہیم علیہ السلام فرمایا ہے،(۱) حالانکہ جو عمل ابراہیم علیہ السلام نے کیا، وہ اور ہے اور تضحیہ دوسرا عمل ہے، ابراہیم علیہ السلام کا عمل ذبحِ ولد ہے اور تضحیہ ذبحِ حیوان ہے، پھر اضحیہ سنتِ ابراہیمی کیسے ہوئی؟ تو یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ہم کو اضحیہ میں اسی قدر ثواب ملے جس قدر کہ ابراہیم علیہ السلام کو ذبحِ ولد میں ملا تھا، دونوں عملوں کی غایت کی اتحاد کی وجہ سے دونوں عمل کو ایک فرمایا، گو عمل متغائر ہوں، گویا یہ فرمایا اے امت محمدیہ ﷺ! تم کو جانور کے ذبح میں وہی اجر ملے گا جو ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا۔ دیکھئے! کہ کس قدر فضیلت اضحیہ کی اس حدیث سے معلوم ہوئی۔ اور ایک نکتہ اس سے اور معلوم ہوا، وہ یہ کہ جب کوئی بادشاہ انعام تقسیم کرتا ہے، جو لوگ زیادہ مقرب ہوتے ہیں اور مرتبہ ان کا زیادہ ہوتا ہے، ان کو ان کے مرتبے کے موافق انعام ملا کرتا ہے، پھر ان سے جو کم درجے کے ہیں، ان کو اسی درجے کا انعام ملے گا، مثلاً وزراء وارکانِ دولت کو بہت بڑا انعام ملے گا اور ادنیٰ ادنیٰ چپڑاسیوں اور خدام کو کم، پس حق تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ سب

---

(۱) سنن ابن ماجه (۱۰٤٥/۲) ۳۱۲۷ - عن زيد بن أرقم، قال: قال أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا رسول الله ما هذه الأضاحي؟ قال: "سنة أبيكم إبراهيم".

مخلوق سے زیادہ ہے اور انبیاء علیہم السلام میں ابراہیم علیہ السلام بہت بڑے جلیل القدر ہیں کہ خلیل اللہ ہیں تو جو انعام ان کو دیا گیا ہوگا، ظاہر ہے کہ بہت بڑا انعام ہوگا کہ باوجود اتحاد فعل کے بھی دوسرے شخص کو اتنا انعام نہ دیا جانا چاہیے، یعنی اگر یہی فعل ذبحِ ولد کا دوسرا کرتا تو وہ اس قدر انعام پانے کا مستحق نہ سمجھا جاتا جس قدر کہ ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا ہے اور جہاں فعل بھی اس فعل سے ادون ہو وہاں تو اتنا ملنے کی گنجائش ہی نہیں، مگر باوجود اس کے کہ یہ عمل ہمارا ذبحِ ولد سے بدرجہا ادون ہے، پھر وہی انعام ہمارے لیے تجویز ہوا ہے، اللہ اکبر! کتنا بڑا انعام ہے اور امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر یہ برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کیسا لطف وکرم ہے، یہ فضیلت تو اضحیہ کی ایسی ہے کہ اگر کسی کے ذمہ واجب بھی نہ ہو تو اس ثواب کی تحصیل کے واسطے وہ بھی نہ چوکے اور جس طرح بن پڑے، بغیر کئے نہ رہے۔

(وعظ: ترغیب الاضحیہ، صفحہ نمبر: ۱۱۳ تا ۱۱۴، جلد نمبر: ۷ اسنتِ ابراہیم)
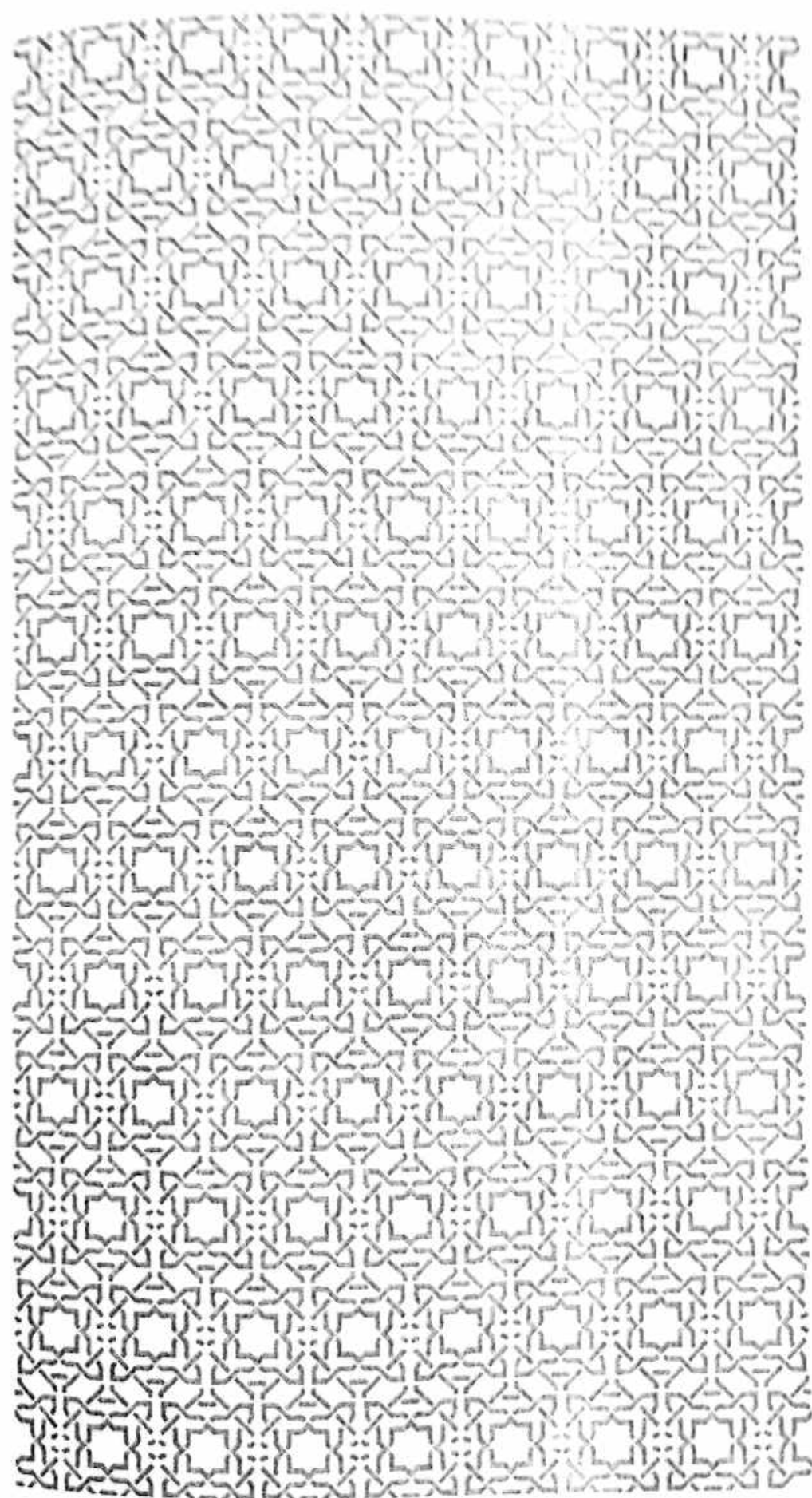
کتاب الأطعمة

بسم الله الرحمن الرحيم

كتاب الأطعمة

کفر کا خاصہ ہے کہ اس سے دنیا کی حرص بڑھتی ہے

المؤمن يأكل في معاء واحد، والكافر يأكل في سبعة امعاء[1]

حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ مسلمان ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان کی خوراک کافر سے کم ہوتی ہے، اس پر بعض کو اشکال پیش آیا ہے کہ ہم تو بعض مسلمانوں کی خوراک کافروں سے زیادہ دیکھتے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ ہر مسلمان کی خوراک ہر کافر سے کم ہوتی ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر کافر مسلمان ہو جائے تو اسلام کے بعد اس کی خوراک پہلے سے گھٹ جائے گی اور کفر کی حالت میں وہ جتنا کھاتا تھا، اب اس سے کم کھائے گا جس کی وجہ یہ ہے کہ کفر میں خاصہ ہے کہ اس سے دنیا کی حرص بڑھتی ہے، کافر کھانے کے وقت صرف پیٹ ہی نہیں بھرتا، بلکہ نیت بھی بھرتا ہے اور مسلمان صرف پیٹ بھرتا ہے۔

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن ابن عمر رضي الله عنهما.

اگر کسی کو اس جگہ یہ سوال پیدا ہو کہ تم نے تو حدیث کا مطلب ایسا بیان کیا کہ جس کے سمجھنے کے لیے کسی کافر کے اسلام کا انتظار کرنا پڑے گا تو میں جواب میں عرض کرتا ہوں کہ اگر تم کافر کے اسلام کا انتظار نہ کر سکو تو اس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم دو آدمی یکساں تن و توش کے ایک حالت کے لے لو، ایک مسلمان ایک کافر، پھر ان کی خوراک کی موازنہ کرو تو یقیناً مسلمان کو کافر سے کم خوراک والا پاؤ گے اور تم کو جو اس میں اشکال ہوا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ تم نے بعض جگہ صرف یہ دیکھ لیا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہے، دوسرا کافر ہے اور مسلمان کی خوراک کافر سے زیادہ ہے، یہ نہیں دیکھا کہ مسلمان تندرست مضبوط و توانا ہے اور کافر کمزور ہے یا مسلمان کئی وقت کا فاقہ زدہ ہے اور کافر فاقہ زدہ نہیں یا مسلمان تو پوری خوراک کھا رہا ہے اور بچانے کی فکر نہیں کرتا اور کافر اپنی پوری خوراک نہیں کھا رہا، بلکہ بخل کی وجہ سے پیٹ کا ٹکڑا کفایت کرنا چاہتا ہے تو ایسی اختلافی حالت میں موازنہ نہیں ہو سکتا، بلکہ موازنہ کی صورت وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کی کہ جس قوت و صحت و جسم کا مسلمان ہو اسی جیسا کافر بھی ہو اور دونوں یکساں حالت میں ہوں، ایک دوسرے سے زیادہ فاقہ زدہ نہ ہو اور دونوں اپنی خوراک کے موافق کھا رہے ہوں، کوئی بچت اور کفایت کے درپے نہ ہو جس کی سہل صورت یہ ہے کہ دونوں کو دعوت کے موقع پر دیکھو یا خود دعوت کرو، اس وقت معلوم ہوگا کہ واقعی مسلمان کافر سے کم کھاتا ہے اور جس طرح اسلام سے خوراک کم ہو جاتی ہے، اسی طرح حرص بھی کم ہو جاتی ہے۔

(وعظ: جمال جلیل، صفحہ نمبر: ۱۳۰ تا ۱۴۰، جلد نمبر: ۱۴ جزاو سزا)

شریعت کے احکامات میں ظاہری اور باطنی دونوں مصلحتیں موجود ہیں

حدیث میں کھانے کے بارے میں وارد ہوا ہے:

اذاحضر العشاء فابدؤا بالعشاء (۱)

یعنی جس وقت شام کا کھانا سامنے آجاوے تو پہلے کھانا کھالو اور پھر نماز پڑھو۔

کیا ٹھکانا ہے اس رعایت کا! اور شریعت کے احکام میں ظاہری مصلحت بھی ہے، باطنی بھی، ناسوتی مصلحت بھی اور ملکوتی بھی۔ ظاہری اور ناسوتی مصلحت تو یہ ہے کہ کھانا گرم اور حلوا نرم موجود تھا، خواہش کھانے کی تھی، ضرور تھا کہ اسی میں دل لگا رہتا ہے کہ خدا تعالی کے سامنے ایسی حالت میں حضورِ قلب کیسے ہوسکتا تھا؟ اور کس قدر خرابی ہے کہ خدا تعالیٰ کے سامنے ایسی حالت میں حاضر ہو، تو اگر اجازت نہ ہوتی تو ہم کہہ سکتے تھے اور عذر کر سکتے تھے کہ ہم طبعاً معذور ہیں، دل تو وہاں لگا ہے، ہم کیسے حضورِ قلبی سے حاضر ہوں، پس تم کو اجازت دے دی کہ پہلے حلوا کھایئے اور پھر جلوا دیکھئے، غرض دونوں مصلحتیں ملحوظ رکھی گئیں جو ظاہر کے دیکھنے والے ہیں، انہوں نے یہ مصلحت سمجھی کہ پیٹ بھر مل گیا اور جو اہلِ باطن ہیں، انہوں نے یہ مصلحت سمجھی کہ وہ حضرت پروردگار کے قابل ہو گئے اور ان میں حضوری کی استعداد پیدا ہو گئی۔

(وعظ: شعبان، صفحہ نمبر: ۳۸۲، جلد نمبر: ۷ حقیقت عبادت)

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن أنس بن مالك ﷺ مرفوعاً، ولفظه: إذا حضر العشاء وأقيمت الصلاة، فابدءوا بالعشاء." واللفظ لمسلم.
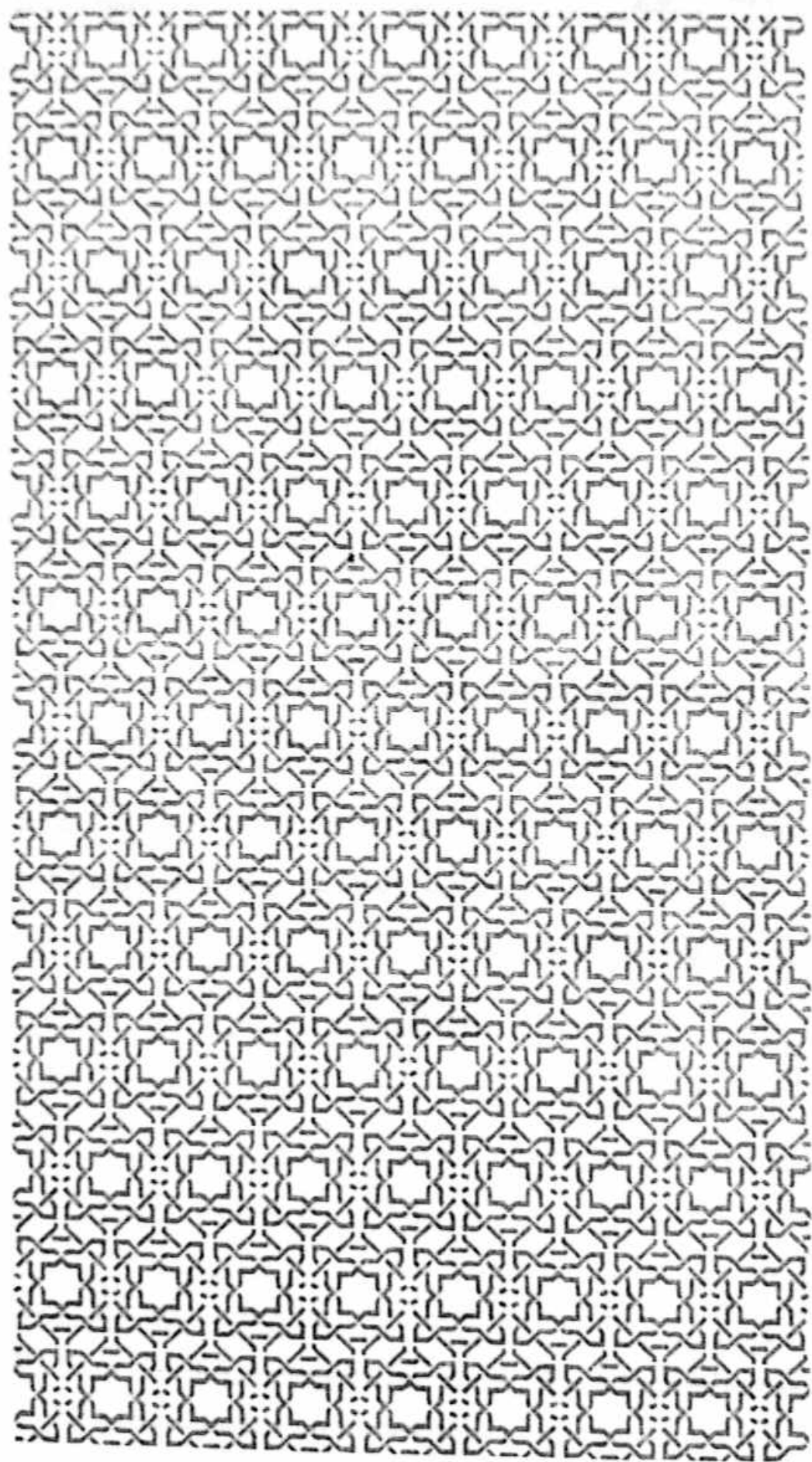
کتاب اللباس
اشرف الکلام فی أحادیث خیر الأنام ﷺ
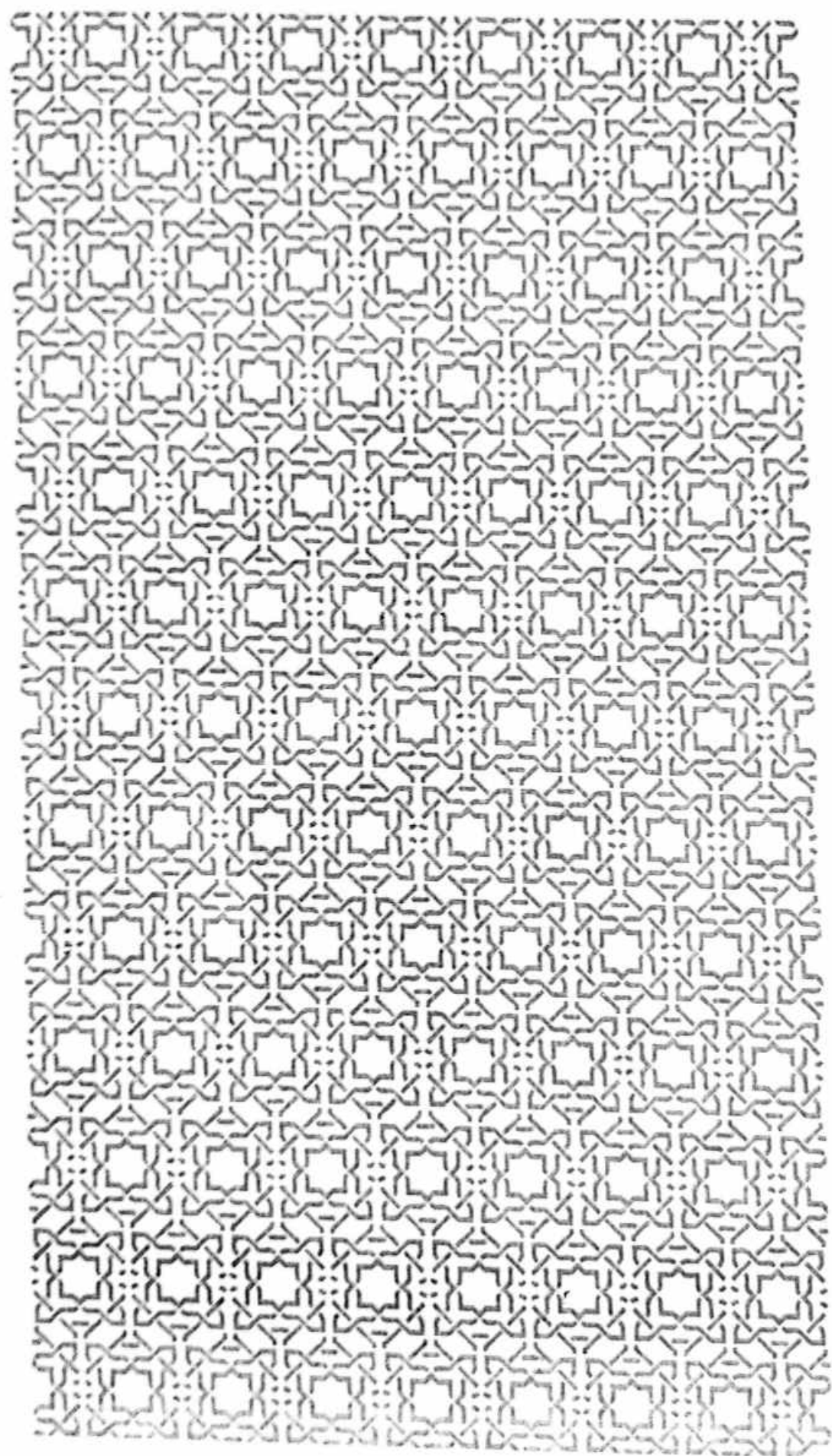
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب اللباس

رسوم، اشتراک علت کی وجہ سے دکھاوے والے کپڑے کے اندر داخل ہیں

من لبس ثوب الشهرة ألبسه الله ثوب الذل يوم القيامة (۱)

جو کوئی کپڑا دکھاوے کے لیے پہنے گا، اس کو قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنایا جائے گا۔

یہ حدیث کپڑے کے بارے میں بالکل صریح ہے اور رسوم کو باشتراکِ علت شامل ہے، اس وعید کی علت شہرت ہے جس کام میں شہرت کا قصد کیا جائے، سب اس کے اندر آ گئے، خواہ اس کو بیٹی کا دینا کہہ لو یا مہمانوں کی خاطر سمجھا کرو، جب عقل سے کام لوگی تو حقیقت میں بنا ان رسموں کی صرف دکھلاوے اور التزام ما لا یلزم ہی پر پاؤ گی۔

(وعظ: علاج الکبر، صفحہ نمبر: ۵۳۳ تا ۵۳۴، جلد نمبر: ۲۶ اصلاحِ اعمال)

---

(۱) أخرجه الامام ابن ماجه فی سننه عن ابن عمر رضی الله عنهما مرفوعا، رقم الحديث: ۳۶۰۶ باب من لبس شهرة من الثياب، ولفظه: من لبس ثوب شهرة ألبسه الله يوم القيامة ثوب مذلة

مسند احمد رقم الحدیث: ۵۶۶۴، السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث: ۹۴۸۷

غیر قوم کی ہر چیز نا جائز نہیں، بلکہ جو ان کے ساتھ مخصوص ہے

میں یہ نہیں کہتا کہ غیر قوم کی ہر چیز نا جائز ہے، بلکہ وہ نا جائز ہے جس کو خصوصیت ہے دوسری قوم کے ساتھ اور جس کو خصوصیت نہیں دوسری قوم کے ساتھ، وہ جائز ہے۔ مونڈھے کرسی میں امتیازی شکل نہیں رہی، وہ کسی خاص قوم کی وضع نہیں سمجھی جاتی، اس لیے جائز ہے اور سایہ وغیرہ میں امتیازی شکل باقی ہے، اس لیے نا جائز ہے، اس کی علامت یہ ہے کہ اگر طبیعت کھٹک جائے کہ یہ تو فلاں قوم کا طرز ہے تو تشبہ ہے، ورنہ تشبہ نہیں، چنانچہ سایہ وغیرہ دیکھ کر فوراً دیکھنے والے کا ذہن منتقل ہوتا ہے کہ یہ تو میموں کا طرز ہے اور کرسی مونڈھے میں ایسا نہیں ہے، اسی پر دوسری چیزوں کو قیاس کرلو۔

(وعظ: احکام المال، صفحہ نمبر: ۱۱۴، جلد نمبر: ۸ حقیقت مال وجاہ)
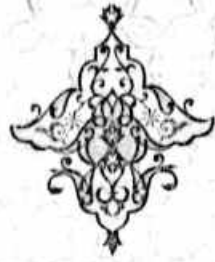
کتاب الآداب والرقاق

اشرف الکلام فی أحادیث خیر الانام ﷺ
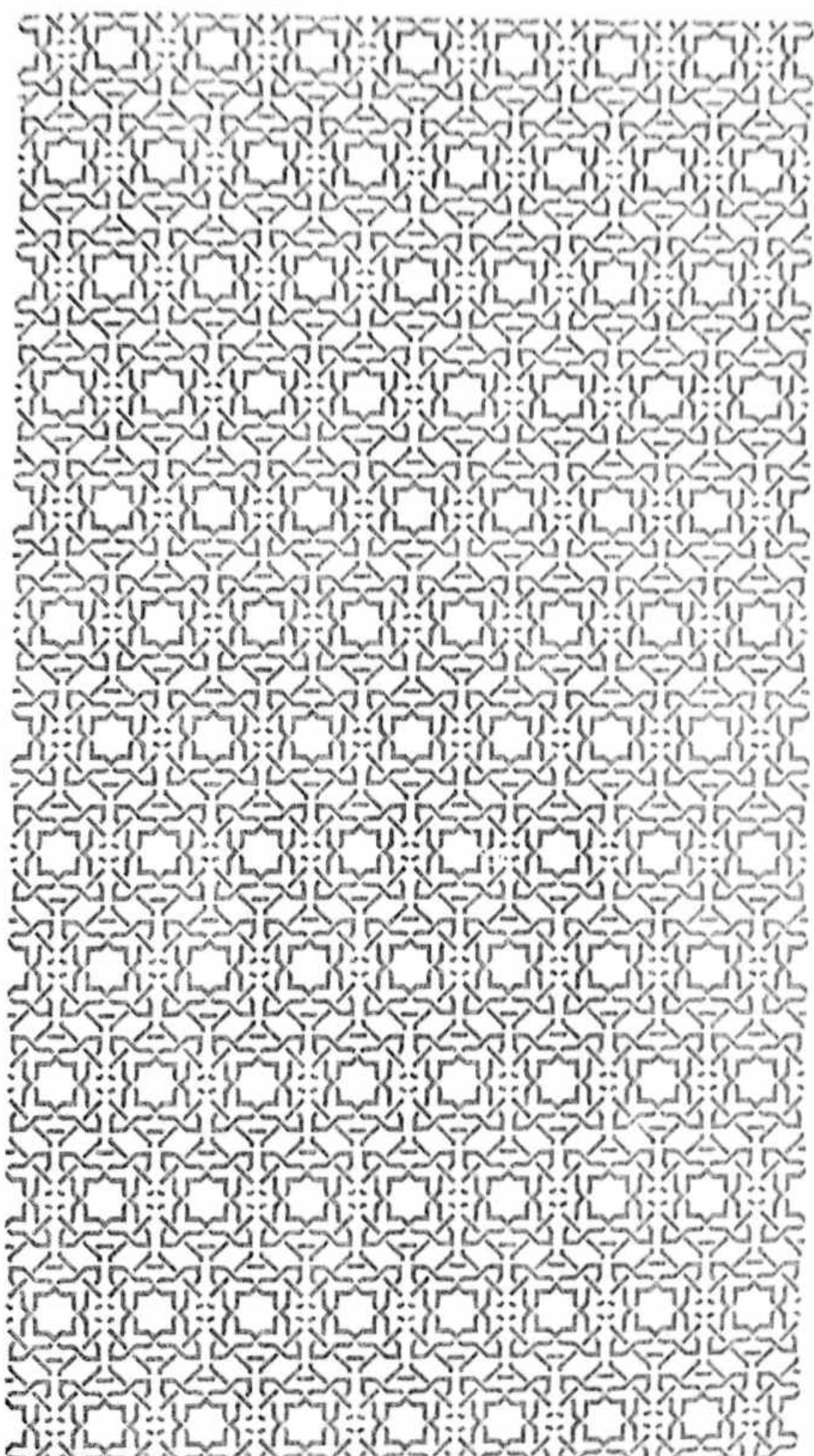
بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کتاب الآداب والرقاق

عام لوگوں کے سامنے مدقق اور باریک مضامین نہ بیان کرو

بعض لوگ کلموا الناس علیٰ قدر عقولهم [1] سے استدلال کرتے ہیں کہ حدیث میں اس کا امر ہے کہ لوگوں کی عقل کے اندازہ سے کلام کیا کرو اور جب آج کل طبائع کا یہ حال ہے کہ بدون عقلی علت معلوم کئے ان کو تسلی نہیں ہوتی تو ہم کو اسی طرز سے کلام کرنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ نے حدیث کا مطلب صحیح نہیں سمجھا۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں کے سامنے ایسی تدقیقات اور باریک باریک مضامین نہ بیان کرو جوان کی سمجھ میں نہ آسکیں، یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ان کے مذاقِ فاسد کی رعایت کیا کرو۔

(وعظ: تعلیم البیان، صفحہ نمبر: ۱۲۳، علم وعمل، جلد نمبر: ۲)

---

(۱) أخرجه الامام البخاری رحمه الله تعالی فی صحیحه عن علی رضی الله عنه موقوفا، رقم الحدیث: ۱۲۷ باب من خص بالعلم قوما دون قوم، کراهیة أن لا یفهموا، ولفظه: قال علی: حدثوا الناس، بما یعرفون أتحبون أن یکذب الله ورسوله. وکذا أخرجه الدیلمی فی مسند الفردوس عن ابن عباس رضی الله عنهما مرفوعا، ولفظه أمرت ان نکلم الناس علی قدر عقولهم، رقمه ۱۶۱۱، وقال السخاوی "فی المقاصد": سنده ضعیف.

لوگوں کے دل مسخر کرنے کے لیے

کلام میں ہیرا پھیری کرنے پر وعید

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

من تعلم صرف الکلام لیسبی به قلوب الناس لم یقبل الله منه صرفًا ولا عدلًا[1]

دیکھیے! اس وقت نہ کوئی اس قسم کی انجمن تھی، نہ مجالس کا یہ طرز تھا، لیکن حضور ﷺ نے اس کا انتظام بھی اسی وقت فرمادیا کہ جو شخص کلام میں ہیر پھیر اس لیے سیکھے کہ اس کے ذریعے سے لوگوں کے قلوب مسخر کرے گا تو خدا تعالیٰ اس سے کسی نفل اور فرض کو قبول نہ فرمائیں گے۔ یہ حدیث فساد غرض پر تنبہ کے لیے کافی ہے اور اس سے علم البیان پر علم القرآن کو مقدم کرنے کی غرض اور زیادہ وضاحت سے ہوگئی جس کا اوپر بھی بیان ہوا ہے۔

میں ان طالب علموں کو چونکانا چاہتا ہوں جو آج کل طرز جدید کو تقریر میں اختیار کرتے ہیں جس کی غرض زیادہ تر یہی ہے کہ جاہ اور قبول عام ہو، اسی لیے یہ کوشش ہوتی ہے کہ الفاظ پر شوکت ہوں، بندشیں چست ہوں، حالانکہ اس سے خاک بھی نہیں ہوتا۔

(وعظ: تعلیم البیان، صفحہ نمبر: ۱۳۳، جلد نمبر: ۲ علم و عمل)

---

(۱) أخرجه الامام أبو داود رحمه الله فی سننه عن أبی هریرة رضی الله عنه مرفوعا، رقم الحدیث: ۵۰۰۶ باب ما جاء المتشدق فی الکلام، ولفظه: من تعلم صرف الکلام لیسبی به قلوب الرجال، أو الناس، لم یقبل الله منه یوم القیامة صرفا ولا عدلا.

”دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے“ سے مراد بے دینی کی محبت کرنا ہے

حب الدنیا رأس كل خطيئة [۱]

کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے، یہاں دنیا مقابلہ میں دین کے بولی گئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ بے دینی کی باتوں سے محبت نہ کرنا چاہیے اور یہ معنی نہیں کہ بیوی بچوں سے بھی محبت نہ کرے، کیونکہ یہ بے دینی کی چیزیں تھوڑا ہی ہیں، بلکہ یہ تو نکاح کا نتیجہ ہیں جو دین ہے۔ غرض دنیا وہ مذموم ہے جو دین میں مضر ہو۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

(خدا تعالیٰ سے غافل ہونے کا نام دنیا ہے، سونا چاندی، اور بیوی بچوں کو دنیا نہیں کہتے)

یعنی دنیا کسے کہتے ہیں؟ خدا سے غافل ہونے کو، نہ کہ مال و دولت اور بیوی بچوں کو۔

(وعظ: ضرورت تبلیغ، صفحہ نمبر: ۲۶۰ تا ۲۶۱، جلد نمبر: ۱۳ دعوت و تبلیغ)

---

(۱) أخرجه البيهقي في "شعب الإيمان" عن الحسن البصري مرسلاً، ذكره الديلمي في الفردوس وولده بلا سند عن علي رضي الله عنه مرفوعاً والبيهقي أيضاً في الزهد وأبو نعيم في الحلية من قول عيسى ابن مريم عليهما السلام. قال السخاوي في "المقاصد": "إسناده إلى الحسن البصري حسن". وقال الحافظ: إسناده إلى الحسن حسن، ومراسيله أثنى عليها ابو زرعة، وابن المديني، فلا دليل على وضع إلا أن العراقي مثله في "شرح الألفية" بهذا الحديث ثم قال "لا يصح عن النبي عليه السلام، فإنه من كلام مالك بن دينار، أو من كلام عيسى بن مريم، ولا يروى مرفوعاً إلا مراسيل الحسن البصري، ومراسيل الحسن عند أهل العلم في غاية الضعف، شبه الريح. وقال المناوي في "فيض القدير": قال البيهقي: "ولا أصل له من حديث النبي ﷺ: "حب الدنيا رأس كل خطيئة.

انذار کی دو قسمیں ہیں

بشرا و لا تنفرا[1]

یہاں پر ایک بات اہل علم کے سمجھنے کی ذہن میں آئی کہ تبشیر کے مقابل تو انذار آتا ہے، تنفر کا لانا بظاہر بلاغت کے خلاف معلوم ہوتا ہے، یا تو انسا و لا تنفرا فرماتے یا بشرا و لا تنذرا فرماتے کہ مقابلہ درست ہو جاتا، آج ہی یہ بات سمجھ میں آئی کہ بہت بڑی بات کی طرف اشارہ فرما دیا۔ بات یہ ہے کہ بشرا کے وہ معنی مراد لیے ہیں جو تنفرا کے مقابل ہیں، نہ معنی جو لا تنذرا کے مقابل ہیں، تو تبشیر اس مقام پر تنفیر کا تو مقابل ہے، انذار کا مقابل نہیں، کیونکہ انذار کو بھی شامل ہے۔ انذار کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ وحشت ہو، ایک یہ کہ الفت ہو۔ پہلی قسم تنفرا میں داخل ہے، دوسری قسم بشرا میں داخل ہے، مثلاً انذار سے یوں جی خوش ہوتا کہ سب مردہ کو قبر میں رکھ دیتے ہیں، تو جنت سے پہلے دوزخ دکھلائی جاتی ہے کہ اگر اعمال اچھے نہ ہوتے اور اصلاح نہ ہوتی تو یہ ٹھکانا تھا تو اس جہنم دکھانے کو دخل خوش کرنے میں نہیں تو کیوں دکھلائی؟ حضرت! جہنم دکھلا کر خوشی اور بڑھا دی، اب جنت کو دیکھ کر زیادہ خوشی ہوگی۔

الحمد للہ الذی نجانی[2]

---

(۱) أخرجه الامام البخاری فی صحیحه عن أنس بن مالک ﷺ مرفوعا، رقم الحدیث: ۶۹ باب ما کان النبی ﷺ یتخولهم بالموعظة والعلم کی لا ینفروا، وکذا أخرجه الامام مسلم فی صحیحه عن أبی موسی الأشعری رضی الله عنه، رقم الحدیث: ۱۷۳۲ باب فی الأمر بالتیسیر، وترک التنفیر ولفظه: بشروا ولا تنفروا، ویسروا ولا تعسروا.

(۲) أخرجه أبو یعلی فی مسنده عن ابن مسعود ﷺ مرفوعاً، رقم الحدیث ۴۹۸۰

اسی طرح جو دنیا کے رنج وغم دیکھ چکے ہیں، وہ کہیں گے

الحمد للہ الذی اذھب عنی الحزن (۱)

حدیث میں ہے کہ جب تمام اہلِ ایمان جنت میں چلے جائیں گے اور جنت نہ بھرے گی تو حق تعالیٰ جنت کے لیے ایک نئی مخلوق اور پیدا کریں گے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ بھئی! ان سے تو ہم زیادہ مزہ میں ہیں کہ انہوں نے کوئی چیز جنت کے مقابل دیکھی ہی نہیں، انہیں اس کی کیا قدر اور کیا خوشی؟

بہر حال انذار کی دو قسمیں ہیں: ایک تو وہ جس سے لوگ ناامید ہو جاتے ہیں اور ایک یہ کہ انذار اور اس کے ساتھ ہی اس سے بچنے کی تدبیر بھی بتادی جاوے، مثلاً سلطنت کا ایک حکم اور اس کے ساتھ ہی اس سے بچنے کی تدبیر بھی بیان کر دے، اس کو محقق سمجھ سکتا ہے، غیر محقق نے چغلی غیبت وغیرہ کا عذاب تو بیان کر دیا، مگر یہ نہ بتایا کہ اس مرض سے نجات کیوں کر ہو سکتی ہے؟ اور ایک محقق، شیخِ کامل جہاں عذاب بیان کرے گا، وہاں اسباب اس بات سے بچنے کے بھی بیان کرے گا، مثلاً امراضِ مذکورہ سے بچنے کے لیے یہ تدبیر بتائے گا کہ بولو تو سوچ کر بولو کہ کسی کی حکایت تو نہیں، جس میں غیبت ہو یا شکایت تو نہیں، جس میں چغلی ہو، تو دیکھو! کہا انہوں نے بھی، مگر اس طرح کہ ناامید نہیں کیا اور اہلِ ظاہر اس طرح کہتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ ہمیشہ کے لیے مردود ہو گیا، شیطان بن گیا اور اہل باطن برابر تسلی دیتے رہتے ہیں کہ فکر مت کرو، اس سے بچنا بہت آسان ہے، اسی طرح نظر بد، بدنگاہی۔ اہل ظاہر کے نزدیک اس سے بچنے کی کوئی تدبیر ہی نہیں اور اب وہ شخص جہنم سے نہیں بچ سکتا اور اہلِ باطن

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن أبي هريرة رضي الله عنهما مرفوعاً.

تدبیر بھی بتاتے ہیں کہ تم عذاب کا خیال کرلو تو یہ مرض جاتا رہے گا، سو ایک انذار تو یہ ہے کہ جس کا حاصل یہ ہے ؎

درشتی و نرمی بہم می رسد
چورگ زن کہ جرح و مرہم نہ است

(سختی اور نرمی ساتھ ساتھ اچھی ہوتی ہیں، جس طرح کہ فصد کھولنے والا نشتر بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے)

اس سے امید رہتی ہے۔ غرض ایک انذار تو یہ ہے کہ بالکل مایوس کردے، یہ ناجائز۔ اور ایک وہ کہ جس میں نجات کی تدبیر بھی ہو، یہ جائز، تو حضور ﷺ نے بشرا میں یہ بات بتلادی۔ حاصل یہ ہوا کہ ایسی بات کہ جس سے تنگی پیدا ہو، مت بتاؤ۔

(وعظ: التبشیر، صفحہ نمبر: ۳۵۵ تا ۳۵۶، دعوت وتبلیغ جلد نمبر: ۱۳)

اتفاق کے لیے ایک دوسرے کو اپنا مطاع اور معظم سمجھنا ضروری ہے

تطاوعا، ولا تختلفا [۱]

(ایک دوسرے کا کہا ماننا، اختلاف مت کرنا)

یہاں بھی اس اصولی بلاغت کے موافق یا تو تطاوعا، ولا تعصیا ہوتا یا اتفقا، ولا تختلفا ہوتا، مگر اس میں بھی وہی نکتہ ہے کہ بجائے اتفقا کے تطاوعا فرما کر اتفاق کا مبنی بتادیا کہ وہ تطاوع ہے کہ جب ہر ایک دوسرے کو اپنا مطاوع و معظم

(۱) أخرجه الامام البخاری فی صحیحه عن أبی بردة عن أبیه عن جده مرفوعا، رقم الحدیث: ۳۰۳۸ باب مایکره من التنازع والاختلاف فی الحرب، وکذا أخرجه الامام المسلم فی صحیحه عن أبی بردة عن أبیه عن جده، رقم الحدیث: ۱۷۳۳، باب فی الامر بالتیسیر وترك التنفیر

سمجھے گا، اتفاق لازم ہوگا۔

الحمدللہ! آج حاجی صاحب کے قول کا مبنی بھی معلوم ہوگیا کہ اتفاق تواضع سے ہوتا ہے اور جب اختلاف ہوگا، تکبر سے ہوگا، پس فرماتے ہیں کہنا مانو، یعنی ہر ایک دوسرے کو بڑا سمجھو، پھر سبحان اللہ! یوں نہیں فرمایا کہ امتثلا، بلکہ فرمایا تطاوعا، تطوع کہتے ہیں خوشی سے کہنا ماننے، مطلب یہ کہ خوشی سے کہنا مانو، یہ کاشف ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا کہ لوگ تواضع کو ذریعۂ کبر بناتے ہیں کہ ظاہر میں متواضع بنتے ہیں، تاکہ لوگ متواضع سمجھیں، پس ایسا شخص امتثال تو کرے گا، مگر طوع نہ ہوگا، پس ایک اتفاق ضابطہ کا اتفاق ہے، مگر دل سے نہیں تو تطاوعا سے اس کا امر فرمادیا کہ خوشی سے اتفاق رکھو کہ یہ قلب کا کام ہے، پس حضرت کا قول نہایت واضح ہوگیا اور یہ قلب کا کام ہے، دلیل اس کی آیت ہے:

وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ الآیۃ(۱)

یعنی حق تعالیٰ کی وہ شان ہے کہ قلوب میں اتفاق پیدا کردیا۔ آگے فرماتے ہیں:

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ (۲)

اگر آپ تمام روئے زمین کے خزانے صرف کردیتے تو الفت نہیں پیدا کرسکتے تھے۔ اے وہ لوگو! جو اتفاق اتفاق پکارتے ہو، اتفاق اس طرح نہیں پیدا ہوتا، صرف چالیس دن کسی اہل اللہ کی محبت اختیار کرو تو تمہیں طریقہ معلوم ہو؎

قال را بگذار و مرد حال شو
پیش مردے کاملے پامال شو

اور طریقہ یہ ہوگا کہ تمہارے دل سے جو کہ محل ہے اتفاق کا، خناس جو برنگ دین و

(۲،۱) سورۃ الانفال آیت (۶۳)

دنیا ظاہر ہوتا ہے، دور ہوکر اس میں خلوص پیدا ہوجائے گا، اس کے بعد پھر سوسائٹی اور انجمن مبارک ہو، ورنہ ایسی انجمن اور ایسے ارکان کی یہ مثال ہے:

گربہ میر، سگ وزیر، موش رادیوان کنند

ایں چنیں ارکان دولت ملک راویران کنند

(وعظ: التبشیر ،صفحہ نمبر:۳۵۹ تا ۳۶۰، جلد نمبر: ۱۳ دعوت تبلیغ)

اولیاء اللہ پر انبیاء علیہم السلام کا غبطہ

یغبطھم الانبیاء والمرسلون(۱)

احمد فرماتے ہیں:

احمد تو عاشق بمشیخت ترا چہ کار

دیوانہ باش سلسلہ شد، شد نشد نشد

(احمد عاشق ہے، مشیخت سے تجھ کو کیا کام، عاشق ہوجا، سلسلہ ہوا، ہوا، نہ ہوا، نہ ہوا)

یہ عشاق قیامت میں نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے، ان کو کچھ فکر نہ ہوگا، حدیث میں ہے کہ ان کی اس حالت پر انبیاء علیہم السلام بھی غبطہ کریں گے، کیونکہ انبیاء کی پیشی ہوگی، ان سے سوال وجواب ہوگا، مگر یہ سب امت ہی کے متعلق ہوگا، خود ان

---

(۱) أخرجه الامام أبو داود فی سننه عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث: ۳۵۲۷ باب فی الرہن، ولفظه: ان من عباد الله لأناسا ما هم بأنبياء، ولا شهداء يغبطهم الأنبياء والشهداء يوم القيامة، بمكانهم من الله تعالى قالوا: يا رسول الله، تخبرنا من هم، قال: هم قوم تحابوا بروح الله على غير رحام بينهم، ولا موال يتعاطونها، فوالله ان وجوههم لنور، وانهم على نور لا يخافون اذا خاف الناس، ولا يحزنون اذا حزن الناس. مسند احمد رقم الحدیث: ۲۲۸۹۷

کی ذات کے متعلق حساب وکتاب ان سے کچھ نہ ہوگا اور اپنی ذات کے لیے انبیاء علیہم السلام کو کچھ تشویش نہ ہوگی، کیونکہ وہ تو معصوم ہیں، ہاں! انبیاء کو امت کی فکر ہوگی، اس لیے ان بے فکروں پر غبطہ کریں گے کہ یہ بڑی چین میں ہیں، ان کو کسی کی بھی فکر نہیں۔

مگر اس سے ان اولیاء کی فضیلت انبیاء پر لازم نہیں آتی، کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے، جیسے حاکم ضلع جس وقت اپنے ماتحت حکام کے عملہ کا معائنہ کرتا ہے تو اس وقت حاکم کو اور عملہ والوں کو فکر ہوتی ہے، عملہ والوں کو اپنے اپنے کام کی اور حاکم کو اپنے عملہ کی کہ کہیں ان پر کوئی جرم قائم نہ ہو جائے، اس وقت حاکم کے اردلی اور سائیں کو کچھ فکر نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے سپرد عملہ کا کام ہی کچھ نہیں، اس وقت حاکم عملہ کو اپنے اردلی کی بے فکری پر رشک ہوسکتا ہے کہ یہ بہت بے فکر ہے، مگر معائنہ کے بعد حاکم حاکم ہے اور اردلی اردلی ہے، اسی طرح بعد فیصلہ کے انبیاء جب جنت میں جائیں گے تو ان کے مراتب سب سے اعلیٰ ہوں گے، اس وقت یہ اولیاء ان پر رشک کریں گے۔

(وعظ: التبشیر، صفحہ نمبر: ۳۸۸ تا ۳۸۹، جلد نمبر: ۱۳ دعوت وتبلیغ)

ہر انسان پر اس کے جسم اور نفس کا حق ہے

إن لجسدك عليك حقا، و إن لنفسك عليك حقا، و إن لعينك عليك حقا(۱)

(بلاشک جسم کا تجھ پر حق اور تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے)

پس کسی کو یہ حق نہیں کہ دوا بارد کھا کر نامرد ہو جائے یا آنکھوں میں گرم سلائی لگا

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنه.

کرا ندھا ہوجائے ، عارفین پر چونکہ یہ راز منکشف ہوگیا ہے، اس لیے وہ اپنی جان کو سرکاری چیز سمجھ کر اس کی خوب حفاظت کرتے ہیں اور اسی نیت سے بعض دفعہ عمدہ غذا اور عمدہ لباس بھی استعمال کرتے ہیں، لوگ اس تن پروری سمجھتے ہیں، مگر نہیں، وہ اس سے بہت دور ہیں ۔ (وعظ: ذم النسیان صفحہ نمبر: ۳۹۴، جلد نمبر: ۲۲ ذکر وفکر)

انسان کو اپنی زندگی طاعون کے زمانہ کی طرح گزارنی چاہیے

إن أصبحت فلا تحدث نفسك بالمساء، وإذا أمسيت فلا تحدث نفسك بالصباح، وعد نفسك من أصحاب القبور.[1]

(یعنی جب صبح کرو تو اپنے دل میں شام کا خیال نہ لاؤ اور جب شام ہو تو دل میں صبح کا خیال نہ لاؤ اور اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرو)

یہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ بعض لوگوں کو یہ بات سمجھ میں آتی تھی اور کہتے تھے کہ ایسا سمجھ بیٹھیں تو پھر دنیا کے کاروبار سب چھوٹ جائیں گے، کسی سے کوئی کام دنیا کا نہ ہوسکے گا، مگر طاعون نے اس کو حل کردیا کہ اس زمانہ میں دنیا کا کوئی کام نہیں چھوٹا، دکاندار تجارت کرتے ہیں، کاشتکار کھیتی کرتے ہے، ملازمت پیشہ اپنی ملازمت کے کام میں لگے رہیں، ریل اور تار اور ڈاک اور کارخانے سب بدستور رہے، مگر لوگوں کی حالت یہ تھی کہ صبح کو شام کی امید نہ ہوتی تھی اور شام کو صبح کی امید نہ ہوتی تھی، ہر شخص کو موت کا خطرہ لگا ہوا تھا تو سارے کام بھی ہوتے رہے اور مراقبہ موت بھی حاصل ہوگیا۔

بس اسی کو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جیسا طاعون وہیضہ کے زمانہ میں ہو،

(۱) أخرجه الإمام الترمذي في سننه عن ابن عمر رضي الله عنه مرفوعا، رقم الحديث: ۲۳۳۳ باب ماجاء في قصر الأمل.

جاتے رہو بارہ مہینے ایسے ہی رہو، مگر آج تو یہ حالت ہے کہ جہاں طاعون گیا اور بے فکر ہو گئے، گویا اب خدا تعالیٰ ان کو مار ہی نہیں سکتے تو جیسے طاعون کے زمانہ میں ہر کام کے ساتھ موت کا دھیان لگا رہتا ہے اور اس سے کسی کام میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی، یوں ہی اہل اللہ کو دنیا کے ہر کام میں خدا تعالیٰ کی یاد بھی رہتی ہے۔

(وعظ: سبیل النجاح، صفحہ نمبر: ۴۶۳، جلد نمبر: ۳ دین و دنیا)

مومن کو دوسرے مومن کے حق میں آئینہ سے تشبیہ دینے کی وجہ

حدیث میں ہے (قربان جایئے شریعت کی تعلیم کے) فرماتے ہیں:

المؤمن مرأة المؤمن [۱]

لوگوں نے اس کی تفسیر کئی طرح سے کی ہے جو ہمارے مشائخ کے نزدیک ہے، وہ یہ ہے کہ مؤمن کو مؤمن کے لیے آئینہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، اس بات میں کہ آئینہ دیکھنے والے کا راز دار ہوتا ہے، اس کے عیب کو اسی کے سامنے ظاہر کرتا ہے، دوسروں سے ہرگز نہیں کہتا۔ (وعظ: حقوق القرآن، صفحہ نمبر: ۳۰۶، جلد نمبر ۴: حقوق و فرائض)

عبث کام مآل کے اعتبار سے مضر ہے

رسول مقبول ﷺ نے فرمایا ہے:

من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه [۲]

(یعنی لایعنی امور کا ترک کر دینا آدمی کے حسن اسلام سے ہے)

اور لایعنی کے معنی ابھی مذکور ہوئے ہیں کہ عبث و لغو کو لایعنی کہتے ہیں، یعنی جو چیز

---

(۱) أخرجه الامام أبو داود فی سننه عن أبی هریرة رضی الله عنه مرفوعا، رقم الحدیث: ۴۹۱۸ باب فی النصیح والحیاط، مسند البزار رقم الحدیث: ۲۱۹۳

(۲) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن أبی هریرة رضی الله عنه مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۳۱۷، سنن ابن ماجه رقم الحدیث: ۳۹۷۶

نہ نافع ہو، نہ مضر، وہ لایعنی ہے، اسی کے ترک کو حضور ﷺ نے حسن اسلام فرمایا ہے اور یہ نہیں فرمایا:

من حسن إسلام المرء ترك ما لا يضر

کہ مضر کا ترک کردینا یقیناً حسن اسلام ہے، مگر حضور ﷺ نے بجائے ما لا یضرہ کے ما لا یعنی فرما کر یہ بتلادیا کہ جو عبث ہے، وہ واقعہ میں مضر ہی ہے تو گویا ترک نافع کی دو صورتیں ہوئیں: ایک ارتکاب مضر اور خلو عن الشغل المفید (شغل مفید سے خالی ہونا)۔

فطرتِ نفس

یہ دوسری قسم اپنے مآل کے اعتبار سے پہلی ہی قسم میں داخل ہوجاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ فقط مضر کا ترک کردینا کافی نہیں ہے، بلکہ نافع میں مشغول ہونا بھی ضروری ہے، کیونکہ مشغلہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو دوسرے مشغلہ سے روک سکتا ہے، ورنہ بغیر مشغلہ کے مضر سے رکا رہنا ناپائیدار ہوگا، کیونکہ چند روز تک تو نفس صبر کرتا ہے، اس کے بعد پھر کسی نہ کسی مشغلہ کی طرف متوجہ کردیتا ہے اور وہ اکثر مضر ہی ہوتا ہے۔

(وعظ: الصلاح والاصلاح، صفحہ نمبر: ۴۶۲، جلد نمبر: ۴ حقوق وفرائض)

غیبت کا زنا سے سخت تر ہونے کی وجوہ:

حدیث میں آیا ہے:

الغيبة أشد من الزنا[1]

یعنی غیبت زنا سے سخت تر ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ غیبت تو حق العبد ہے،

---

(۱) للمعجم الأوسط، عن جابر بن عبد الله، وأبی سعید الخدری رضي الله عنهما، رقم الحديث: ٦٥٩٠، "الصمت" لابن أبی الدنیا، رقم الحديث: ۱۶۴ باب الغيبة وذمها، شعب الإيمان، رقم الحديث: ۲۳۱۵

جب وہ معاف کرے گا تب معاف ہوگا اور زنا حق اللہ ہے، توبہ اور ندامت سے معاف ہوجائے گا اور آخرت میں جب غیبت کرنے والے کی نیکیاں مغتاب کو ملنے لگیں گی تو وہ کیوں معاف کرے گا، اس لیے کہ وہ وقت شدتِ احتیاج کا ہے اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہیں، اپنے حق کو معاف فرمادیں گے اور عبد محتاج ہے اور ایک فرق اور ہے جس کو ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دوکلموں میں فرمایا، فرمایا کہ غیبت گناہ جاہی اور زنا گناہ باہی ہے، شرح اس کی یہ ہے کہ آدمی جب زنا سے فارغ ہوتا ہے تو خود اپنی نظر میں بھی اور غیروں کی نظر میں بہت ذلیل وخوار ہوتا ہے، غرض اس کو بعد گناہ کے ذلت وندامت ہوتی ہے اور غیبت کے بعد ندامت نہیں ہوتی، بلکہ فخر کرتا ہے اور اظہار و اعلان کرتا ہے اور بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جس معصیت کے بعد ندامت اور عجز ہو وہ اس طاعت سے بھی بہتر ہے جس کے بعد عجب اور پندار ہو، چہ جائیکہ گناہ بھی اور موجب عجب بھی ہو اور عجب اس میں لازم ہے، کیونکہ غیبت آدمی جب ہی کرتا ہے، جبکہ اپنے کو پاک سمجھے، پس یہ عیب بڑا سخت ہے۔

(وعظ: التصدی للغیر، صفحہ نمبر: ۲۶۵، جلد نمبر: ۲۵ حدود وقیود)

تقلیل طعام کے معنی

ایک حدیث میں ہے:

اکثرھم شبعا فی الدنیا اطولھم جوعا یوم القیامۃ (۱)

(یعنی جو دنیا میں زیادہ پیٹ بھرے گا، وہ قیامت کے دن زیادہ بھوکا رہے گا)

---

(۱) أخرجه الامام الترمذی فی سننه عن عبد الله بن عمر رضی الله عنهما مرفوعا، رقم الحدیث: ۲۴۷۸، سنن ابن ماجه، رقم الحدیث: ۳۳۵۱

اس قسم کی احادیث سے ان حضرات نے جوع کی فضیلت اور شبع کی مذمت مستنبط کر کے یہ فرمایا کہ تقلیلِ طعام کے معنی یہ ہیں کہ پیٹ بھر کے کھانا نہ کھائے، بلکہ بھوکا رہا کرے، چنانچہ ان حضرات نے یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص رمضان میں افطار وسحر کے وقت پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے، اس نے حقیقتِ صوم وروحِ صوم کو باطل کر دیا زیادہ لوگ اسی طرف ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول

لیکن شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ [1] میں لکھا ہے کہ شارع علیہ السلام نے تقلیلِ طعام کو تجویز کیا ہی نہیں، بلکہ شارع نے کھانے کے اوقات معتادہ کو بدل کر ان میں فصل زیادہ تجویز کیا ہے اور اس تبدل عادت وزیادت فصل سے جو نفس کو تکلیف ہوتی ہے، اسی کو شریعت نے تقلیل طعام کے قائم مقام سمجھا ہے اور یہ دوسری صورت ہے تقلیل طعام کی، پس کم کھانا اور بھوکا رہنا یہ شرعی مجاہدہ نہیں اور رمضان میں پیٹ بھر کے کھانا روح صوم کو کچھ مضر نہیں، میں نے شاہ صاحب سے پہلے کسی کا قول نہیں دیکھا اور یہ مضمون اولاً خود بخود میرے قلب پر وارد ہوا تھا، اس وقت تک میں نے شاہ صاحب کا قول بھی نہیں دیکھا تا اور میں نے توکلا علی اللہ ایک وعظ میں اس کو بیان بھی کر دیا تھا، بعد میں شاہ صاحب کے قول سے تائید ملی تو میں بہت خوش ہوا کہ الحمد للہ میں اس قول میں متفرد نہیں ہوں۔

(وعظ: تقلیل الطعام، صفحہ نمبر: ۱۲۶ تا ۱۲۷، جلد نمبر: ۳۰ خیر الاعمال)

---

(۱) حجة الله البالغة (۲/۷۲) مطبع دار الجيل بيروت، ابواب الصوم، ولفظه: "إن تقليل الأكل والشرب له طريقان: أحدهما: ألا يتناول منهما إلا بقدر يسير، والثاني أن تكون المتخللة بين الأكلات زائدة على القدر المعتاد، والمعتبر في الشرائع هو الثاني... إلى آخره.

غصہ کی حالت میں بیٹھنے اور لیٹنے کی اصل وجہ

فرماتے ہیں جناب رسول اللہ ﷺ:

اذا غضب أحدکم وھو قائم فلیجلس [۱]

یعنی جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اگر کھڑا ہے تو بیٹھ جائے اور اگر اس سے نہ جائے تو لیٹ جائے۔ یقین کامل ہے کہ اس سے آگے کسی تدبیر کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس میں اہلِ لطائف نے ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ غصہ کے فرو کرنے میں لیٹنے اور بیٹھنے کو کیا دخل ہے، وہ یہ ہے کہ جب آدمی کھڑا ہوتا ہے تو زمین سے اس کے جسم کو بعد ہوتا ہے اور بیٹھنے میں بہ نسبت زمین سے قرب ہوجاتا ہے اور لیٹنے میں اس سے بھی زیادہ زمین سے مل جاتا ہے اور زمین کی طبیعت میں حق تعالیٰ نے انکسار رکھا ہے، وہ انکسار آدمی پر بھی اثر کرتا ہے اور انکسار تکبر اور غضب کی ضد ہے تو گویا یہ علاج بالضد ہوا اور یہی اصل الاصول کا علاج ہے۔

(وعظ: غوائل الغضب، صفحہ نمبر: ۲۳۹، جلد نمبر: ۱۹ آدابِ انسانیت)

غصہ کم کرنے کی تدابیر

بعض طریقے غصہ کم کرنے کے حدیث میں بھی آئے ہیں، مثلاً یہ کہ پانی پی لے، وضو کرلے یا اعوذ باللہ [۲] پڑھ لے، مگر یہ طریق لطیف ہیں جو لطیف طبائع کے مناسب ہیں، آج کل طبائع کثیف ہیں، اس لیے سخت تدابیر کی ضرورت ہے جن میں سے ایک تدبیر وہ ہے جو میں نے بیان کی ہے کہ وہاں سے ہٹ جائے یا مخاطب کو

---

(۱) أخرجه الامام أبوداود فی سننه عن أبی ذر رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث: ۴۷۸۲ باب مایقال عند الغضب، مسند احمد، رقم الحدث: ۲۱۳۴۸

(۲) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ مرفوعا.

الگ کردے اور یہ زیادت علی الحدیث نہیں ہے، بلکہ اسی سے مستنبط ہے، کیونکہ ان سب تدابیر کا راز یہ ہے کہ غصہ کے وقت توجہ کو ہٹانا اور دوسری طرف متوجہ کردینا غصہ کم کردیتا ہے، پس توجہ کے ہٹانے کی جو صورت بھی ہوگی، وہ حدیث ہی کے تحت میں ہوگی۔ رہا صورتوں کا بدلنا، یہ تبدیل علاج بہ تبدیل مزاج میں داخل ہے، آج کل کی طبائع ایسی کثیف ہیں کہ اعوذباللہ تو کیا سارا قرآن بھی پڑھ دو، جب بھی اثر نہ ہو، کیونکہ لوگ آج کل محض زبان سے اعوذباللہ پڑھتے ہیں، دل سے نہیں پڑھتے، ہماری حالت تو یہ ہے:

اللہ اللہ می کنم بہر زبان
بے طمع پیش آو اللہ را بخواں

اور اگر استحضار عظمت الٰہیہ کے ساتھ دل سے پڑھی جائے تو ضرور اثر ہو، ہم نے عرب میں اس اثر کا مشاہدہ کیا ہے کہ دو جماعتیں آپس میں غصہ کر رہی ہیں، لڑنے کو آمادہ ہوگئے، تلواریں نیام سے نکل آئی ہیں کہ تیسرے شخص نے آکر کہہ دیا، یاشیخ! صل علی النبی یہ کہنا تھا کہ فریقین کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا اور دونوں درود پڑھنے میں مشغول ہوگئے اللهم صل وسلم وبارك على سيدنا و مولانا محمد وعلى آله واصحابه اجمعين پھر ایک ادھر کو چل دیا، ایک ادھر کو چل دیا۔ یہاں تو لاکھ دفعہ بھی صل علی النبی کہو تو غصہ ٹھنڈا نہ ہو، اس لیے میں یہ بتلاتا ہوں کہ مخاطب کو سامنے سے الگ کردو یا خود الگ ہوجاؤ تو توجہ ہٹ جائے گی، غصہ جاتا رہے گا۔

(وعظ: المرابطہ صفحہ نمبر: ۹۲ حقیقت تصوف وتقویٰ جلد ۱۱)

حضور ﷺ نے دوسرے انبیاء علیہم السلام پر اپنی فضلیت بیان کرنے سے کیوں منع فرمایا؟

لا ينبغي لعبد أن يقول إني خير من يونس ابن متى (۱)

اس میں إنی سے مراد حضور ﷺ ہیں، ہر متکلم مراد نہیں (کما قیل ۱۲) یعنی کسی کو میری نسبت یہ کہنا لائق نہیں کہ میں یونس علیہ السلام سے افضل ہوں، حالانکہ حضور ﷺ کی فضیلت تمام انبیاء پر قطعی ہے، مگر حضور ﷺ نے اس میں تفضیلی گفتگو سے منع فرمادیا (نیز! اس سے بھی منع فرمادیا کہ کسی نبی کا نام لے کر یہ کہا جائے کہ ہمارے حضور ﷺ فلاں نبی سے افضل ہیں، بس اجمالا ہی کہنا چاہیے کہ آپ سب سے افضل ہیں ۱۲) کیونکہ تفضیل سے دوسرے نبی کی تنقیص ہوجاتی ہے اور ایسے بہت کم لوگ ہیں جو تفضیلی کلام کے مقابلہ میں تنقیص سے بچ سکیں، اس لیے حضور ﷺ کی یہ غایتِ رحمت ہے کہ آپ نے ہم کو اس بات میں تفضیلی گفتگو سے بالکل منع فرمادیا اور اگر کسی کا اس باب میں تفضیلی گفتگو کر کے یہ خیال ہو کہ میرے کلام سے کسی نبی کی تنقیص لازم نہیں آتی تو میں اس کے سامنے ایک معیار بیان کرتا ہوں، اس پر اپنی تقریر کو دیکھ لیا جائے، وہ یہ کہ تفاضل انبیاء پر تقریر کرنے سے قبل یہ سوچ لے کہ اس مجلس میں سارے انبیاء علیہم السلام مع رسول اللہ ﷺ کے تشریف فرما ہیں اور میں سب کے سامنے حضور ﷺ کے فضائل ظاہر کر رہا ہوں، اس وقت معلوم ہو جاوے گا کہ کس مضمون کے بیان کی جرأت ہوتی ہے اور کس کی نہیں، اس معیار سے اپنی اکثر تقریروں کا حدود سے متجاوز ہونا معلوم ہو جاوے گا اور اس کی فکر ہوگی کہ کسی لفظ سے ایہاماً بھی کسی دوسرے نبی کی تنقیص لازم نہ آجائے، ورنہ وہ حضرات تو شاید خفا نہ

---

(۱) أخرجه الشيخان رحمهما الله في صحيحيهما عن ابن عباس رضي الله عنهما مرفوعا.

ہوں، مگر سب سے پہلے حضور ﷺ ناراض ہوجائیں گے، کیونکہ حدیث میں ہے، "الانبیاء اخوۃ من علات وامہاتھم شتی، ودینھم واحد"(۱) یعنی انبیاء میں باہم علاتی بھائیوں جیسا تعلق ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ حضرات کیسے بھائی ہیں، دنیاداروں کی طرح نہیں، بلکہ ان میں باہم پورا اتحاد و اتفاق ومحبت ہے تو ایسے بھائیوں میں سے ایک کو اپنے دوسرے بھائی کی تنقیص کب گوارا ہوسکتی ہے، ہرگز نہیں۔ حضرت! اس معیار کو پیش نظر رکھ کر تم اپنی تمام تقریروں اور تحریروں کو جو باب تفاضل میں لکھی ہوں یا کی ہوں، جانچو کہ ان میں سے کوئی بھی ایسی ہے جس کو بے تکلف تمام انبیاء علیہم السلام کے سامنے پڑھ کر سنا سکو، یقیناً ایسی تقریریں بہت کم ملیں گی، زیادہ حصہ وہی ہوگا جس کو سب کے سامنے پڑھنے کی تم کبھی جرأت نہیں کرسکتے (یہ بہت سچی ترازو ہے جو ایک رتی پر بھی جھک جائے گی، اس کی قدر کرو)

(وعظ: التحصیل والتعدیل مع التکمیل والتعدیل، صفحہ نمبر: ۱۳۵ تا ۱۳۶، حقیقت تصوف وتقوی جلد نمبر ۱۱)

حضور اقدس ﷺ کا احادیث شریفہ میں

اپنے فضائل کے بیان کا مقصد

حضور ﷺ نے جو اپنے فضائل احادیث میں بیان فرمائے ہیں، اس سے آپ ﷺ کا مقصود یہ ہے کہ ان کے معلوم ہوجانے سے متبعین کو تسلی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایسا متبوع دیا اور اتباع پر زیادہ رغبت ہوگی، گو یہ علوم خود بھی مقصود ہیں، مگر حضور ﷺ کا مقصود ترغیبِ اتباع ہی معلوم ہوتا ہے۔ (او یتحمل ان یکون امتثالا لامرہ تعالیٰ واما بنعمت ربك فحدث ۱۲) کیونکہ حضور ﷺ کا

(۱) أخرجه مسلم فی صحیحه عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ مرفوعا، رقم الحدیث ۲۳۶۵، فی باب فضائل عیسی علیه السلام.

مذاق یہ تھا کہ آپ ﷺ کو اتباعِ احکام کا سب سے بڑھ کر اہتمام تھا اور جس چیز کو اس میں دخل ہوتا، آپ اس کو اختیار کرنے کی کوشش فرماتے، اس کے متعلق کہ آپ کو اتباع کا زیادہ اہتمام ہے، بنسبت بیان فضائل کے ایک مرد صالح کا خواب بھی ہے جو بعض رسائل میں طبع بھی کرادیا ہے، ان کو مولود وغیرہ کا بہت شوق تھا، محض غلبہ محبت نبویہ کی وجہ سے، تو انہوں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرمارہے ہیں ہم زیادہ تعریف سے خوش نہیں، بلکہ ہم اس سے خوش ہوتے ہیں جو ہمارے احکام کا اتباع کرے، مگر آج کل حالت یہ ہے کہ شعراء ایک نعتیہ دیوان لکھ کر اپنے کو سب سے زیادہ حضور ﷺ کا مقرب سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ عمل کی یہ حالت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بالکل خلاف ہے، یقیناً ایسی تعریف سے رسول اللہ ﷺ خوش نہیں ہوسکتے، پس حضور ﷺ کے مذاق پر نظر کرنے سے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے فضائل کو زیادہ تر ترغیب اتباع کی نیت سے بیان فرمایا ہے، اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ فضائل تو عقائد کی قبیل سے ہیں جو خود مقصود ہوتے ہیں، اور تم ان کو مقصود بغیر بتاتے ہو، میں کہتا ہوں کہ اس میں کچھ حرج نہیں کہ ایک شی مقصود بالذات بھی ہو اور دوسری مقصود میں معین بھی ہو، آپ کو خبر نہیں، مقاصدِ شرعیہ کی ایسی حالت ہے، جیسے مقناطیس کی حالت ہے کہ ہر مقصود دوسرے کا جاذب اور اس میں معین ہے، پس عقائد کا مقصود بالذات ہونا اوروں کے مقصود للاعمال ہونے کے منافی نہیں۔

(وعظ: التحصیل والتعدیل مع التکمیل والتعدیل، صفحہ نمبر: ۱۳۷ تا ۱۳۸، حقیقت تصوف وتقوی جلد نمبر ۱۱)

حرص کا علاج توبہ ہے، اس کی وجہ

رسول اللہ ﷺ ازالہ حرص کا صحیح علاج بتاتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:

ویتوب اللہ علی من تاب.

اس میں توبہ کو علاج حرص بتایا گیا ہے، جس کے معنی ہیں توجہ الی اللہ[1] اور اس کا حرص کے لیے علاج ہونا ایک قاعدہ فلسفہ سے سمجھ میں آجائے گا، وہ قاعدہ یہ ہے:

النفس لا تتوجہ الی شیئین فی آن واحد

کہ نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا۔

اور ظاہر ہے کہ حرص کی حقیقت توجہ اور میلان الی الدنیا ہے، اب اس توجہ کو کسی دوسری شے کی طرف پھیر دیا جائے تو توجہ الی الدنیا باقی نہ رہے گی، پھر جس چیز کی طرف توجہ کو پھیرا جائے، اگر وہ طبعاً بھی محبوب ہو تو اس کی طرف توجہ اشد ہوگی اور اس سے توجہ الی الدنیا کا ازالہ بھی قوی ہوگا اور اگر ایسی شے کی طرف توجہ کی جائے جو طبعاً محبوب نہ ہو تو اس صورت میں توجہ کمزور ہوگی۔

تعلق باللہ

اب سمجھو کہ حق تعالیٰ سے ہر شخص کو فطری تعلق ہے اور ذاتِ حق کی طرف ہر ایک کو میلانِ طبعی ہے، فقط مسلمان ہی کو نہیں، بلکہ کافر کو بھی، کیونکہ انسان کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے تو کسی سبب سے ہوتی ہے اور وہ اسباب یہ ہیں: حسن وکمال یا جود ونوال یا فضل وکمال اور جس میں یہ اسباب قوی ہوں گے، اس سے محبت بھی قوی ہوگی اور یہ معلوم ہے کہ یہ اوصاف بالذات حق تعالیٰ ہی میں ہیں، دوسری اشیاء میں بالعرض ہیں، پس یوں کہنا چاہیے کہ محبت اور میلان حقیقت میں خدا تعالیٰ ہی کی طرف ہوتا ہے اور دوسری اشیاء کی طرف میلان محض اس وجہ سے ہے کہ ان میں صفاتِ حق کا ظل

---

(۱) أخرجه الامام البخاری فی صحیحه عن ابن عباس رضی الله عنهما مرفوعا، رقم الحدیث: ٦٤٣٦ (باب ما یتقی من فتنة المال)، وفی الصحیح لمسلم عن أنس رضی الله عنه، رقم الحدیث: ١٠٤٨، باب لو أن لابن آدم وادیین لابتغی ثالثا.

ظاہر ہو رہا ہے، لیکن ان چیزوں پر نظر کا منحصر ہو جانا اس لیے ہے کہ لوگوں کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ اوصاف حقیقت میں حق تعالیٰ کے اندر ہیں، جس وقت یہ معلوم ہوگا کہ حضرت حق ہی محسن و منعم ہیں اور وہی حسین و جمیل اور صاحب فضل و کمال ہیں اور مخلوقات میں محض ان کا ظل ہے، اس وقت ہر شخص حق تعالیٰ ہی کی طرف مائل و متوجہ ہوگا۔

پس حضور ﷺ کے علاج کا حاصل یہ ہوا کہ اپنی توجہ کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کردو اور چونکہ حق تعالیٰ سے طبعی تعلق ہے، اس لیے یہ توجہ اشد و اکمل ہوگی تو جتنی توجہ الی اللہ ہوگی، اتنی ہی دنیا سے توجہ ہٹے گی، کیونکہ دو چیزوں کی طرف نفس متوجہ نہیں ہوسکتا۔

مگر اس علاج میں ایک غلطی ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ جب بندہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو عجب و ناز میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے کو صاحب کمال سمجھنے لگتا ہے کہ میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر کامل ہو گیا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے اس کی اصلاح حدیث کے عنوان ہی سے کر دی ہے، وہ یہ کہ آپ ﷺ نے یہاں توجہ الی اللہ نہیں فرمایا، یتوب اللہ علی من تاب فرمایا ہے جس میں من تاب میں تو حرص کا علاج مذکور ہے کہ توجہ الی اللہ اس کا علاج ہے اور یتوب اللہ بڑھا کر یہ بتلا دیا کہ محض تمہاری توجہ سے یہ مرض زائل نہ ہوگا، بلکہ علت تامہ کا جز و اخیر ایک اور چیز ہے، وہ یہ کہ تمہاری توجہ کے بعد حق تعالیٰ بھی تم پر توجہ فرمائیں گے، تب یہ مرض زائل ہوگا اور جب خدا تعالیٰ کی توجہ علت تامہ کا جز و اخیر ہے تو اصل علاج خدا تعالیٰ کی توجہ ہے، محض تمہاری توجہ کافی نہیں، اس میں عجب و ناز کا علاج ہو گیا کہ اپنی توجہ اور طاعات پر ناز نہ کرنا، کیونکہ اس سے کچھ نہیں ہوا، بلکہ کام تو خدا کی عنایت سے بنا ہے، اب اس مختصر حدیث میں چار مضمون بیان ہو گئے۔

ایک یہ کہ حرص مرض ہے۔

دوسرے یہ کہ اس کے مقتضا پر عمل کرنے اور اس میں زیادتی کرنے سے تقاضا

فرو نہ ہوگا، بلکہ دونا بڑھے گا۔

تیسرے یہ کہ اس کا علاج توجہ الی اللہ ہے۔

چوتھے یہ کہ اصل علاج خدا کی توجہ ہے جو عادۃ بندہ کی توجہ پر مرتب ہے و متفرع ہوجاتی ہے۔

(وعظ: علاج الحرص، صفحہ نمبر: ۲۸۳ تا ۲۸۴، جلد نمبر: ۸ حقیقتِ مال وجاہ)

حضور ﷺ کے ارشاد لو کان لابن آدم وادیان من مال میں لفظ ''ابن آدم'' کے اختیار کرنے کی وجہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ

لو کان لابن آدم وادیان من مال (۱)

اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لفظ ابن آدم اختیار فرمایا ہے، کیونکہ ابن آدم کے عنوان میں ایک مقبول کی طرف نسبت ہے جس سے شرم دلانا منظور ہے کہ ایسے مقبول کا بیٹا اور نبی زادہ ہوکر اس کی خصلت ایسی جو بہائم جیسی ہے، دوسری توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حرص کو مذموم کے ساتھ خاص نہ کیا جائے، بلکہ عام مان لیا جائے جو محمود و مذموم سب کو شامل ہو، اس صورت میں لفظ ابن آدم میں اضافت سے بناء حرص کی طرف اشارہ ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام میں ایک حرص محمود پیدا ہوئی تھی، مگر حضرت انسان اس کی وجہ سے حرص مذموم میں مبتلا ہوگئے۔ مگر یہ توجیہ عوام کے مناسب نہیں، بلکہ خاص کے سمجھنے کی ہے، عوام کو ابن آدم کہنے کی وہی وجہ سمجھنی چاہیے جو پہلے مذکور ہوئی۔ (نیز ابن آدم کہنے سے اس خاصہ کے عموم پر اور فطری ہونے پر بھی اشارہ ہے۔)

(وعظ: علاج الحرص، صفحہ نمبر: ۲۶۷، جلد نمبر: ۸ حقیقت مال وجاہ)

(۱) تقدم تخریجه.

احادیث محبت میں بظاہر اختلاف کی تطبیق

احادیثِ محبت میں جو بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سب سے زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ دوسری سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا۔ تیسری سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا، واقع میں ان میں تعارض اور اختلاف کچھ نہیں، سب حدیثیں مختلف درجاتِ محبت کے اعتبار سے صحیح ہیں، کیونکہ جس حدیث سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ازواج مطہرات میں وہ سب سے زیادہ محبوب ہیں اور جس حدیث سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے اصحاب واحباب میں سے سب سے زیادہ محبوب تھے۔

(وعظ: احکام العشرۃ الاخیرۃ، صفحہ نمبر: ۲۸۳، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

حضور اقدس ﷺ کا گاہے گاہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے

مزاح فرمانے کی وجہ اور حکمت

حضور ﷺ گاہے گاہے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مزاح فرمایا کرتے تھے اور حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ کی ہے تو کیا تمہارے نزدیک معاذ اللہ حضور ﷺ نے بھی یہ کام فضول کیے ہیں؟ معلوم ہوا کہ کوئی مباح اپنی ذات سے فضول نہیں، بلکہ ہوسکتا ہے کہ جن کاموں کو تم فضول سمجھتے ہو، ان میں بھی کوئی دینی حکمت ہو، چنانچہ حضور ﷺ کے مزاح میں ایک حکمت مناسب نبوت تھی، وہ یہ کہ آپ ﷺ کا جلال خداداد بہت بڑھا ہوا تھا، جو صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ کے سامنے دل کھول کر بات کرنے سے مانع تھا، اس لیے آپ ﷺ نے ان کو اپنے سے بے تکلف کرنے کے لیے مزاح شروع فرمایا، کیونکہ افادہ واستفادہ کے لے اس کی

ضرورت ہے کہ طرفین کے دل کھلے ہوئے ہوں، کسی کو انقباض نہ ہو۔ انقباض مانع فیض ہوتا ہے، خواہ طالب کی طرف سے ہو یا مربی کی طرف سے ہو، اسی طرح ہر کامل کے ہنسی اور مزاح میں اس کے مناسب حال کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے جس پر ناقص کی نظر نہیں پہنچتی، اس لیے وہ اعتراض کرتا ہے۔

(وعظ: ماعلیہ الصبر ،صفحہ نمبر: ۱۴۰، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر وشکر)

غنی النفس کا ظاہری افعال پر بھی اثر ہوتا ہے

آپ ﷺ نے فرمایا:

الغنى غنى النفس۔ (۱)

کہ غنی نفس کا غنا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ غنا ظاہری کوئی چیز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصل غنا تو نفس ہی کا غنا ہے اور جب نفس میں غنا ہوتا ہے تو پھر ویسے ہی افعال صادر ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ مطلب نہیں کہ تقویٰ ظاہری کوئی چیز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کی جڑ تو قلب میں ہے اور جب تقویٰ قلب میں ہوتا ہے تو افعال بھی اچھے ہی صادر ہوتے ہیں، بخلاف اس کے کہ اگر تقویٰ قلب میں نہ ہوگا تو اچھے افعال کے صادر ہونے کا تقاضا نہ ہوگا۔

(وعظ: الصلوٰۃ، صفحہ نمبر: ۱۳۱، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن أبي هريرة رضي الله عنه، ولفظه: قال: قال رسول الله ﷺ:
ليس الغنى عن كثر ... نى غنى النفس.

کتاب الفتن

اشرف الکلام فی احادیث خیر الانام
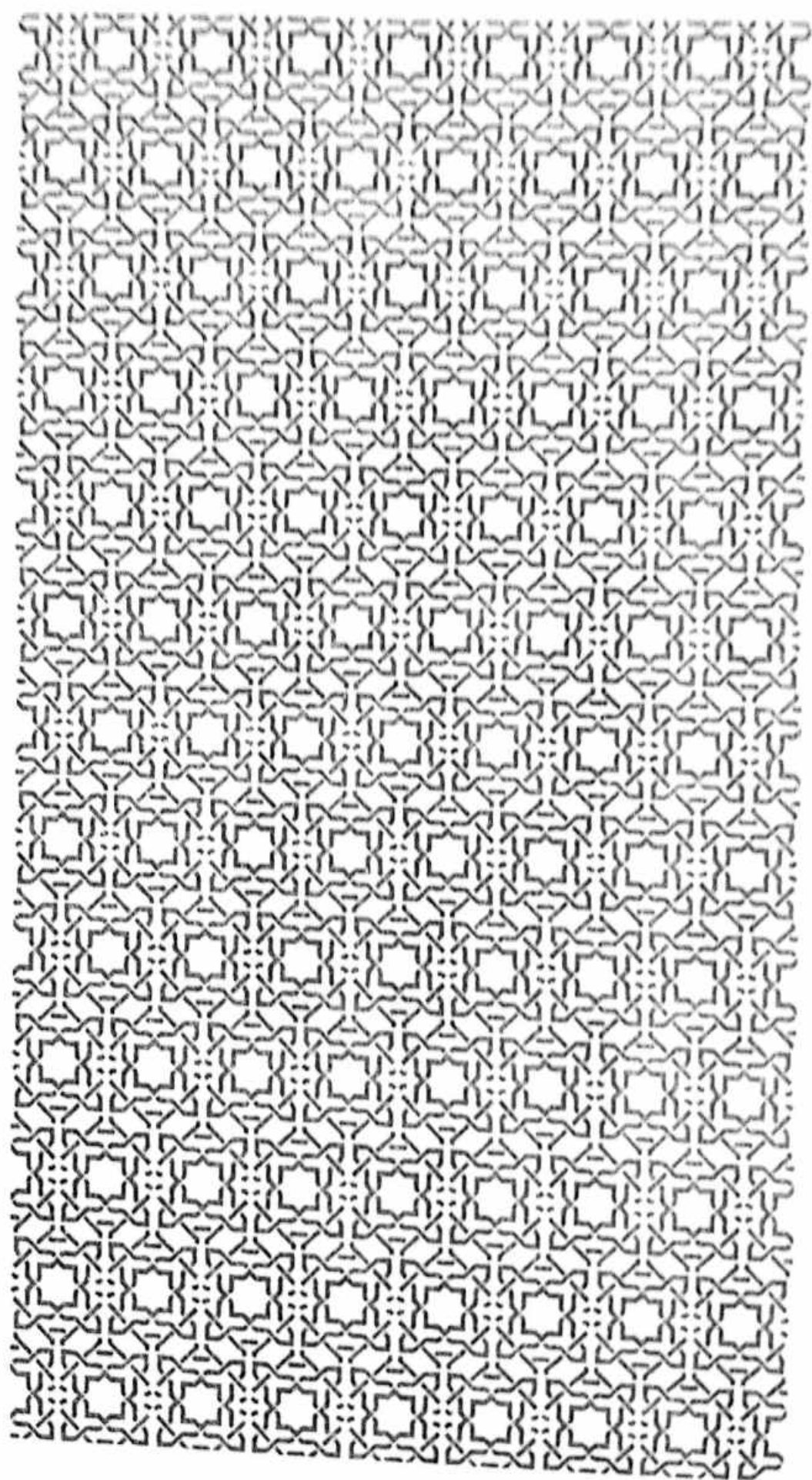
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کتاب الفتن

اللہ کے قانون میں سب کے باغی ہونے کی صورت میں ہی عام ہلاکت ہوگی

لاتقوم الساعة حتى لا يقال في الأرض الله الله (۱)

جب تک کوئی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے، قیامت نہ آئے گی۔

مختصراس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام طاعت ہے اور کفر بغاوت ہے تو دنیوی سلطنتوں کا تو یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی شہر میں باغی زیادہ ہوں تو شہر پر توپ خانہ لگا دیا جاتا ہے، خدا تعالیٰ بھی اگر یہی کرتے تو اکثر اوقات توپ لگے ہوتے، مگر یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے یہ قانون مقرر کیا کہ اگر کل باغی ہوں، مگر صرف ایک غیر باغی ہو تو اس کی بدولت تمام عالم محفوظ رہے گا۔ ہاں جب بغاوت عام ہو جائے اس وقت پھر ہلاک عام بھی ہوگا۔

یہیں سے ایک اور بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ بہت سے لوگ جن کو آپ حقیر سمجھتے ہیں، جیسے اللہ اللہ کہنے والے غرباء، وہ آپ کی بقاء کے سبب ہیں اور اللہ تعالیٰ کے

---

(۱) أخرجه الامام مسلم في صحيحه عن أنس بن مالك ﷺ مرفوعا، رقم الحديث: ۲۳۴ باب ذہاب الایمان آخر الزمان، مسند احمد، رقم الحدیث: ۱۲۰۴۳

اس خلق کا اتباع ہم کو بھی کرنا چاہیے کہ ایک کے لیے سب کی رعایت فرمائی۔ شیخ فرماتے ہیں:

مراعات صد کن برائے یکے

ایک کی خاطر سو کی رعایت کرو۔

(وعظ: ضرورت العلماء، صفحہ نمبر: ۳۳۳، جلد نمبر: ۳ دین و دنیا)

صلحاء زمانہ پر مصائب آنے کی وجہ

حدیث میں حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا انھلک و فینا الصالحون [1] (کیا ہمیں ہلاک کردیا جائے گا، حالانکہ ہمارے درمیان نیک آدمی بھی ہیں) تو حضور ﷺ نے یہی ارشاد فرمایا نعم اذا کثر الخبث (ہاں جب خبیثوں کی کثرت ہوجائے) پس جب زیادہ سوء تدبیر کے مرتکب ہیں تو باوجود بعض قلیل کے تدبیر کرنے کے مصائب کا نزول کیا محلِ شبہ رہا، باقی یہ بات کہ ان صلحاء پر تو وہ مصیبت نہ آنا چاہیے، سو بعض حکمتوں سے عادۃ اللہ یہ ہے اس حالت میں دنیا میں جو مصیبت آتی ہے اس میں سب ہی شریک ہوتے ہیں، ہاں آخرت میں اپنے اپنے اعمال کے موافق محشور ہوں گے اور دنیا میں بھی وہ شرکتِ ظاہری حقیقت میں رحمت ہی ہوتی، سو بعض صلحاء کے اعتبار سے تو یہ جواب ہے اور بعض صلحاء کے اعتبار سے دوسرا جواب ہے۔

اس زمانہ کے اکثر صلحاء مداہن ہیں

وہ یہ کہ اس زمانہ کے بعض صلحاء بھی منکرات کے دیکھتے دیکھتے مداہن (سستی کرنے والے) ہوگئے ہیں، اب جو لوگ علماء اور اتقیاء اور صلحاء کہلاتے ہیں باستثنائے خواص اہل اللہ کے اکثر کی کیفیت یہ ہے کہ نافرمانی کرنے والوں سے ان کو

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیھما عن زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا مرفوعا.

انقباض نہیں ہوتا، بے تکلف میل جول کھانا، پینا، شادی بیاہ، مرنے جینے میں شرکت اہل معصیت کی کرتے ہیں۔

(وعظ: وعظ الاستغفار، صفحہ نمبر: ۲۷، جلد نمبر: ۲۳ راہ نجات)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت عزرائیل علیہ السلام کو طمانچہ مارنے کا واقعہ

موت کا واقعہ یہ ہوا کہ عزرائیل علیہ السلام آپ کے پاس قبض روح کے واسطے تشریف لائے، آپ نے ان کے ایک طمانچہ مارا[1]۔ بعض ملاحدہ نے اس قصہ سے انکار کیا ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ یہ لوگ انبیاء کے مراتب سے واقف نہیں، موسیٰ علیہ السلام کے طمانچہ سے عزرائیل علیہ السلام کی آنکھ پھوٹ گئی تو عزرائیل حق تعالیٰ کے حضور میں پہنچے اور عرض کیا: انه لا یرد الموت کہ موسیٰ علیہ السلام تو موت سے گریز کرتے ہیں اور انہوں نے مجھے اس طرح مارا۔

یہاں پر اشکال یہ ہے کہ کیا موسیٰ علیہ السلام کو خدا کے حکم سے انکار تھا؟

جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو پہچانا نہیں، کیونکہ اس وقت عزرائیل بہ شکل بشر آئے تھے۔

انبیاء علیہم السلام کا ادب یہی ہے کہ فرشتے ان کے پاس اپنی قاہرانہ صورت میں نہ آویں، بلکہ کسی بشر کی صورت میں آویں، اس لیے عزرائیل علیہ السلام بشر کی صورت میں آئے تھے، موسیٰ علیہ السلام نے پہچانا نہیں اور ایک طمانچہ رسید کیا۔

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن أبي هريرة رضي الله عنه مرفوعا، ولفظه: "أرسل ملك الموت الى موسى عليهما السلام، فلما جاءه صكه، فرجع الى ربه، فقال: أرسلتني الى عبد لا يريد الموت، فرد الله عليه عينه- الى آخر الحديث.

اگر یہ شبہ کیا جاوے کہ فرشتوں میں تو بڑی قوت اور طاقت ہوتی ہے، موسیٰ علیہ السلام کے طمانچہ سے ان کی آنکھ کیسے پھوٹ گئی؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام میں قوت زیادہ تھی۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلم ہے کہ فرشتوں میں قوت زیادہ ہوتی ہے، مگر اصل اور غالب یہ ہے کہ جس نوع کی صورت میں وہ آتے ہیں، اس وقت اسی نوع کے برابر قوت ہوتی ہے، جب فرشتہ شکلِ بشر میں ہوگا تو اس وقت میں بشر سے زیادہ قوت نہ ہوگی۔ اسی طرح جنات بھی جس شکل میں ہوں گے، اسی جیسی قوت ہوگی۔

(وعظ: سلوة الحزین، صفحہ نمبر: ۵۴۱ تا ۵۴۲، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر و شکر)

کتاب المناقب والفضائل
اشرف الکلام فی اَحادیث خیر الاَنام ﷺ
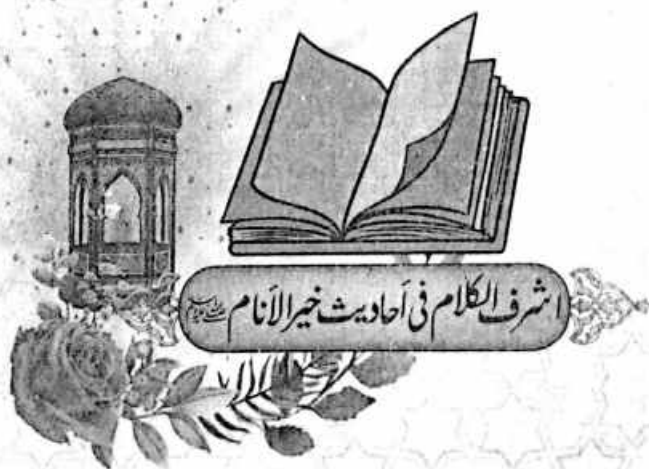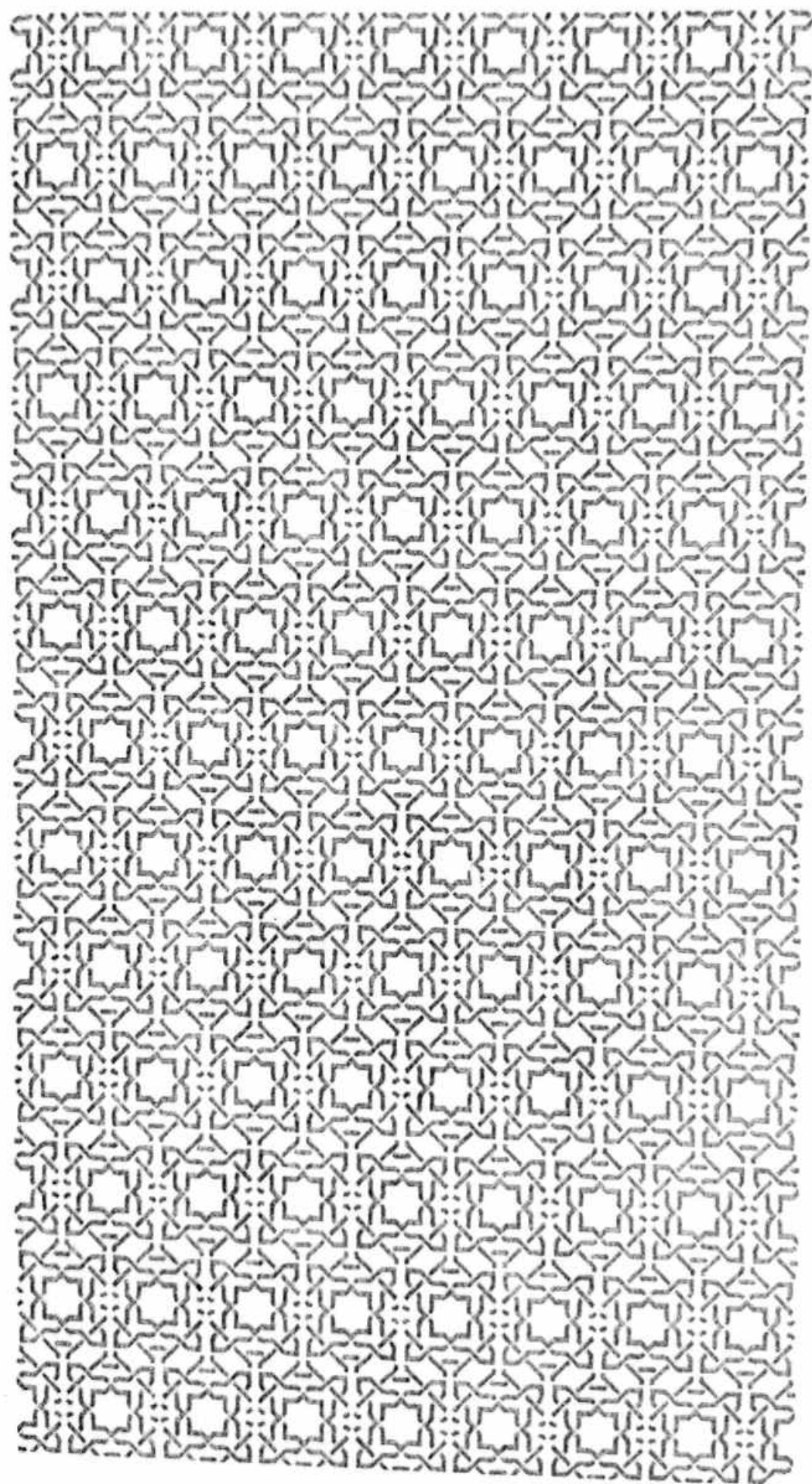
بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کتاب المناقب والفضائل

اتباعِ نبوی کی روح ہر بات میں سادگی ہے

نحن أُمَّةٌ أُمِيَّةٌ(۱)

امیة کے معنی سادگی کے ہیں تو حضور ﷺ کی اصل مرضی یہ ہے کہ آپ ﷺ کی امت نہایت سادہ رہے، اسی لیے آپ ﷺ نے لفظ نحن فرما کر ساری امت کو شامل فرمالیا، یہی روح ہے اتباعِ نبوی کی کہ ہر بات میں بالکل سادگی ہو۔ امیة، ام کی طرف منسوب ہے، مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی ایسی ہے، جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد بچہ کی زندگی ہوتی ہے کہ اس کی کوئی حرکت بھی تصنع اور بناوٹ کی نہیں ہوتی، بلکہ ہر حرکت میں ساختگی ہوتی ہے اور بچوں کی یہی صفت ہے جس کی وجہ سے ہر شخص کو ان سے محبت ہوتی ہے، ورنہ طبعا بچوں سے جو کہ نجاست کے پوٹ ہوتے ہیں، بہت نفرت ہونی چاہیے تھی اور یہی باساختگی ہے، ورنہ لکھنا پڑھنا جو امیت کا مشہور مفہوم ہے، یہ بھی اس کا ایک شعبہ ہے تو بیان میں بھی بناوٹ اور تکلف بالکل نہ ہونا چاہیے اور تلبیس اور تلمع سے بالکل پاک ہونا چاہیے، البتہ بیان میں سادگی کے ساتھ صفائی ہونی ضروری ہے، لیکن اب یہ طرز بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔

(وعظ: تعلیم البیان، صفحہ نمبر: ۳۱۹، جلد نمبر: ۲ علم وعمل)

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما مرفوعا، ولفظه: "انا أمة أمية" الى اخر الحديث.

اہل اللہ سے محبت کرنے والے مقبول ومغفور ہوجائیں گے

حدیث شریف میں ہے کہ

المرء مع من أحب (۱)

یعنی آدمی اس کے ساتھ ہے جس کو وہ چاہتا ہے تو جب بزرگوں سے محبت ہوگی اور وہ بزرگ ہیں مقام مقبولیت میں تو یہ شخص بھی ان کے ساتھ مقام مقبولیت میں ہوگا اور مقبول ہونا موقوف ہے، مغفور ہونے پر، پس ضرور یہ مغفور بھی ہوجائے گا۔

(وعظ: الخلط، صفحہ نمبر: ۲۷۳، جلد نمبر: ۲۶ اصلاح اعمال)

مومن کا اپنے بھائی سے تین دن تک قطع کلامی کی اجازت کی اصل وجہ

لا یحل لمؤمن ان یھجر أخاہ فوق ثلثة ایام (۲)

کوئی شخص اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ ہجراں نہ کرے۔

یعنی اگر کسی سے دنیوی معاملہ میں رنج وتکرار ہوگیا ہو تو تین دن تک تو بات چیت، سلام کلام ترک کرنا جائز ہے، اس سے زیادہ جائز نہیں، کیونکہ شارع علیہ السلام نے عادتِ انسانیہ سے یہ معلوم کرلیا ہے کہ طبعی غم وغصہ تین دن میں کم ہوجاتا ہے، اس کے بعد بتکلف بڑھانے سے رنج بڑھے گا، اگر اسباب زیادہ اختیار نہ کئے جائیں تو تین دن کے بعد رنج کا غلبہ باقی نہیں رہ سکتا تو جب طبعی رنج کا غلبہ تھا، اس وقت تک شریعت نے بھی اس کو ترکِ کلام میں معذور سمجھا، جب غلبہ جاتا رہا، اب یہ معذور نہیں، اب ترکِ کلام وسلام محض خبثِ نفس کی وجہ سے ہے، اس کی اجازت نہیں، یہ بھی حضور ﷺ نے بڑی رحمت فرمائی کہ تین دن تک ہجران کی اجازت دے دی، اگر کوئی فلسفی ہوتا تو ایک دن کے لیے بھی ہجران کو جائز نہ رکھتا اور یہ کہتا کہ ہجران اتفاق

---

(۱) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه مرفوعا.

(۲) أخرجه الشيخان في صحيحيهما عن أنس بن مالك رضي الله عنه مرفوعا.

اور اتحاد باہمی کے خلاف ہے، پس رنج وتکرار کو جلد رفع کرنا اور فورا صفائی کر لینا چاہیے، مگر حضور ﷺ کی جذباتِ نفس پر بہت گہری نظر ہے، آپ ﷺ نے تین دن تک ہجران کی اس لیے اجازت دی کہ فورا صفائی کرنا عادۃ دشوار اور نفس پر بہت گراں ہوتا ہے، آپ ﷺ نے ہمارے اوپر گرانی اور دشواری ڈالنا گوارا نہیں فرمایا۔

دوسرے رنج وتکرار کے وقت چونکہ دونوں طرف نفس میں رنج وغصہ بھرا ہوگا تو فورا صفائی کرنے سے یہ صفائی بیکار ہوگی، گو ظاہر میں دونوں بات چیت کرنے لگیں گے، مگر دلوں میں سخت غبار ہوگا اس حالت میں صفائی کرنے سے کینہ پیدا ہو جائے گا اور اس سے جو غرض تھی، یعنی اتحاد و اتفاق، وہ مطلق حاصل نہ ہوگی، اس لیے آپ ﷺ نے معا صفائی کا حکم نہیں دیا، بلکہ تین روز تک ترک کلام وہجران سے دل کا غبار نکالنے کی اجازت دیدی، جب تین دن میں دل کا غبار نکل گیا اور غلبۂ رنج فرو ہوگیا، اب ملنے جلنے کا حکم دیا، اس وقت صفائی سے نفع بھی ہوگا اور چونکہ غبار نکل چکا ہے، اس لیے کینہ بھی پیدا نہ ہوگا، واقعی حضور ﷺ کے ارشادات میں جذباتِ نفس کی جس درجہ رعایت ہے، اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

اور یہ حکم دنیوی رنج وتکرار کا ہے اور اگر کسی سے دینی معاملہ میں رنج ہوگیا ہو تو اس میں یہ حد نہیں، بلکہ جب تک دوسرا شخص اس معصیت سے جو سببِ ہجران تھی، توبہ خالص نہ کرے، اس وقت تک ہجران کی اجازت ہے اور بعض مواقع میں واجب ہے۔

(وعظ: حقیقت الصبر ،صفحہ نمبر: ۸۵، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر وشکر)

جیسے محبوب ناز کرتا ہے، ایسا محب بھی کبھی ناز کرتا ہے

افک کے قصہ میں جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا:

أبشری یا عائشه! فقد برأك الله (۱)

(۱) أخرجه الشیخان فی صحیحیهما عن عائشة رضی الله عنها مرفوعا.

یعنی خوش ہوا اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے تم کو بری کر دیا۔ اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے عائشہ! کھڑی ہو کر حضور ﷺ کا شکریہ ادا کرو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں آپ ﷺ کا شکریہ کیوں کروں؟ میں تو اپنے اللہ کی حمد بیان کروں گی۔

دیکھئے! بظاہر تو یہ کلمہ بے ادبی کا ہے، لیکن حقیقت اور منشا اس کا حضور ﷺ کی محبت ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قلب حضور ﷺ کی محبت سے لبریز تھا اور جیسے محبوب ناز کیا کرتا ہے، کبھی محب بھی کرتا ہے، لیکن ہر شخص کا حوصلہ نہیں ہے کہ ایسی بات کہے یا جی میں لائے، اس لیے کہ

ناز را روئے بباید ہمچو ورد
چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

(ناز برداری کے لیے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے، اگر تو ایسا نہیں ہے تو بری عادات چھوڑ دے)

(وعظ: التہذیب، صفحہ نمبر: ۴۳۰، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

مبالغہ فی العمل کا مآل تعطل ہے

أما أنا فاقوم وارقد، وأصوم وأفطر، وأتزوج النساء، هذا سنتي، فمن رغب عن سنتي فليس مني (۱)

(حالانکہ میں رات کو قیام بھی کرتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں اور روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور میں مستورات سے شادی بھی کرتا ہوں،

(۱) أخرجه الامام البخاری فی صحیحه عن أنس بن مالك رضي الله عنه مرفوعا، رقم الحدیث: ۵۰۶۳ باب الرغیب فی النکاح، ولفظه: أنتم الذین قلتم کذا وکذا، أما والله انی لأخشاکم لله وأتقاکم له، لکنی أصوم وأفطر، وأصلی وأرقد، وأتزوج النسا، فمن رغب عن سنتی فلیس منی. ومسند احمد رقم الحدیث: ۶۴۷۷، وصحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۱۷

یہ میری سنت ہے جو میری سنت سے روگردانی کرے وہ مجھ سے نہیں۔)

اب ظاہر بین سمجھتا ہے کہ حضور ﷺ نے تکثیر عمل سے منع فرمایا، مگر شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ درحقیقت حضور ﷺ نے تقلیل عمل سے منع فرمایا ہے، کیونکہ مبالغہ فی العمل کا مآل تعطل ہے۔[۱] ہمارے مولانا یعقوب صاحب رحمہ اللہ ہم سے فرمایا کرتے تھے کہ محنت میں زیادتی نہ کرنا، یہ کامل اور عاقل کی تعلیم ہے۔

(وعظ: رفع الالتباس، صفحہ نمبر: ۱۳۹، جلد نمبر: ۲۰ حقوق الزوجین)

سارے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور مقتدائے دین عقلاء اور حکماء تھے، لیکن چالاک اور مکار نہ تھے

حدیث شریف میں ہے:

لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین[۲]

یعنی مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں کاٹا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر مومن کو کسی جگہ سے ضرر پہنچے تو اس کی شان یہ نہیں ہے کہ پھر وہاں جاوے یا کسی آدمی سے تکلیف ونقصان پہنچا تو یہ مناسب نہیں ہے کہ پھر اس سے معاملہ کرلے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومن کے لیے اتنی بیدار مغزی کمال کی بات ہے کہ اپنے کو مضرت سے بچائے، اسی واسطے دین کو نفع ہمیشہ عقلاء ہی سے ہوا ہے، انبیاء علیہم السلام اور مقتدائے دین جس قدر ہوئے ہیں، سب بڑے عاقل تھے، کسی نبی کی ایسی حکایت نہ سنی ہوگی وہ بھولے ہوں، ان کو کچھ خبر نہ ہو، ہاں! چالاک ومکار نہ تھے، عاقل، ہوشیار، حکیم تھے اور یہی تو وہ شے ہے کہ جس کی بناء پر خلیفۃ اللہ بنایا گیا ہے، غرض یہ ہے کہ عورتوں میں چالاکی اور مکر ہے، عقل نہیں۔

(وعظ: اصلاح النساء، صفحہ نمبر: ۱۶۷، جلد نمبر: ۲۰ حقوق الزوجین)

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ (۳۴/۲) دار الجیل، بیروت۔

(۲) أخرجہ الشیخان رحمہما اللہ فی صحیحیہما عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ مرفوعا۔

صلاۃ کا اللہ تعالیٰ کی صفت ہونے سے مراد

قف یا محمد! فان ربك یصلی۔[1]

یعنی ٹھہرو اے محمد ﷺ! اس لیے کہ آپ کا رب نماز پڑھتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ بھی حق تعالیٰ کی صفت ہے۔

اس حدیث سے منکرین حدیث کو تو یہ ضرور ہوا کہ انہوں نے اس کے حدیث ہونے ہی سے انکار کر دیا اور کم علمی اور کم فہموں کو یہ غلطی ہوئی کہ وہ اس کے ظاہر کا اعتقاد کر بیٹھے۔ بات یہ ہے کہ یہاں صلوٰۃ کے معنی توجہ اور رحمت کے ہیں، جیسا کہ قرآن شریف میں ھو الذی یصلی علیکم اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں، رہا یہ شبہ کہ رحمت و توجہ فرمانا حضور ﷺ کو آگے بڑھنے سے کیوں مانع ہوا؟

بات یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ یوں تو ہر وقت مورد تجلیات اور رحمتوں کے رہتے تھے کہ کسی کو انبیاء و اولیاء میں سے یہ مرتبہ حاصل نہ تھا، لیکن اس وقت حق تعالیٰ نے چاہا کہ خاص تجلیات اور قرب خاص سے مشرف فرمادیں اور ان تجلیات خاصہ و قرب خاص کے لیے ضرورت تھی استعداد خاص کی، اس لیے ٹھہرے رہنے کا حکم فرمایا کہ ابھی ٹھہرو، اللہ تعالیٰ تم پر اپنے انوار و رحمت فائض فرما رہے ہیں، تاکہ تمہارے اندر استعداد تام ہو جائے، آئندہ تجلیات کی۔

(وعظ: الصوم، صفحہ نمبر: ۱۰۰، ۱۰۱، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم و صلوٰۃ)

---

(۱) الفردوس بمأثور الخطاب للدیلمی ۳/ ٤٧٩ (٥٣٦٢) عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما وتاریخ بغداد عن عطاء مرسلاً، وذکره ابن الجوزی فی "الموضوعات" ۱/ ۱۷۱ (۲٥۳) وقال: هذا إسناد کل رجاله ثقات إلا أنه موقوف علی عطاء، فلعله سمعه من لا یوثق به ولا یثبت مثل هذا بهذا، وانظر التعقب علیه للسیوطی والکنانی فی التنزیة الشریعة ۱/ ۱٤۳.

باب الاعتصام بالکتاب والسنة

اشرف الکلام فی أحادیث خیر الأنام ﷺ
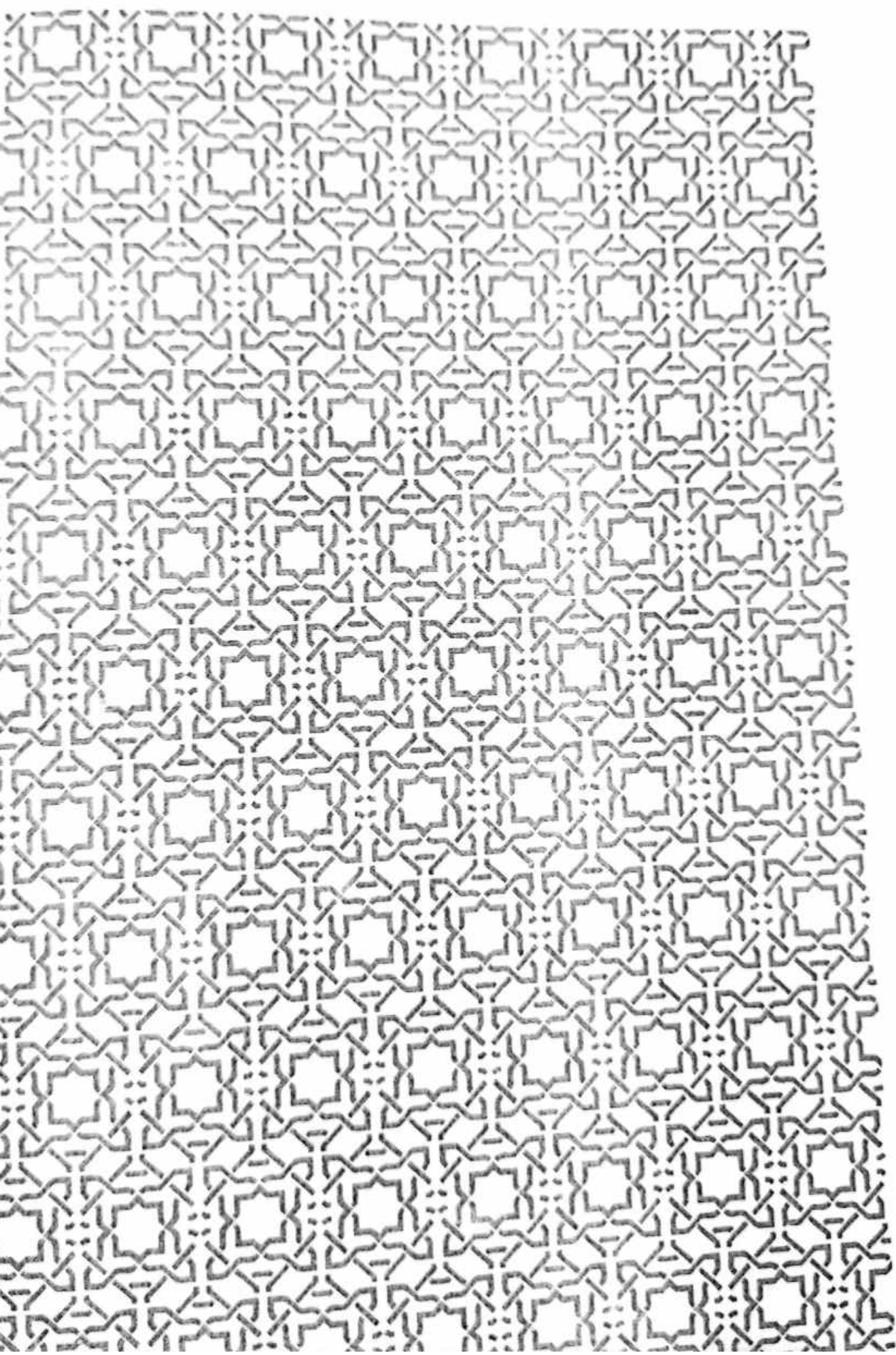
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ

حدیث تابیرِ نخل کی تشریح

تابیر کے معنی یہ ہیں کہ نر کھجور کے پھول مادہ کے اوپر اچھالے جاتے ہیں کہ وہ اس کے پتوں سے مس کرتے ہوئے نیچے گر جاتے ہیں۔ اس تابیر کی خاصیت یہ ہے کہ مادہ کو پھل بہت آتا ہے (کھجور میں بھی نر و مادہ ہوتا ہے۔ نر کی پہچان یہ ہے کہ اس کو پھل نہیں آتا، صرف پھول آتا ہے۔)

ایک عرب سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے عربی میں ایک خطبہ بھی سنایا جو تابیر کے وقت اہل عرب پڑھا کرتے ہیں، جیسے ہمارے یہاں گڑیوں کے بیاہ میں ایک مخترع خطبہ پڑھا جاتا ہے، ایسے ہی وہاں بھی بطور لہو ولعب کے تابیر کے وقت ایسے معاملات ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے اور آپ کو تابیر کا علم ہوا تو آپ کو شبہ ہوا کہ یہ کوئی ٹوٹکا نہ ہو، مگر یقین بھی نہ تھا، اس لیے آپ ﷺ نے نرمی کے ساتھ اس پر انکار فرمایا:

لانکم لو لم تفعلوا کان خیرا (۱)

---

(۱) اخرجه الامام مسلم رحمه الله فی صحیحه عن رافع بن خدیج امر فوعا، رقم الحدیث: ۲۳۶۲ (۳۸- باب وجوب امتثال ما قاله شرعا، دون ما ذکره ﷺ من معایش الدنیا، علی سبیل الرأی).

کہ اگر تم یہ کام نہ کرو تو غالباً مناسب ہو۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تو جان نثار تھے، آج کل کی طرح معارضہ کرنے والے نہ تھے، ان کی جان نثاری کی یہ حالت تھی کہ ایک صحابی نے قبہ دار مکان بنایا تھا، رسول اللہ ﷺ کا ان کے مکان پر گزر ہوا، آپ ﷺ نے پوچھا کس کا مکان ہے؟ معلوم ہوا کہ فلاں صحابی رضی اللہ عنہ کا ہے، آپ ﷺ کو ان کا یہ فعل ناپسند ہوا، کیونکہ بلاضرورت بلند عمارات قومِ ثمود کا خاصہ ہے۔

وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ

اس کے بعد وہی صحابی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے کچھ بے رخی ظاہر فرمائی، وہ بے تاب ہو گئے اور صحابہ سے اس کا سبب پوچھا، سب نے اس سے لاعلمی ظاہر کی اور یہ کہا کہ اتنی بات تو ہوئی کہ حضور ﷺ نے تمہارے قبہ دار مکان کو ناپسند فرمایا، اتنا سنتے ہی وہ اپنے مکان پر آئے اور قبہ کو گرا دیا، پھر کمال یہ کیا کہ حضور ﷺ ہی کا گزر ہوا دوبارہ وہاں کو ہوا اور آپ نے قبہ نہ دیکھا تو دریافت فرمایا کہ یہاں ایک قبہ تھا، وہ کیا ہوا؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! (ﷺ)! آپ نے اس سے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا، یہ خبر سن کر مالکِ قبہ نے اس کو گرا دیا، حضور ﷺ خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا جس کا حاصل یہ تھا:

> ”کہ دنیا میں ایسی پختگی کی کیا ضرورت ہے، بس گزر کے لیے تھوڑی سی عمارت کافی ہے“۔(۱)

---

(۱) أخرجه الامام ابو داود فی سننه، رقم الحدیث: ۵۲۳۷، (باب ما جا فی البناء) ولفظه: عن انس بن مالك، ان رسول الله ﷺ، خرج فرأى قبة مشرفة فقال: ما هذه؟ قال له اصحابه: هذه لفلان رجل من الانصار، قال: فسكت وحملها فی نفسه =

توصحابہ ایسے جان نثار تھے، انہوں نے جو حضور ﷺ کا ارشاد ترک تابیر کی طرف دیکھا، اسی وقت سب نے تابیر کو چھوڑ دیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ اس سال پھل کم آیا، تب حضور ﷺ کو معلوم ہوا کہ یہ کوئی ٹوٹکا نہیں، بلکہ اس فعل میں طبع خاصیت ہے اور طبی تدبیر ہے، اس لیے آئندہ کے لیے آپ ﷺ نے اجازت دے دی اور فرمایا:

انتم أعلم بأمور دنیاکم

کہ اپنے دنیوی کاموں کو تم ہی زیادہ جانتے ہو۔

اسی سے تو تعلیم یافتہ جماعت نے یہ مضمون نکالا ہے کہ حضور ﷺ نے ہمارے دنیوی امور میں بالکل دخل نہیں دیا، بلکہ ان کو ہماری رائے پر چھوڑ دیا ہے کہ جو طریقہ مناسب سمجھیں، اختیار کریں۔ یہ مولویوں کی زیادتی ہے کہ دنیوی معاملات میں بھی دخل دیتے ہیں کہ فلاں تجارت حرام ہے، فلاں جائز ہے اور اس طرح بیع کرنا جائز نہیں، اس طرح اجارہ کرنا فاسد ہے وغیرہ وغیر۔

میں کہتا ہوں کہ اگر انتم أعلم بأمور دنیاکم کا یہ مطلب ہے تو کیا قرآن کی ان آیتوں کو جن میں ربوا، سود، أکل الأموال بالباطل اور رشوت وغیرہ کو حرام کیا گیا ہے، قرآن سے نکال دو گے؟ اور وہ ہزارہا حدیثیں بھی جن میں بیوع و اجارات و

= حتی اذا جاء صاحبها رسول الله ﷺ یسلم علیه فی الناس أعرض عنه، صنع ذلك مرارا، حتی عرف الرجل الغضب فیه والاعراض عنه، فشکا ذلك الی أصحابه، فقال: والله انی لانکر رسول الله ﷺ، قالوا: خرج فرأی قبتك، قال: فرجع الرجل الی قبته فهدمها حتی سواها بالأرض، فخرج رسول الله ﷺ ذات یوم فلم یرها، قال: ما فعلت القبة؟ قالوا: شکا الینا صاحبها اعراضك عنه، فاخبرناه، فهدمها، فقال: أما ان کل بناء وبال علی صاحبه الا ما لا، الا ما لا، یعنی ما لا بد منه.

نکاح وطلاق، وہبہ ومیراث کے احکام مذکور ہیں، حدیث کی کتابوں سے نکال باہر کرو گے؟ ایسا نہیں کر سکتے تو یہ دعویٰ کیوں کر صحیح ہوا کہ حضور ﷺ نے دنیوی معاملات میں دخل نہیں دیا۔

معلوم ہوا کہ تم نے اس حدیث کا مطلب غلط سمجھا، بلکہ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ امور دنیا جو تجربہ کے متعلق ہیں، ان کو تم زیادہ جانتے ہو، باقی ان امور کے متعلق جو احکام ہیں، ان کو نبی کریم ﷺ ہی زیادہ جانتے ہیں۔

مگر چونکہ واقعہ تابیر سے کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ نبی کیسے ہیں جن کو حقائقِ اشیاء کا صحیح علم حاصل نہیں، اس شبہ کو رفع کرنے کے لیے حضور ﷺ نے یہ فرمادیا انتم أعلم بأمور دنیاکم جس کا حاصل یہ ہے کہ تجربات کا جاننا نبی کے لیے ضروری نہیں، بلکہ ضروری حقائق کا علم ضروری ہے۔ تو جن انبیاء کو سلطنت عطا ہوئی ہے، جیسے موسیٰ علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام وداؤد علیہ السلام اور ہمارے حضور ﷺ، ان کو انتظامِ سلطنت وتدبیر حرب وصلح بھی کامل عطا ہوئی ہے۔ ہمارے حضور ﷺ سلطان بھی تھے، جیسے پہلے بھی بعض انبیاء سلطان ہوئے ہیں، البتہ عیسیٰ علیہ السلام ظاہری سلطان نہ تھے، مگر ہمارے حضور ﷺ کی امت میں داخل ہو کر وہ بھی سلطان ہوں گے۔

(وعظ: السبر بالصبر، صفحہ نمبر: ۲۰۹ تا ۲۱۱، جلد نمبر: ۹ فضائل صبر وشکر)

كتاب التفسير
اشرف الکلام فی أحادیث خیر الأنام ﷺ
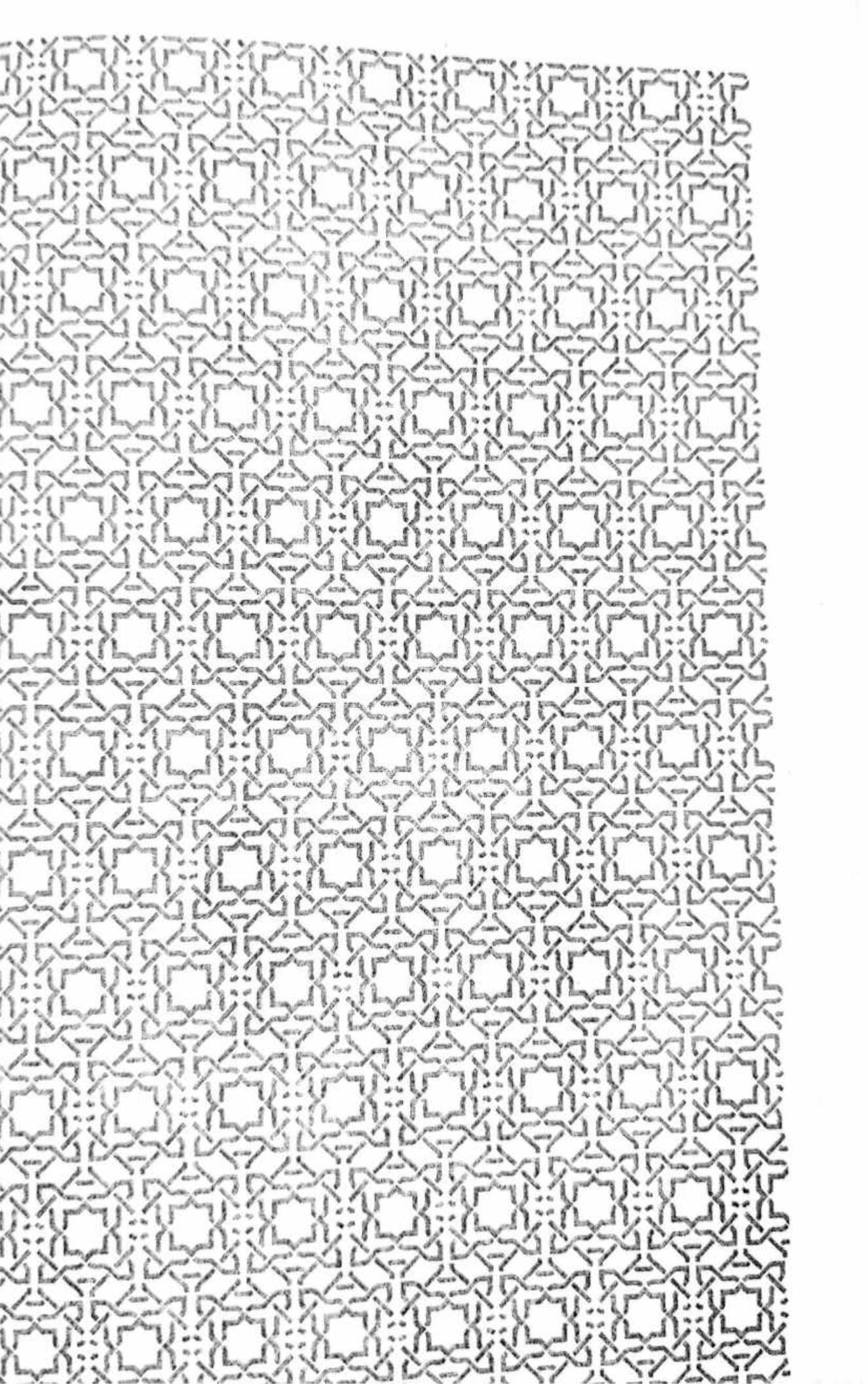
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب التفسیر

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن آلِ محمد ﷺ میں داخل ہیں

اس میں شک نہیں کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن بھی آلِ محمد ﷺ میں داخل ہیں، اس لیے یہ دعا ان کو بھی شامل تھی اور اسی طرح ذریت بھی داخل ہیں، بلکہ اصل مقتضائے لغت یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات تو آلِ محمد ﷺ ہیں اصالۃً داخل ہوں اور ذریت طبعاً داخل ہو، کیونکہ آل کہتے ہیں اہل بیت کو، یعنی گھر والوں کو اور گھر والوں کے مفہوم میں بیوی سب سے پہلے داخل ہے، پس یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ ذریت تو آل میں داخل ہوں اور ازواج داخل نہ ہوں۔

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے شبہ ہوگیا ہے، وہ یہ کہ حضور ﷺ نے ایک دفعہ حضرت علی و فاطمہ و حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کو اپنی عبا میں داخل فرما کر فرمایا:

اللھم ھو لاء اھل بیتی (۱)

---

(۱) أخرجه الامام الترمذي في سننه عن عمر بن أبي سلمة، ربيب النبي ﷺ قال: لما نزلت هذه الآية على النبي ﷺ [انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس أهل البيت ويطهركم تطهيرا] [الأحزاب: 33] في بيت أم سلمة، فدعا فاطمة وحسنا وحسينا فجللهم بكساء، وعلي خلف ظهره فجلله بكساء ثم قال: اللهم هؤلاء أهل بيتي فأذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهيرا. قالت أم سلمة: وأنا معهم يا نبي الله، قال: أنت على مكانك وأنت على خير، رقم الحديث: 3205، (باب: ومن سورة الأحزاب).

کہ اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں۔

اس سے بعض عقلمندوں نے یہ سمجھا ہے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اہل بیت میں داخل نہیں، حالانکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت میں سے ہیں، ان کو بھی اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا کی فضلیت میں داخل کرلیا جائے۔ یہاں حصر مقصود نہیں کہ بس یہی اہل بیت ہیں اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اہل بیت نہیں ہیں اور یہ جو اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ جب حضور ﷺ نے ان حضرات کو عباء میں داخل فرما کر یہ دعا کی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے بھی ان کے ساتھ شامل فرما لیجیے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ ہو۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کو عباء میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں، تم تو پہلے ہی سے اہل بیت میں داخل ہو، دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اجنبی تھے، ان کے ساتھ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو عبا میں کیونکر داخل کیا جا سکتا تھا۔ یہ تو اشکالات کا جواب تھا۔

اصل مدعا کے لیے دلیل اول تو لغت ہے کہ آل محمد ﷺ میں ازواج اولاً داخل ہیں، دوسرے قرآن کا محاورہ یہی ہے، حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں جب کہ ملائکہ نے ان کو ولد کی بشارت دی اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو اس بشارت پر تعجب ہو، ملائکہ کی طرف سے یہ قول نقل فرمایا ہے:

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝ (۱)

ترجمہ: فرشتوں نے کہا کہ کیا تم خدا کے کاموں میں تعجب کرتی اور

---

(۱) ھود: ۷۳

(خصوصاً) اس خاندان کے لوگو! تم پر اللہ کی (خاص) رحمت اور اس کی (انواع اقسام) کی برکتیں (نازل) ہوتی رہتی ہیں، بے شک وہ (اللہ تعالیٰ) بڑی تعریف کے لائق (اور) بڑی شان والا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں اہل بیت میں حضرت سارہ علیہا السلام یقیناً داخل ہیں، کیونکہ خطاب انہی سے ہے، معلوم ہوا کہ اہلِ بیت میں ازواج بھی داخل ہیں۔

(وعظ: النسواں فی رمضان، صفحہ نمبر: ۱۷۰، جلد نمبر: ۱۰ فضائل صوم وصلوٰۃ)

مؤلفہ
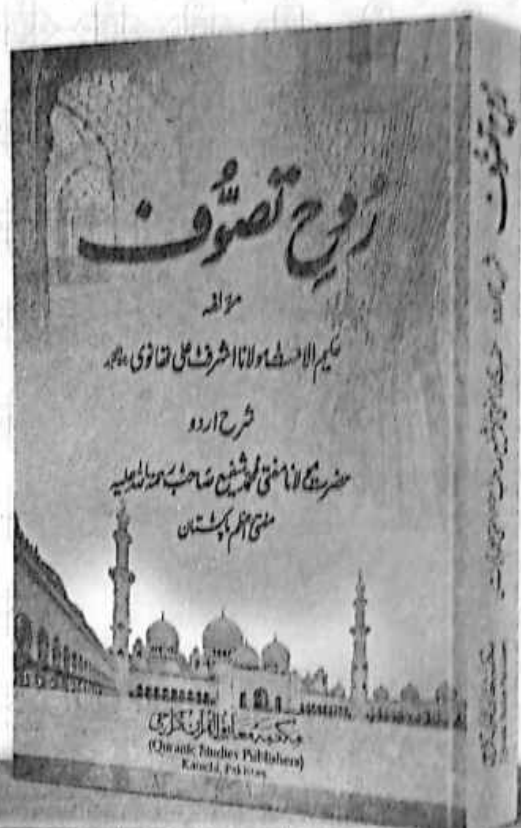
شرح اردو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی

(Quranic Studies Publishers)

Karachi, Pakistan.